ن اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

فروری 2013

کہنی سُننی — مدیر — 12
کرن کرن روشنی — ادارہ — 13
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 274

آپ سے کیا پردہ

اِدھر اُدھر سے — انشا جی — 19

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور — 269

مجھ سے ملیے

باتیں ہماور اسے — شاہین رشید — 22

انٹرویو

مہناز سے ملاقات — شاہین رشید — 28
خامشی کو زباں ملے — ادارہ — 272

ناول

میرے خواب لوٹا دو — نگہت عبداللہ — 240
کوہِ گراں تھے ہم — عنیزہ سید — 32

مکمل ناول

زمین کے آنسو — نگہت سیما — 162
صحیح فیصلہ — آسیہ رزاقی — 102

ناولٹ

اماں کا شقو — سعدیہ عزیز آفریدی — 74
مُسترد — سائرہ رضا — 134
امیدِ صبحِ بہار — سمیرا شریف طور — 208

افسانے

زندگی ایک لوٹ — قانتہ رابعہ — 98
ایک سوچ — نازیہ جمال — 68
حقیقت — افراج خان — 150
وہ اک لڑکی — عنیقہ محمد بیگ — 259

نظمیں غزلیں

غزل — انشاء اللہ خان انشا — 262
غزل — احسان دانش — 262
غزل — سحر انصاری — 263
نظم — ارشد ملک — 263



رنگارنگ پھول

رنگارنگ سلسلہ — شگفتہ جاہ — 264
خبریں وبریں — تبصیر نشاط — 281
روشن حرف — آنسہ مقدسہ — 271

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 267

پکوان

آپ کا باورچی خانہ — شائستہ ابوالحسن — 284
موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 286

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 288

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 290

فروری 2013

جلد 40 شمارہ 10

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

خواتین ڈائجسٹ کا فروری کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

اسلامی سال کے لحاظ سے یہ ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ وہ مبارک مہینہ جس میں کائنات کی عظیم ترین ہستی، محسن انسانیت، سرور کائنات، خاتم الانبیاء رحمۃ اللعالمین بن کر آئے۔ وہ عظیم شخصیت جس کی عظمت پر مسلمان ہی نہیں دنیا بھر کے دانش ور متفق ہیں۔ کائنات کی وہ عظیم ہستی جن کا ثانی کوئی ہے اور نہ کوئی ہوگا۔ انسانی تاریخ کی واحد ہستی جن کی حیات طیبہ کا ایک ایک لمحہ مستند حالت میں محفوظ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن پاک نازل کیا گیا جس میں چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود کوئی تحریف نہیں کی جا سکی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت باسعادت حسب روایت پوری شان و شوکت سے منایا گیا۔ سیرت طیبہ کی محافل منعقد کی گئیں۔ ذرائع ابلاغ نے خصوصی نشریات کا اہتمام کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہر مسلمان کا ایمان ہے لیکن یہ محبت اسی وقت حقیقی ہوگی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام نسلی، علاقائی لسانی تعصبات کا خاتمہ کرکے اعلان کیا۔ "کسی انسان کو دوسرے پر برتری حاصل ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر وہ لوگ جو اللہ سے ڈرتے ہیں، اس کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔"

تاریخ انسانی گواہ ہے کہ دنیا میں وہ قومیں تباہ و برباد ہوگئیں جنہوں نے طاقت کو عزت و شرف کا معیار بنایا۔ اس وقت ہمارا معاشرہ جس شکست و ریخت کا شکار ہے اگر عزت کا معیار دنیاوی شان و شوکت اور اقتدار کے بجائے تقویٰ کو بنالیں تو حقیقی انقلاب آسکتا ہے۔

سالگرہ نمبر،

خواتین ڈائجسٹ کی عمر میں ایک اور سال کا اضافہ ہونے جا رہا ہے۔ اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر کی تیاریاں شروع کردی گئی ہیں۔ مصنفین سے درخواست ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوا دیں تاکہ سالگرہ نمبر میں جگہ پاسکیں۔

سالگرہ نمبر کے حوالے سے ایک خوشخبری قارئین کو سناتے چلیں۔ اس میں آپ کی پسندیدہ مصنفین کی تحریروں کے ساتھ مصنفین کے حوالے سے ایک نیا سلسلہ بھی شامل ہوگا۔

اس شمارے میں،

- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ صحیح فیصلہ،
- نگہت سیما کا مکمل ناول۔ زمیں کے آنسو،
- سعدیہ عزیز آفریدی، سائرہ رضا اور سمیرا شریف طور کے ناولٹ،
- نازیہ جمال، قانتہ رابعہ، افراح خان اور عنیقہ محمد بیگ کے افسانے،
- باتیں ماورا سے،
- وہ جواب ہم میں نہیں۔ گلوکارہ مہناز بیگم کی باتیں،
- کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے،

نئے سال کا پہلا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ، ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

وصیت کے متعلق احکام و مسائل

وصیت کی ترغیب

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمان کا یہ حق نہیں کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی چیز موجود ہو، جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو وہ دو راتیں بھی اس حال میں گزارے کہ اس کی وصیت اس کے بارے میں لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ وصیت ایسی چیز ہے کہ اس کا فائدہ اور ثواب مرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے، جب وصیت پر عمل کیا جاتا ہے۔

2۔ انسان کو اپنی موت کے وقت کا علم نہیں، ممکن ہے بندے کو اس حال میں موت آجائے کہ اسے وصیت کرنے کا موقع نہ ملے، اس لیے بہتر ہے کہ وصیت ہر وقت تیار رکھی جائے۔

3۔ پہلے سے وصیت لکھ رکھنے کا یہ بھی فائدہ ہے کہ انسان اس میں حسب خواہش تبدیلی کرسکتا ہے۔

4۔ قرض اور امانت وغیرہ کی تفصیل ہمیشہ لکھ کر رکھنی چاہیے۔

محروم کون

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"محروم وہ ہے، جو اپنی وصیت کرنے سے محروم رہا۔"

فائدہ :

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص وصیت کیے بغیر فوت ہوگیا، وہ ان فوائد سے محروم رہ گیا جو اسے وصیت سے حاصل ہوسکتے تھے۔ مثلاً "صدقہ کرنے کی وصیت کرتا تو اسے بعد میں اس کا ثواب ملتا، قرض کی ادائی کی وصیت کرتا تو وارث اس کا قرض ادا کردیتے

اور وہ بری الذمہ ہو جاتا۔ فوت ہونے کے بعد اس کوتاہی کی تلافی ناممکن ہے' اس لیے ایسا شخص بہت سی خیر سے محروم رہ گیا۔

شہادت کی موت

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص وصیت کر کے فوت ہوا' وہ سیدھی راہ پر اور سنت طریقے پر (عمل کرتا ہوا) فوت ہوا۔ وہ تقویٰ اور شہادت کی موت مرا۔ اور اس حال میں مرا کہ اس کی بخشش ہو چکی تھی۔"

وصیت میں ناانصافی کرنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص اپنے وارث کو ترکہ دینے سے بھاگے گا (ایسی وصیت کرے گا جس سے جائز وارث کو حصہ نہ ملے یا اس کے اصل حصے سے کم ملے) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس کی جنت کی میراث سے محروم فرما دے گا۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی ستر سال تک نیک لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے' پھر جب (مرتے وقت) وصیت کرتا ہے تو وصیت میں ناانصافی کرتا ہے' اس طرح اس کا انجام برے کام پر ہوتا ہے' چنانچہ وہ جہنم میں چلا جاتا ہے۔ اور ایک آدمی ستر سال تک برے لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے پھر (مرتے وقت) وصیت میں انصاف سے کام لیتا ہے تو اس طرح اس کا انجام نیک کام پر ہوتا ہے' چنانچہ وہ جنت میں چلا جاتا ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو۔

"یہ حدیں اللہ کی (مقرر کی ہوئی) ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری کرے' اسے اللہ تعالیٰ جنتوں میں لے جائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرے اور اس کی (مقررہ) حدوں سے آگے نکلے۔ اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اور اس کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔"

(سورۂ نساء آیت 13'14)

کفارہ

حضرت معاویہ بن قرہ اپنے والد (حضرت قرہ بن ایاس بن ہلال مزنی رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس کی وفات کا وقت آیا تو اس نے وصیت کی اور اس کی وصیت اللہ کی کتاب کے مطابق تھی' اس کا یہ عمل اس کی زندگی میں ترک شدہ زکوٰۃ کا کفارہ بن جائے گا۔"

زندگی میں بخل اور مرتے وقت فضول خرچی کی ممانعت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بتائیے کہ میرے حسن سلوک کا مستحق کون ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں! قسم ہے تیرے باپ (کے رب) کی! تجھے ضرور بتاؤں گا۔ تیری ماں (تیرے حسن سلوک کی سب سے زیادہ) مستحق ہے۔"

اس نے کہا "پھر کون؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "پھر تیری ماں۔"

اس نے کہا "پھر کون؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تیرا باپ۔"

اس نے کہا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے میرے مال کے بارے میں بتائیے کہ میں اس میں سے کس طرح صدقہ کروں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں! قسم ہے اللہ کی! تجھے ضرور بتاؤں گا۔ (وہ اس طرح ہے کہ) تو اس وقت صدقہ کرے جب تو تندرست ہو اور مال سے محبت رکھتا ہو تجھے زندہ رہنے کی امید ہو اور فقر کا اندیشہ ہو۔ (یہ صدقہ کا صحیح وقت ہے) اور مؤخر نہ کرنا حتیٰ کہ جب تیری جان یہاں (حلق تک) پہنچ جائے' پھر تو کہے میرا مال فلاں کو دے دینا' میرا مال فلاں کو بھی دے دینا۔ وہ تو ان ہی کا ہو چکا' اگرچہ تجھے یہ (حقیقت) ناگوار محسوس ہو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے قسم کھانا جائز ہے۔

2۔ جواب دینے سے پہلے تمہید کے طور پر کوئی بات کہنے سے سائل جواب کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے' جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا "میں تجھے ضرور بتاؤں گا۔"

3۔ قسم صرف اللہ کی ذات کی کھانا جائز ہے جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے۔ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "اللہ تعالیٰ تمہیں باپوں کی قسم کھانے سے منع فرماتا ہے' پس جو شخص قسم کھائے' وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔" اس لیے حدیث میں "باپ کی قسم" سے مراد "باپ کے رب کی قسم" ہے۔ عربی زبان میں قرینے کی موجودگی میں الفاظ حذف کر دینا عام ہے۔

4۔ حسن سلوک میں ماں کا حق زیادہ ہے کیونکہ وہ باپ کی نسبت زیادہ نرم دل اور زیادہ حساس ہوتی ہے' تاہم اگر ماں کسی ایسے کام کا حکم دے جو شرعاً" ممنوع یا مکروہ ہو اور باپ اس غلط کام سے منع کرے تو باپ کا حکم ماننا ضروری ہے اور یہ ماں سے حسن سلوک کے منافی نہیں۔

5۔ صحت کی حالت میں صدقہ زیادہ افضل ہے کیونکہ اس وقت دل میں مال کی محبت زیادہ شدید ہوتی ہے اور اسے خرچ کرنا اس لیے بھی مشکل محسوس ہوتا ہے کہ مستقبل میں حالات خراب ہونے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے جبکہ موت کے وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ اب میں اسے استعمال تو نہیں کر سکوں گا' لہٰذا صدقہ کر کے فائدہ حاصل کر لوں۔ اس وقت دل میں مال کی محبت نہیں رہتی۔

6۔ زندگی کے آخری ایام میں صدقہ کرنا یا وصیت کرنا شرعاً" درست ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ عام حالات میں بھی صدقے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

صدقہ کا وقت

حضرت بسر بن حجاش قرشی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہتھیلی پر لعاب مبارک ڈالا' پھر اپنی سبابہ انگلی (اس کی طرف اشارے کے طور پر) رکھی اور فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے آدم کے بیٹے! تو مجھے کیسے عاجز کر سکتا ہے' حالانکہ میں نے تجھے اس جیسی چیز سے پیدا فرمایا' پھر جب تیری جان یہاں پہنچ جاتی ہے۔"

یہ فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حلق کی طرف اشارہ فرمایا۔

"تب تو کہتا ہے' میں صدقہ کرتا ہوں۔ اب صدقے کا وقت کہاں ہے؟"

فوائد و مسائل :

1۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے' وہ ہر لحاظ سے بندے پر قدرت رکھتا ہے جب کہ بندہ ہر لحاظ سے اس کا محتاج ہے۔

2۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے انسان کو ایک ناقابل ذکر حقیر چیز سے پیدا کر کے اسے اشرف المخلوقات بنا دیا۔

3۔ بعض مقامات پر صراحت کے بجائے کنائے کے الفاظ بولنا بہتر ہوتا ہے۔

تہائی ترکے کی وصیت

حضرت عامر بن سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے والد (حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ) سے روایت کیا' انہوں نے فرمایا۔

"فتح مکہ کے سال میں بیمار ہو گیا [illegible] موت کے

کنارے پہنچ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرا مال بہت زیادہ ہے اور میری وارث میری صرف ایک بیٹی ہے تو کیا میں اپنا دو تہائی مال صدقہ کردوں؟"
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نہیں۔"

میں نے کہا۔ "آدھا؟"
فرمایا "نہیں۔"
میں نے کہا "تہائی؟"
فرمایا "تہائی (جائز ہے) اور تہائی بھی زیادہ ہے۔ تیرا اپنے وارثوں کو خوش حال چھوڑنا انہیں مفلس چھوڑ جانے سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔"

فوائد و مسائل :

1۔ بیمار کی عیادت کرنا مسلمان کے حقوق میں شامل ہے اور یہ بہت بڑا نیک عمل ہے۔
2۔ جب انسان محسوس کرے کہ اس کا آخری وقت قریب ہے تو اس وقت اسے ترکے کے ایک تہائی حصے سے زیادہ صدقے کی وصیت نہیں کرنی چاہیے۔
3۔ اگر کوئی شخص تہائی حصے سے زیادہ کی وصیت کر کے فوت ہو جائے تو اس کی وصیت پر صرف تہائی ترکے تک عمل کیا جائے گا۔
4۔ بہتر یہ ہے کہ تہائی مال سے کم وصیت کی جائے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہائی کی اجازت دینے کے باوجود اسے "زیادہ" فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس حدیث سے یہی سمجھا ہے۔

دو چیزیں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے آدم کے بیٹے! دو چیزیں (میں نے تجھے دی ہیں) ان میں سے ایک بھی تیرے ہاتھ میں نہیں تھی۔ میں نے تیرے مال میں اس وقت تیرا حصہ مقرر کر دیا جب میں تیری سانس بند کرتا ہوں۔ (یہ اس لیے) تاکہ تجھے پاک صاف کر دوں اور (دوسری چیز) تیری زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد میرے بندوں کا تجھ پر نماز جنازہ ادا کرنا۔"

وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری (اونٹنی) پر سوار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری خوب جگالی کر رہی تھی اور اس کا لعاب میرے کندھوں کے درمیان (پشت پر) گر رہا تھا۔ (اس موقع پر) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کو ترکے کا حصہ تقسیم کر کے دے دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے اور بدکار کے لیے پتھر ہیں۔ جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا ہونے کا دعوا کرے یا اپنے آزاد کرنے والوں کے سوا کسی اور کی طرف آزادی کی نسبت کرے تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اس کا نہ فرض قبول ہوگا اور نہ نفل۔"
یا فرمایا۔ "نہ نفل قبول ہوگا نہ فرض۔"

فوائد و مسائل :

1۔ ترکے میں جن رشتے داروں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے انہیں ان کا مقررہ حصہ ضرور ملنا چاہیے۔
2۔ جن رشتے داروں کا وراثت میں حصہ نہیں ان کے حق میں مناسب وصیت کرنا بہتر ہے۔
3۔ بعض لوگ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ لے کر شریعت کے نظام میراث پر اعتراض کرتے ہیں، مثلاً "ایک شخص فوت ہوتا ہے، اس کا ایک بیٹا زندہ ہے، دوسرا بیٹا فوت ہو چکا ہے لیکن اس فوت شدہ بیٹے کا ایک بیٹا جو اب فوت ہونے والے کا پوتا ہے، وہ

موجود ہے۔ اصول میراث کے مطابق یہ پوتا محروم ہے کیونکہ قریبی عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ رشتے دار محروم ہوتا ہے۔ اس قسم کی استثنائی اور نادر صورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون میں تبدیلی کرنا بہت بڑی جسارت ہے۔
شرعی طور پر اس کا حل موجود ہے اور وہ یہ کہ فوت ہونے والا اپنے غیر وارث پوتے کے حق میں کچھ وصیت کر جائے۔ اگر وصیت نہ ہو تو وارثوں کے لیے مستحب اور بعض علما کے نزدیک واجب ہے کہ وارث محروم الارث پوتوں وغیرہ کو وراثت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دیں۔ قرآن کریم کی سورہ النساء کی آیت 8۔
"وراثت کی تقسیم کے وقت رشتے دار، یتیم اور مساکین آ حاضر ہوں تو تم مال وراثت میں سے انہیں کچھ دے دو۔" سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔
اکثر لوگ اس حکم قرآنی کو محض اخلاقی ہدایت سمجھ کر اپنے نہایت قریبی رشتے داروں (بھتیجوں وغیرہ) کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کا قانون وراثت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنتا ہے، حالانکہ اس میں تو ایسی کوئی چیز نہیں جس پر انگشت نمائی کی جا سکے۔ اگر چچا، تائے اپنے بھتیجوں وغیرہ کے ساتھ شفقت، ہمدردی اور صلہ رحمی کا معاملہ کریں جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے تو ایک اسلامی معاشرے میں پوتوں وغیرہ کی وراثت یا عدم وراثت کا مسئلہ زیر بحث ہی نہ آئے کیونکہ صلہ رحمی کے اعتبار سے ان کی محرومیٔ وراثت کا ازالہ خوش اسلوبی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔
علاوہ ازیں تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے اعتراضات ان غیر مسلموں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں جن کے ہاں وراثت کا کوئی اصول و ضابطہ سرے سے موجود ہی نہیں، سوائے اس کے کہ مرنے والے کا بڑا بیٹا یا بیٹی تمام ترکے کی مالک بن جاتی ہے، خواہ یہ کروڑوں کی جائیداد ہو۔ میت کی باقی اولاد بالکل محروم ہو جاتی ہے، حالانکہ اولاد ہونے کے لحاظ سے وہ اس کے برابر کے حق دار ہیں۔

انصاف سے اس قدر بعید رواج پر عمل کرنے والوں کی طرف سے اسلام کے انتہائی عادلانہ نظام وراثت کی ایک شق تلاش کر کے اس پر غلط سلط اعتراض کرنا اور اس طرح پوری شریعت کو ناقابل عمل قرار دینے کی کوشش کرنا معقول طرز عمل نہیں۔ افسوس ہے کہ بعض نام نہاد مسلمان بھی غیر مسلموں سے متاثر ہو کر ان ہی کی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنا ایمان خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔
4۔ وارث کے حق میں وصیت سے منع کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اگر وہ وصیت قرآن و سنت کے مطابق ہو تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان وارثوں کو شرعاً وہی حصہ ملے گا، خواہ وصیت کی جائے یا نہ کی جائے اور اگر اس کی وصیت قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس وصیت پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اس طرح وہ کالعدم ہے۔
5۔ نسبی تعلق ایک ناقابل تبدیل تعلق ہے، اسی وجہ سے اسلام کی نظر میں متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کو اصل باپ کے بجائے اپنی طرف منسوب کرنا اور ظہار (بیوی کو ماں بہن قرار دینا) غیر قانونی بلکہ گناہ ہے۔
7۔ ولاء (آزادی) کا تعلق بھی ناقابل تبدیل ہے، جس نے کسی کو آزاد کیا ہے اسی کا آزاد کردہ (مولیٰ) کہنا چاہیے۔ آزاد کرنے والے کے احسان کو فراموش کر کے کسی اور کو مولیٰ قرار دینا بہت بڑا گناہ ہے۔

وارث کے لیے وصیت نہیں

حضرت ابوامامہ (صدی بن عجلان) باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ میں نے حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبۂ مبارک میں یہ فرماتے سنا۔
"اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔"

وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کیا جائے

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا اور تم یہ آیت پڑھتے ہو۔ "اس وصیت کے بعد جو وہ وصیت کرے یا قرض کے بعد۔" (سورہ النساء آیت نمبر۱۱) اور سگے بھائی' ایک ماں کے بیٹے وارث ہوں گے' سوتیلے بھائی نہیں۔"

فوائدومسائل :

1۔ قرض کی اہمیت وصیت کے مقابلے میں اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ قرض زندگی میں بھی واجب الادا ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی جبکہ وصیت موت کے بعد ہی قابل عمل ہوتی ہے۔ قرض جتنا بھی ہو' ادا کرنا ضروری ہوتا ہے جب کہ وصیت اگر تہائی ترکے سے زیادہ ہو تو تہائی تک قابل عمل ہوتی ہے' زائد نہیں۔

2۔ میت کے مال میں سے سب سے پہلے کفن دفن پر خرچ کیا جاتا ہے' پھر قرض ادا کیا جاتا ہے' پھر جو کچھ بچے' اس کے تہائی مال یا اس سے کم کی جو وصیت ہو' وہ پوری کی جاتی ہے۔ اس کے بعد باقی ترکہ وارثوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

3۔ آیت میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے وصیت پوری کی جائے پھر قرض ادا کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دونوں چیزیں واجب ہیں' ان میں سے جو چیز پائی جائے وہ ادا کی جائے۔ اگر دونوں (وصیت اور قرض) موجود ہوں تو ترکے میں سے دونوں کی ادائی کرنے کے بعد باقی ترکہ تقسیم کیا جائے۔ علاوہ ازیں وصیت کا ذکر پہلے کرنے میں یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصیت پر عمل کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی جب کہ قرض تو لوگ زبردستی بھی وصول کرلیتے ہیں۔ وصیت کو پہلے بیان کر کے واضح کر دیا کہ اس پر عمل کرنے میں بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے' گو اس پر عمل قرض کی ادائی کے بعد ہی کیا جائے گا۔

4۔ میت کے سگے بہن بھائی اس کے سوتیلے بہن

جو شخصیت وصیت کیے بغیر فوت ہو جائے' کیا اس کی طرف سے صدقہ کیا جا سکتا ہے؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا' میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے مال چھوڑا ہے لیکن وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے؟"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔

"میری والدہ اچانک فوت ہو گئی ہیں اور انہوں نے وصیت نہیں کی اور میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات چیت کرنے کا موقع ملتا تو صدقہ کرتیں۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں ثواب ملے گا اور کیا مجھے بھی ثواب ملے گا؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں۔"

فوائدومسائل :

1۔ انسان کو مرنے کے بعد جس طرح ان اعمال کا ثواب پہنچتا رہتا ہے' جو اس نے زندگی میں کیے تھے اور ان کے نیک اثرات بعد میں جاری رہے' اسی طرح اس صدقے وغیرہ کا ثواب بھی پہنچتا ہے' جو والدین کی وفات کے بعد اولاد ان کی طرف سے کرے۔

2۔ فوت شدہ والدین کی طرف سے صدقے کے لیے یہ شرط نہیں کہ انہوں نے وصیت کی ہو۔

3۔ آج کل ایصال ثواب کے نام سے جو محفلیں منعقد کی جاتی ہیں اور کھانے کھلائے جاتے ہیں' ان کی حیثیت محض ایک رسم کی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ خاموشی سے کسی مستحق کی مناسب امداد کر دی جائے۔

4۔ قرض اور دوسرے مالی حقوق کی ادائی میں جس طرح زندگی میں نیابت ممکن ہے اسی طرح وفات کے بعد بھی کسی کا قرض دوسرا آدمی ادا کر دے تو فوت شدہ شخص بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

"یہ میرے دوست ہیں' بہت شریف آدمی ہیں۔ آپ کی فرم میں جگہ مل سکے تو۔۔۔ منشی رکھ لیجئے' جو شاندے کوٹنے چھاننے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا آپ کے ہاں میڈیکل افسر بھی ہو سکتے ہیں۔ علم نجوم میں دخل ہے۔ آپ کے اسٹاف کے ہاتھ دیکھ دیا کریں گے۔"

"کیا نام ہے؟"

"سید فصاحت حسین۔"

"والد کا نام؟"

"جے کے جنجوعہ چودھری' جھنڈے خان جنجوعہ۔"

"کیا کرتے ہیں ان کے والد؟"



کچھ اِدھر اُدھر سے

انشا جی

"جی ان کے والد زندہ ہوتے تو ان کو کام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بے چارے یتیم ہیں۔ ان کے والد تو ان کی پیدائش سے کئی سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔"

"والدہ؟"

"جی! ان کا سایہ بھی ان کی پیدائش سے دو سال قبل ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔"

"اور رشتہ دار تو ہوں گے؟"

"جی نہیں۔۔۔ اور رشتہ دار بھی نہیں' کیونکہ ان کے دادا لاولد مرے اور پردادا نے شادی نہیں کی تھی۔ یہ تنہا ہیں اس بھری دنیا میں۔

حال ہی میں سات سال کی طویل اقامت کے بعد جیل سے رہا ہوئے ہیں۔ وہ تو اب آ کر ان پر وقت پڑا ہے' تو نوکری تلاش کر رہے ہیں' ورنہ وہ پیسوں میں کھیلتے تھے۔"

"کیا کرتے تھے؟"

"بس! دست کاری اپنے ہاتھ کی محنت کا کھاتے تھے اپنے فن میں وہ دست گاہ بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے ان کے آگے کان پکڑتے تھے۔ وہ تو ان کا ایک شاگرد کچا نکل گیا۔ اوچھا ہاتھ پڑا اس کا۔ بٹوے میں سے کچھ نکلا بھی نہیں اور اس کی نشان دہی پر فصاحت صاحب مفت میں پکڑے گئے۔"

"ہمارے ہاں نوکری کے لیے چال چلن کے سرٹیفکیٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"وہ ہم داروغہ جیل سے لے لیں گے۔ نیک چلنی کی بنا پر ان کو سال بھر کی چھوٹ بھی تو ملی تھی۔ اس کا سرٹیفکیٹ بھی موجود ہے۔"

"تعلیم کہاں تک ہے؟"

"اجی تعلیم' یہ آج کل کے اسکولوں کالجوں میں جو پڑھایا جاتا ہے' وہ تعلیم ہوتی ہے کیا؟ ہم نے بڑے بڑے میٹرک پاسوں اور ڈگریوں والوں کو دیکھا ہے۔ گنوار کے گنوار رہتے ہیں۔"

"اچھا تو فصاحت صاحب! آپ عرضی لائے ہیں

نوکری کے لیے؟"
"جی! لایا ہوں۔ یہ لیجیے۔"
"پڑھ کر سنائیے۔"
"جی! عینک میں گھر بھول آیا ہوں۔"
"اچھا تو دیجیے۔ اس پر تو دستخط آپ نے کیے ہی نہیں اور یہ کیا سیاہی کا دھبہ ڈال دیا ہے۔ درخواست کے نیچے۔"
"حضور یہ دھبہ نہیں ہے، میرا نشان انگشت ہے۔ دیکھیے نا! بات دراصل یہ ہے۔۔۔۔"

☆ ☆ ☆

"دیکھو میاں! ہمیں خالص دودھ چاہیے ہو گا۔"
"جی! خالص، بالکل خالص ہو گا۔"
"اور صبح پانچ بجے دینا ہو گا۔"
"جی! پانچ بجے کیسے ہو سکتا ہے۔ کمیٹی کے نل تو چھ بجے کھلتے ہیں۔"
"کتنی بھینسیں ہیں تمہاری؟"
"جی! بھینسیں، کیسی بھینسیں؟"
"ہاں، ہاں! میں بھول گیا تھا کہ تم گوالے ہو۔"
"جی! ملتان میں برسوں گوشت ہی بیچتا رہا۔ پھر اخبار والے پیچھے پڑ گئے تو یہاں چلا آیا۔"
"یہاں، کام کیوں نہیں کیا؟"
"جی! یہاں جانور پکڑنے کا ٹھیکہ کارپوریشن والوں نے کسی اور کو دے دیا ہے۔"

"تو گویا اب تمہارا صرف دودھ بیچنے پر گزارہ ہے؟"
"جی نہیں! گھی کی دکان بھی کر رکھی ہے۔ آپ کو چاہیے تو رعایت سے دوں گا۔ گھر کی سی بات ہے۔"
"وہ بھی خالص ہے نا؟"
"خالص سا خالص؟ ایسا خالص تو گائے، بھینس کے دودھ سے بھی نہ بنتا ہو گا۔ اسے چکنا کرنے کے لیے ہم ولائتی گریس ڈالتے ہیں۔ یہاں کا دیسی مال نہیں ڈالتے۔ پھر جسم میں تیزی، طراری اور چستی پیدا کرنے کے لیے اس میں موبل آئل بھی ملاتے ہیں جو بازار میں کوئی دوسرا دکان دار نہیں ملاتا۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہمارے خریدار ہمیشہ فراٹے بھرتے چلتے ہیں، بلکہ دوڑ کے مقابلوں میں اول آتے ہیں۔"
"میاں جی! گھی تو اصل میں غذائیت کے لیے کھایا جاتا ہے۔"
"وہ خوبی بھی ہمارے گھی میں ہے حضور! آلو ویس سے زیادہ غذائیت اور کسی چیز میں ہو گی؟"

☆ ☆ ☆

"فیض صاحب آج کل کیا کر رہے ہیں؟"
"کچھ نہیں، بس شاعری کر رہے ہیں۔"
"شاعری؟ بہت دن سے ان کی کوئی چیز نظر سے نہیں گزری، حالانکہ میں ریڈیو کا کمرشل پروگرام باقاعدگی سے سنتا ہوں۔"
"انہوں نے فی الحال بناسپتی گھی اور صابن کے متعلق کچھ کہنا شروع نہیں کیا۔"
"پھر کس موضوع پر کہتے ہیں؟"
"وہی انقلاب اور بند قبا کے موضوعات پر۔"
"کوئی تازہ مجموعہ آ رہا ہے ان کا؟"
"دست تہ سنگ۔"
"اس کے بعد کا پوچھ رہا ہوں۔ وہ تو دیکھا ہے۔"
"اس کے بعد کا تیار ہے۔ فقط نام کی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔"
"فیض صاحب کو ایسا نام چاہیے جو دست سے شروع ہوتا ہو جیسے دست صبا، دست تہ سنگ۔"
"میں عرض کروں ایک نام؟ اگر آپ فیض صاحب تک پہنچا دیں تو۔"
"ہاں ہاں! ضرور فرمائیے، لیکن ان کی شاعری سے مناسبت رکھنے والا ہو، درد دل یا گلدستہ فیض قسم کا نہ ہو۔"

"دست سے شروع ہونے والوں میں "دست پناہ" کیسا رہے گا؟"

☆

باتیں ماورا سے

شاہین رشید

1 اصلی نام؟
ماورا۔
2 پیار کا نام؟
عروہ مجھے "ببلو" بلاتی ہے اور ماما مجھے "چٹکی" بلاتی ہیں۔ میری ماما نے میرے پندرہ نک نیم رکھے ہوئے ہیں۔
3 سن پیدائش/شہر؟
28 ستمبر 1992ء/پشاور۔
4 قد بغیر ہیل کے/ستارہ؟
5 فٹ 7 انچ/لبرا۔
5 بہن بھائیوں کی تعداد/آپ کا نمبر؟
دو بہنیں ایک بھائی/میں دوسرے نمبر پر ہوں۔
6 تعلیمی قابلیت؟
فیشن ڈیزائننگ میں گریجویشن کر رہی ہوں اسلام آباد سے۔
7 شادی؟
ابھی تو نہیں سوچا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ لو میرج کروں۔ باقی جو اللہ کو منظور ہو گا۔
8 شوبز میں آمد؟
عروہ وی جے تھی اے آر وائی میں، تو اسی کے ذریعے سے آئی۔
9 پہلا ڈراما/شہرت کس نے دی؟
میرے حضور/یہاں پیار نہیں ہے۔
10 شوبز کی پہلی کمائی/خرچی؟
میں نے ٹیکسلا میں ایک شو ہوسٹ کیا تھا۔ اس وقت میں 9th گریڈ میں تھی۔ مجھے اس شو کے سولہ ہزار ملے تھے۔ تین چار دن کی میزبانی تھی۔ اب تو ٹھیک طرح سے یاد بھی نہیں ہے۔
11 آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟
شوٹ کے دنوں میں آٹھ بجے اور یونیورسٹی کے دنوں میں سات بجے اور چھٹی کے دن تو آرام ہوتا ہے۔
12 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟
صبح اٹھتے ہی مما "بیڈ ٹی" دیتی ہیں۔ سردیوں میں چائے اور گرمیوں میں لسی دیتی ہیں مما۔
13 گھر والوں کی کون سی بات موڈ خراب کر دیتی ہے؟
موڈ خراب اتنی آسانی سے نہیں ہوتا، بلکہ میں تو دوسروں کا موڈ بھی ٹھیک کر دیتی ہوں۔
14 اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟
بھئی! بڑوں پر رول اپلائی نہیں ہوتے اور چھوٹے مارے جاتے ہیں۔ اس لیے کیا بتاؤں۔
15 قومی تہوار منانے کے بارے میں کیا کہیں گی؟
میں سمجھتی ہوں کہ جب میں چھوٹی تھی تو ملک میں قومی تہوار اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ اب لوگ اپنی روایات بھولتے جا رہے ہیں۔
16 اپنی شخصیت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟
کوئی بھی نہیں..... بس سوچتی ہوں۔ تھوڑی لمبی ہوتی۔
17 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟
بہت زیادہ چڑچڑی ہو جاتی ہوں۔ کیونکہ میں کھانے پینے کی بہت شوقین ہوں۔
18 ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟
گورنمنٹ کی تبدیلی ضروری ہے۔
19 کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟
اپنی برتھ ڈے کا کیونکہ ڈھیروں تحفے ملتے ہیں۔
20 شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟
مما کے پاس۔
21 خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟



گفٹ دے کر۔
22 بیرون ملک کس قانون سے متاثر ہوتی ہیں؟
مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت آرگنائزڈ ہیں۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک۔ سگنل بھی کوئی نہیں توڑتا۔
23 دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟
کوئی غلط بات کرے یا کوئی جھوٹ بولے۔
24 کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟
تو میں جا کر پوچھ لیتی ہوں کہ بھئی! کیا بات ہے۔
25 پرائز بانڈ نکلنے کی منتظر رہتی ہیں؟
نہیں! بالکل نہیں۔ جو آپ محنت کرتے ہیں، اسی کا صلہ ملتا ہے۔
26 آپ کا ذریعہ آمدنی؟
فی الحال تو شوبز ہے۔
27 گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟
بہن کے (عروہ کے)
28 کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟
شہرت..... بہت جلدی مل گئی ہے۔
29 کوئی برا وقت جو آپ نے گزارا ہو؟
برا وقت تو اللہ کا شکر ہے کہ کوئی نہیں آیا۔
30 بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟
مجھے سارے ہی تحفے اچھے لگتے ہیں۔ چاہے کچھ بھی ہو۔
31 کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟
گانے سنتی ہوں۔
32 پسندیدہ پروفیشن؟
اداکاری اور فیشن ڈیزائننگ۔
33 اپنے لیے تعریفی جملے جو بھول نہیں سکتیں؟
میرے فین پیج پہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں ورسٹائل اداکارہ ہوں اور یہ پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔
34 مخلص کون ہوتے ہیں، اپنے یا پرائے؟
اپنے ہی ہوتے ہیں۔
35 کوئی تحفہ جو ہمیشہ یاد رہے گا؟
ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے میری مما نے مجھے کار کا تحفہ دیا ہے، تاکہ مجھے یونیورسٹی جانے میں آسانی ہو۔ یہ تحفہ ہمیشہ یاد رہے گا۔



36 چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟
اگر کراچی میں ہوتی ہوں تو بہن کے ساتھ شاپنگ پہ چلی جاتی ہوں اور اسلام آباد میں ہوتی ہوں تو مما کے ساتھ سب نکل جاتے ہیں' کہیں نہ کہیں۔

37 لباس میں کیا پسند ہے؟
مشرقی انداز کے لباس۔

38 اپنی شخصیت کے لیے ایک جملہ؟
بہت خوش قسمت ہوں۔

39 گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
مما کے کمرے میں۔

40 ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ ابھی تک کام نہیں کیا؟
کافی سارے ہیں۔ جیسے عظمیٰ گیلانی' سکینہ سموں' بدر خلیل وغیرہ۔ صبا حمید کے ساتھ کام کرنے کی خواہش تھی' جو پوری ہو گئی۔

41 کس کے ایس ایم ایس کے جواب "فوراً" دیتی ہیں؟
ایس ایم ایس کی اتنی قائل نہیں ہوں ایس ایم ایس سے بہتر کال کرنا بہتر سمجھتی ہوں۔

42 بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
فیس بک لگانے یا باہر جا کر ڈنر کرتی ہوں۔

43 ایک کردار جو کر کے پچھتائیں؟
نہیں کوئی نہیں۔

44 ایک کردار جو ہٹ ہوا؟
"یہاں پیار نہیں ہے" میں شائلہ کا کردار۔

45 ایک کردار جو کرنا چاہتی ہیں؟
ہر طرح کا کردار کرنا چاہتی ہوں۔

46 کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟
نہیں! کوئی زیادہ تنگ کرے تو نمبر بلاک کر دیتی ہوں۔ پچھتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

47 مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟
اچھی لگتی ہے..... اور مجھے خود بھی دوسروں کے گھر جانا اچھا لگتا ہے۔

48 کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟
کپڑے اور جوتے۔

49 ایک نصیحت جو بری لگتی ہے؟
عروہ مجھے کہتی ہے کہ تم تھوڑی آرگنائزڈ ہو جاؤ۔ مگر میں ہو ہی نہیں پاتی۔

50 وقت کی پابندی کرتی ہیں؟
ہاں جی! میں بہت پنکچوئل ہوں۔

51 کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟
گھر والوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہوں۔

52 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟
چیزیں قیمتی ہو ہی نہیں سکتیں۔ رشتے قیمتی ہوتے ہیں۔

53 کھانے کے لیے بہترین جگہ چٹائی یا ٹیبل؟
ڈائننگ ٹیبل۔

54 ایک ریسٹورنٹ جہاں کھانا کھانا پسند کرتی ہیں؟
اسلام آباد کا کوئی بھی ریسٹورنٹ۔

55 اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو کیا چیز لینا چاہیں گی؟
بس ڈپریس ہو جاؤں گی۔ میں تو لوگوں کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔

56 انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟
بہت زیادہ ہے۔ اپنے فینز کے قریب رہنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

57 کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟
چھپکلی اور لال بیگ۔ ان کو دیکھ کر چیخیں نکل جاتی ہیں۔

58 خود کشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟
بزدل۔

59 کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟
کوئی جھوٹ بولے اور خوامخواہ ہی برائی کرے۔

60 شادی کی رسومات جو بہت پسند ہیں؟
ساری رسومات بہت پسند ہیں۔

61 ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟
مما کے ہاتھ کا بھی بہت اچھا ہوتا ہے اور عروہ کے ہاتھ کا بھی۔

62 کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟
ارفع کریم سے ملنے کی بہت خواہش تھی۔ وہ تاریخی تو نہیں ہے' مگر ایک قابل لڑکی تھی۔

63 کسے چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی؟
اگر فیملی کی بات ہے تو فیملی کو نہیں چھوڑ سکتی اور فیلڈ کی بات ہے تو اداکاری کو نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے بہت مزا آرہا ہے۔

64 اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں؟
میرے پاس دو موبائل نمبر ہیں اور یہ شروع سے ہی ہیں۔ ایک نمبر صرف فیملی کے لیے ہے' جو میں کسی کو نہیں دیتی اور دوسرا کام والا نمبر ہے۔

65 کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟
فون' والٹ' بیگ۔

66 پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟
یہی کہ اللہ تعالیٰ گورنمنٹ چینج کر دے اور امن و امان قائم ہو جائے۔

67 اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟
بہت آسانی سے۔ مجھے سوری کہنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔

68 آپ کی اچھی بری عادت؟
بہت لونگ (Loving)' بہت فرینڈلی ہوں اور یہی چیزیں کبھی کبھی بری ثابت ہو جاتی ہیں۔

69 پہلی مرتبہ نیا قلم استعمال کرتے وقت کیا لکھتی ہیں؟
لکیریں مارتی ہوں کہ چل بھی رہا ہے کہ نہیں۔
70 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
نہیں نہیں..... میرے خیال میں غصے میں زیادہ کھانا پینا چاہیے' تاکہ لڑنے کی مزید طاقت آئے۔
71 مارننگ شو کے لیے آپ کے تاثرات؟
مارننگ شو میں فہد مصطفیٰ کا پروگرام بہت اچھا ہوتا ہے اور شائستہ کا بھی بہت کلر فل ہوتا ہے۔
72 شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟
جب آپ فیملی کے ساتھ نکلیں تب۔
73 بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں لیتی ہیں؟
میں لیٹتی ہی تب ہوں' جب مجھے نیند آرہی ہوتی ہے۔
74 بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟
فون کا چارجر' کوئی ایک پین اور اپنی تصویر۔
75 خدا کی حسین تخلیق؟
مور۔
76 زندگی کب بری لگتی ہے؟
کبھی بھی نہیں' آج کل تو بہت ہی اچھی لگ رہی ہے۔
77 ویلنٹائن ڈے منانا کیسا لگتا ہے؟
بہت اچھا لگتا ہے۔ بہت شوق سے مناتی ہوں اور ہر تہوار اہتمام سے مناتی ہوں۔
78 زندگی کب بدلی؟
جب اس فیلڈ میں آئی۔ لوگوں نے پہچاننا شروع کیا۔
79 کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟
رونا آتا ہے۔
80 جھوٹ کب بولتی ہیں؟
نہیں بولتی..... کیونکہ میں خود کو جواب دہ نہیں سمجھتی' سوائے اپنے گھر والوں کے سامنے۔
81 اپنی شخصیت میں کیا بدلنا چاہتی ہیں؟
میرا خیال ہے کہ مجھے اب عروہ جیسا ہو جانا چاہیے۔
82 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہیں؟
شام کو مجھ میں زیادہ انرجی ہوتی ہے۔
83 گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟
کھانا مل جائے۔
84 کون سے چینلز شوق سے دیکھتی ہیں؟
زیادہ تر پاکستانی چینلز اور میوزک کے چینل جو بھی ہوں۔
85 جس دن موبائل سروس آف ہوتی ہے تو؟
تو سکون ہوتا ہے۔
86 فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟
منحصر ہے فقیر پر کہ وہ کتنا مستحق ہے۔ کیونکہ میرا ایمان ہے کہ ہم دیں گے تو اللہ ہمیں بھی دے گا۔
87 لائٹ چلی جائے تو بے ساختہ جملہ؟
کیا ہے یار..... لائٹ کیوں چلی جاتی ہے بار بار۔
88 اچانک چوٹ لگ جائے تو؟
تو رونے لگتی ہوں۔
89 کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش! یہ ہمارا ہوتا؟
جرمنی..... ویسے اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔
90 ہم عموماً" کن چیزوں پہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟
میں تو اپنا سارا وقت فیس بک پہ ضائع کرتی ہوں۔
91 حجاب ضروری ہے یا فیشن؟
حجاب بہت ضروری ہے۔ بس اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دے دے۔
92 شاپنگ کے لیے پسندیدہ جگہ؟
کراچی' دبئی۔
93 اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟
اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی گیا تو کوئی مسئلہ نہیں۔



وہ جو اب ہم میں نہیں

مہناز بیگم

شاہین رشید

ساز و آواز کی دنیا کی ایک خوب صورت اور سریلی آواز مہناز بیگم اب ہم میں نہیں ہیں۔ یہ مشہور لوگ چاہے کسی بھی فیلڈ سے تعلق رکھتے ہوں' اپنی فیملی کا حصہ ہی لگتے ہیں۔ اگرچہ مہناز کو اس فیلڈ کو خیرباد کہے کافی عرصہ گزر گیا تھا' مگر یہ سوچ کر کہ یہ لیجنڈ فنکارہ ہمارے درمیان موجود ہے' بہت اچھا لگتا تھا۔ مہناز بیگم جب بھی امریکا سے آتی تھیں' ایک آدھ مرتبہ میری ان سے ضرور بات ہوتی تھی اور مجھے یاد ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں جب ان کا عروج تھا' میں ان کا انٹرویو کرنے ان کے گھر گئی تھی تو وہ سبزی کاٹ رہی تھیں۔ میں نے انہیں گھریلو کاموں میں مصروف دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا تو ہنس کر کہنے لگیں کہ "ہم بھی آپ کی طرح ایک انسان ہی ہیں۔ ہم بھی گھر کے کام اسی طرح کرتے ہیں' جس طرح آپ کرتی ہیں۔" نرم لہجے میں اور محبت سے بات کرنا ان کی خاص خوبی تھی۔

مہناز کی والدہ "کجن بیگم" بھی ہندوپاک کی نامور سوز خواں تھیں اور ان کے والد "اختر مہدی وصی علی" نہ صرف ایک اچھے سوز خواں تھے' بلکہ بہت اچھے خطاط بھی تھے اور عربی و فارسی اور اردو پر عبور رکھتے تھے وہ ریڈیو پاکستان میں حمد و نعت' منقبت اور غزلوں کے الفاظ اور صحیح تلفظ و ادائی کی تربیت بھی دیا کرتے تھے۔ ان کے والد کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پاکستان کے قومی ترانے میں ان کی آواز بھی شامل ہے۔ مہناز بھی اپنی والدہ اور اپنی خالہ عشرت بیگم کے ساتھ سوز و سلام میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ جبکہ گائیکی کی تربیت



انہوں نے مہدی حسن کے بھائی پنڈت غلام قادر خان، نیاز احمد اور لعل محمد اقبال سے حاصل کی۔

مہناز بیگم 1958ء میں کراچی میں پیدا ہوئیں۔ گھر کی بڑی بیٹی اور پانچ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھیں۔ ابتدائی تعلیم "بہادر یار جنگ اسکول جیل روڈ" سے حاصل کی۔ میٹرک "مسلم گرلز اسکول ناظم آباد نمبر 2" سے پاس کیا اور "سٹی کالج سے گریجویشن" کیا۔

"والدین اور خالہ حمد و نعت اور سوز و سلام سے پہچانے جاتے تھے جبکہ آپ نے بحیثیت گلوکارہ وہ بھی فلموں کی اپنی پہچان کروائی وجہ؟" ہمارا مہناز بیگم سے پہلا سوال تھا۔ اس پہ مہناز بیگم نے کہا۔

"ایسا نہیں ہے کہ میری پہچان صرف گلوکارہ ہی کی ہے۔ الحمدُ للہ میری پہچان بحیثیت حمد و نعت اور سوز و سلام سے بھی ہے کیونکہ میری ابتدا تو اسی سے ہوئی۔"

"بالکل ٹھیک۔ پھر اس فیلڈ میں کیسے آئیں؟"

"میں آپ کو شروع سے بتاتی ہوں۔ ہمارے گھرانے میں بہت سادگی اور بہت زیادہ مذہبی لگاؤ تھا سب کو۔ مذہبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں اور ہمارے والدین اس بات کا خاص خیال رکھا کرتے تھے کہ ہماری تربیت خالصتاً "مذہبی انداز میں ہو۔ جب میں والدین کو مذہب سے قریب اور حمد و نعت پڑھتے ہوئے اور سوز خوانی کرتے ہوئے دیکھا کرتی تھی تو میرا بھی دل چاہتا تھا کہ ان کا ساتھ دوں۔ میرے شوق کو دیکھتے ہوئے میری والدہ اکثر مجھے اپنے ساتھ میلاد اور سوز و سلام کی محفلوں میں لے جایا کرتی تھیں۔ اسکول کالج میں بھی دوستوں کے درمیان بیٹھ کر انہیں حمد و نعت سنایا کرتی تھی۔ خاندان میں خاصی مقبول ہو چکی تھی اور اپنی دوستوں میں بھی اس سے آگے کی شہرت کا مجھے نہ شوق تھا نہ گمان تھا۔ ہمارے زمانے میں ریڈیو پاکستان کراچی سے طالب علموں کے لیے ایک پروگرام بزم طلبہ ہوا کرتا تھا اور اس کے تحت ہفتہ طلبہ بھی منایا جاتا تھا۔ اس میں کراچی کے اور کراچی سے باہر کے کالجز بھی حصہ لیا کرتے تھے۔ اس کے ایک پروگرام میں "کل پاکستان مقابلہ موسیقی" کا انعقاد کیا گیا۔ ہمارے کالج کی ایک لڑکی کو بھی جانا تھا مگر وہ اتفاق سے بیمار ہو گئی۔ پرنسپل پریشان تھیں کہ کسی نے انہیں میرے بارے میں بتایا کہ مہناز کی آواز بھی بہت اچھی ہے۔ آپ اسے مقابلے کے لیے بھیج دیں اور ہماری پرنسپل نے بہت مجبوری میں مجھے بھیج دیا کہ چلو! انٹری تو ہو ہی جائے گی۔ کسی مقابلے میں شریک ہونے کا میرا بھی پہلا موقع تھا۔ میری باری آئی تو میں نے میڈم نور جہاں کا مشہور و معروف قومی گیت "اے وطن کے سجیلے جوانو!" گایا تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اتنی داد دی کہ میں خود بھی حیران رہ گئی اور جب فائنل رزلٹ کا اعلان ہوا تو ہمارے کالج کو پہلا انعام ملا۔۔۔ اس وقت میری جو کیفیت تھی اس کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی۔"

اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کراچی ریڈیو کے پروگرام منیجر نے مہناز کا تعارف ڈائریکٹر جنرل سلیم گیلانی صاحب سے کروایا۔ انہوں نے اسی وقت ان کی آواز میں مزید کچھ سنا اور کہا کہ آواز بہت خوب صورت ہے۔ اس میں مزید نکھار لانے کے لیے آپ کو تربیت لینا ہوگی تربیت کے لیے نام بھی انہوں نے ہی۔۔۔ تجویز کیا اور یوں مہناز نے اس زمانے کے نامور موسیقار سے تربیت حاصل کی۔

کہتے ہیں کہ خوش قسمتی انسان کی زندگی میں صرف ایک مرتبہ دستک دیتی ہے۔ اگر انسان وہ دستک سن لے تو کامیابی کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ مہناز کی زندگی میں پہلی دستک اس وقت ہوئی جب کل پاکستان مقابلہ موسیقی میں شرکت کرنے والی لڑکی بیمار ہوئی اور مقابلے میں شرکت کرنے کے لیے مہناز کو منتخب کیا گیا۔ اگر اس وقت مہناز انکار کر دیتیں تو شاید آج ہم انہیں جانتے بھی نہ ہوتے۔

موسیقی کی تربیت مکمل ہوئی تو ریڈیو پاکستان کراچی کے پروڈیوسر حشمت حسین جعفری نے مہناز کی آواز میں ایک گانا ریکارڈ کیا۔ اس گانے کو ٹی وی کے پروگرام منیجر نے سنا اور اس وقت کے مقبول ترین میوزک کے پروگرام "نغمہ زار" میں گانے کی دعوت دی اور کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے اس پروگرام کے لیے باقاعدہ گائیں۔

"اس آفر پر کیا کیفیت تھی۔۔۔ اسی کو بہت سمجھتی تھیں یا مزید آگے بڑھنے کی خواہش تھی؟" اس سوال کے جواب میں مہناز نے کہا۔

"اتنی اچھی آفر پر بھلا کون ہو گا جو خوش نہیں ہو گا میں بھی بہت خوش تھی۔ "نغمہ زار" کے بعد مجھے مزید پروگراموں میں بھی بک کیا جانے لگا اور میری ایک پہچان بنتی گئی۔ جب انسان کی پہچان بن جائے تو پھر اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ مزید ایسا کام کرے کہ ہر خاص و عام میں جانا پہچانا جائے۔"

ریڈیو ٹی وی پہ کامیابی کے بعد مہناز صاحبہ کی یہ خواہش شدت پکڑتی جارہی تھی کہ انہیں فلم کے لیے بھی گانا ہے مگر کوئی آفر ہی نہیں آرہی تھی اور اگر کوئی آفر آبھی جاتی تو بڑا مرحلہ گھر والوں کو راضی کرنے کا تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ انہیں فلم میں گانے کی اجازت کبھی بھی نہیں ملے گی۔ پاکستان ٹیلی ویژن پہ



مہناز کو نامور موسیقار سہیل رعنا نے متعارف کرایا اور فلم تک بھی وہ ان ہی کی وجہ سے آئیں۔ فلم کے لیے ان کا پہلا مقبول گانا فلم "پہچان" کا تھا۔ جس کے بول تھے "تیرا پیار میرے جیون کے سنگ رہے گا" اور یہ گانا آج بھی اسی طرح مقبول ہے، جس طرح اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ اس کے بعد تو مہناز فلم انڈسٹری کی ضرورت بن گئیں۔ کوئی فلم ایسی نہیں تھی کہ جس میں مہناز کی آواز شامل نہیں ہوتی تھی۔

مہناز نے جس دور میں گائیکی کا آغاز کیا، وہ ملکہ ترنم نور جہاں کا دور تھا۔ اردو پنجابی گانوں کے لیے ان ہی کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں اور ان کے بعد اگر کسی کا نمبر ہوتا تھا تو وہ ناہید اختر تھیں، مگر سنجیدہ اور میلوڈی گانوں کے لیے مہناز کی ہی آواز اور گائیکی کو ترجیح دی جاتی تھی۔ یہ وہ دور تھا، جب ہمارے ملک میں فلمیں بھی کثرت سے بنتی تھیں اور اسی لحاظ سے گانے بھی لکھے جاتے تھے۔ ہر جگہ صرف تین ہی آوازیں گونجتی تھیں۔ میڈم نور جہاں، ناہید اختر اور مہناز..... میڈم نور جہاں بیمار ہوئیں تو پھر فلم انڈسٹری میں گائیکی کا سارا بوجھ مہناز پر آگیا اور مہناز صاحبہ نے اس ذمہ داری کو بخوبی نبھایا۔

مہناز بیگم نے اپنے اس فنی سفر میں بے شمار خوب صورت گیت اور غزلیں گائیں۔ انہیں اس گائیکی میں اپنی والدہ کی سرپرستی تو حاصل تھی ہی، اس کے ساتھ میڈم نور جہاں کی سرپرستی بھی حاصل تھی، حالانکہ مشہور تھا کہ میڈم نور جہاں کسی کی تعریف میں اتنی فراخ دلی کا مظاہرہ نہیں کرتی تھیں۔ صرف اسی کی تعریف کرتی تھیں، جو انہیں دل سے پسند آتا تھا اور مہناز ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھیں، جن کی تعریف میڈم نور جہاں نے بھی کی۔ مہناز کو سنجیدہ اور درد بھرے گانے میں خاصا عبور حاصل تھا۔ ان کے ایسے گانے دل پر بہت اثر کرتے تھے۔ انہیں بار بار سننے کو دل چاہتا تھا اور چاہتا ہے۔ عجیب سوز و گداز تھا اور انتہائی سریلی آواز تھی۔ مہناز کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ جب بھی کسی تقریب میں گانے کے لیے بلائی جاتی تھیں تو کبھی "لپ سنگ" نہیں کرتی تھیں بلکہ ہمیشہ لائیو گاتی تھیں اور گانے میں مزید رنگ بھر دیتی تھیں۔ پنجابی مہناز کی مادری زبان نہیں تھی، مگر انہوں نے پنجابی گانے بھی اس طرح گائے گویا ان کی اپنی زبان ہو اور یہی ایک فنکار کا کمال ہوتا ہے۔

مہناز نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ جب انہوں نے پہلا گانا فلم کے لیے گایا تو سب نے خاندان میں بہت برا مانا اور جواز یہ پیش کیا کہ مذہبی گھرانے کی لڑکی، جس کے والدین اور جو خود بھی سوز و سلام اور حمد و نعت پڑھتی ہیں، وہ فلمی گانے گائے۔ یہ کہاں زیب دیتا ہے۔

مہناز بیگم نے بتایا کہ جب انہوں نے پہلا گانا گایا تو انہیں تین سو روپے ملے۔ یہ تین سو روپے انہیں ریڈیو پہ گانے کے ملے تھے چونکہ یہ ان کی پہلی کمائی تھی، اس لیے انہیں بے حد خوشی ہوئی تھی۔ وہ ہر ایک کو بتاتیں پھر جب فلم کا ایک گانا گانے پر انہیں پانچ ہزار ملے تو انہیں ایسا لگا جیسے دنیا جہاں کی دولت ان کی جھولی میں آگری ہو۔ مہناز کہتی ہیں۔

"یہ وہ دور تھا، جب میڈم نور جہاں اور مالا بیگم کا عروج تھا اور میرے مقابلے میں ناہید اختر تھیں۔"

مہناز بیگم نے تقریباً" اٹھائیس سال اس فیلڈ میں گزارے اور بڑے کمال کی بات ہے کہ ان کے بارے میں کبھی بھی کسی نے غلط الفاظ استعمال نہیں کیے۔ شوبز ایک ایسی فیلڈ ہے جہاں کوئی الزام تراشی اور اسکینڈل سے محفوظ نہیں رہتا، لیکن مہناز شاید ان چند لوگوں میں سے تھیں جن کے خلاف نہ تو کسی سے کوئی بات سنی اور نہ ہی کوئی اسکینڈل اور یہ انسان کے اعلیٰ کردار کی ایک مثال ہے۔

شادی کے سوال پہ مہناز اکثر برا مان جایا کرتی تھیں۔ لیکن در حقیقت بات یہ تھی کہ بھائیوں کی شادی کے بعد مہناز نے اس لیے شادی نہیں کی کہ ماں اکیلی ہو جائے گی۔ شادی کے لیے مہناز کا کہنا تھا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اور کچھ لوگوں کے نہیں بھی بنتے۔ شاید میرا جوڑ بھی نہیں بنا اور شاید اسی میں میرے لیے کچھ بہتری ہوگی۔"

مہناز صاحبہ ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھیں، جنہیں ان کی زندگی میں ہی بہت سے ایوارڈز سے نوازا گیا۔ پرائڈ آف پرفارمنس کے علاوہ نو مرتبہ بہترین گلوکارہ کا نگار ایوارڈ اور ایک دفعہ پی ٹی وی ایوارڈ بھی ملا غیر ممالک میں پرفارمنس کے دوران بھی انہیں متعدد ایوارڈز مل چکے ہیں۔

مہناز اپنے بارے میں بتاتے ہوئے یہ بات ضرور کہتی تھیں کہ "میں ایک گھریلو خاتون ہوں۔ گھر کے کام کرنا اور کھانا پکانا مجھے بہت پسند ہے۔ میرے ہاتھ میں لذت بھی ہے اس لیے خاندان بھر کے لوگ نہ صرف میرے کھانے کی تعریف کرتے ہیں، بلکہ مجھ سے فرمائش کرکے پکواتے بھی ہیں۔"

مہناز کی زندگی کا سفر 19 جنوری 2013ء کو مکمل ہوا۔ وہ بلڈ پریشر اور شوگر کی مریضہ تھیں۔ آخری چند مہینوں میں پھیپھڑوں کی سوزش کا شکار بھی ہو گئی تھیں۔ انسان کی زندگی کے دن پورے ہو جائیں تو پھر اس دنیا سے جانے کا بہانہ بھی بن جاتا ہے اور مہناز کی بیماری ان کے جانے کا بہانہ بنی حالانکہ یہ کوئی ایسی بیماری نہیں تھی کہ جس کا علاج نہیں تھا۔ مگر اللہ نے مہلت ہی نہیں دی۔

مہناز ایک صابر و شاکر خاتون تھیں۔ لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ اپنی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان رہتی تھیں اور اکثر کہتی تھیں کہ "جب فنکار کسی کام کا نہیں رہتا تو سب اسے چھوڑ جاتے ہیں۔" انہوں نے حکومتی سطح پر بھی اپنی بیماری کے علاج کی اپیل کی مگر کسی نے کان نہیں دھرے..... یہی ہماری قوم کا اور ہماری معروف شخصیات کا المیہ ہے کہ حکومتی سطح پر کسی کو کوئی امداد وقت پر نہیں ملتی۔

ہم جانتے ہیں کہ اس سال یقیناً" مہناز بیگم کے لیے ایک اور حسن کارکردگی کا ایوارڈ یا نشان امتیاز کا دینے کا اعلان کیا جائے گا۔ مگر سوچیے! یہ ایوارڈز مہناز کے لیے اب کس کام کے ہوں گے؟

☼

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی۔ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔

سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ



بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں قلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ قلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی قلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ، ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے، سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش و نگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کرگیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من یا لو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پرسکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

قلزا ظہور، سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور، فاطمہ اور خدیجہ کو قلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

ماہ نور نے سعد کو فون کرکے شکوہ کیا کہ اس نے اسے جرمنی جانے کی اطلاع کیوں نہیں دی تھی۔ ماہ نور نے سعد سے وعدہ لیا کہ آئندہ وہ اسے بتا کر ہی کہیں جائے گا۔ اگلے دن سعد نے اسے کئی میسجز بھیجے۔ جن میں وہ اطلاع دیتا رہا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ماہ نور کو یہ سب اچھا تو لگا، مگر اس نے سعد کو منع کردیا اور کہا کہ وہ اسے بس ملک سے باہر جاتے ہوئے اطلاع دیا کرے۔

سعدیہ نے آپا رابعہ سے تنگ کر اپنے رشتے داروں کی بابت پوچھا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوگئیں۔ انہوں نے مولوی سرفراز سے اپنی تشویش کا اظہار کیا کہ سعدیہ کو شک ہوگیا ہے کہ ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ تاہم مولوی سرفراز نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

سعد نے قلزا ظہور سے ملاقات کی اور اس کا اسٹوڈیو بھی دیکھا۔ اس نے وہاں کچھ ادھوری پینٹنگز بھی دیکھیں۔ جو اسے بے حد متاثر کن لگیں۔

سارہ نے لچکیلے ربڑ سے کچھ جانور بنائے۔ سعد نے دیکھ کر کہا کہ اگر تم نے اس سے بھی اچھے بنائے تو میں تمہیں اپنے اور تمہارے بارے میں ایک اہم بات بتاؤں گا۔ سارہ نے اس سے وعدہ کرلیا کہ وہ اب اور محنت کرے گی۔

ماہ نور اپنے رشتے داروں کی شادی میں گئی تو وہاں ہال کے باہر اسے سعد کچھ لوگوں کے ساتھ نظر آیا۔ ماہ نور اسے اپنے شہر میں دیکھ کر حیران ہوگئی۔ وہ اس سے ملنے کے ارادے سے اس کی طرف بڑھی۔ مگر سعد نے ایس ایم ایس کے ذریعے اسے روک دیا۔ ماہ نور ششدر رہ گئی۔

گیارہویں قسط

"کیا مجھے اماں سے اس طرح بات کرنی چاہیے تھی جیسے آج صبح میں نے کی۔" اس روز اسکول میں پڑھائی کے ہر گھنٹے کے دوران سعدیہ کا ذہن اسی بات میں اٹکا رہا۔

"لیکن میں نے کچھ غلط بھی تو نہیں کہا نا۔" اس کے ذہن میں ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آتا رہا۔ "کیا کوئی گھرانہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا کوئی آگا پیچھا ہی نہ ہو اور وہ زندگی کو ایک مشقت بھرے کام کی طرح یوں گزار رہا ہو کہ رات آئی تو کچھ ستا لیا۔ صبح ہوئی تو پھر کام سے لگ گئے۔ کچھ تو ہوتا ہے نا زندگی میں 'عزیز' رشتہ دار نہ سہی 'کوئی جاننے والا' کوئی ملنے والا' کوئی تو ہوتا ہے نا' چلو نہیں ہے کوئی تب بھی کوئی وجہ 'کوئی دلیل تو ہوتی ہے نہ ہونے کی' یہ کیا کہ جب پوچھا 'بھئی کوئی کیوں نہیں ہے تو جواب میں ڈنڈا اٹھا لیا کہ ان باتوں میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں' انہیں کیا پتا کہ کلاس میں جب لڑکیاں کسی خالہ 'پھوپھی کا پوچھتی ہیں اور میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا تو مجھے کیسا محسوس ہوتا ہے۔ انہیں تو شاید یہ بھی نہیں پتا چلتا کہ گاؤں میں بھی کبھی کبھی لوگ دبی زبان میں یہ بات کر جاتے ہیں کہ مولوی صاحب اور بہن جی کا پیچھے سے کوئی ملنے والا کبھی نہیں آتا' نہ ہی یہ لوگ کبھی کہیں جاتے ہیں' ان لوگوں کو بھی کیا جواب دیا جائے۔

وہ سوچتی رہی' خود سے ہی سوال اور خود ہی جواب دیتی رہی۔ اسے بہت سوچنے پر بھی اپنے ماں 'باپ کا کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگتا تھا۔ اباجی مسجد میں وقت گزار دیتے اور اماں سارا دن گھر کے کونے کھدرے میں جھانکتی کوئی نہ کوئی کام اپنے لیے تلاش کرتی رہتیں' اس نے اماں اور اباجی کی آپس کی گفتگو میں سے بھی کسی بات کا سراغ لگانے کی بہتیری کوشش کر دیکھی تھی' مگر ان کی گفتگو اتنی رسمی اتنی نپی تلی ہوتی تھی کہ کسی گزری بات کا شائبہ

تک نہیں ہو پاتا تھا۔

کبھی کبھی تو اسے لگتا کہ اماں اور ابا جی صرف اس کے ماں باپ تھے آپس میں میاں بیوی تھے ہی نہیں، اگرچہ میاں بیوی کے رشتے کو بہت زیادہ حد تک سمجھ نہیں پاتی تھی کیونکہ بیالوجی کی جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی اس میں مرد اور عورت کے تعلق کو کسی جانور یا پودے کی حیات کے ذریعے بیان کیا گیا تھا، مگر اتنا اندازہ اسے ضرور تھا کہ میاں بیوی کے تعلق میں اتنا پردہ اور ایک دوسرے کی اتنی حیا نہیں ہوتی جتنی اس کے ماں باپ کے درمیان حائل تھی۔

کبھی جو وہ سردی کی دھوپ میں بیٹھ کر پڑھنے کے لیے اتوار کی چھٹی والے دن چھت پر بیٹھ جاتی تو اسے ارد گرد کے گھروں سے رشتوں میں جذبات محبت، لڑائی، ناراضی اور کھلکھلاہٹ کی اٹھتی مہک اپنی حسیات تک پہنچتی محسوس ہوتی، وہ اس وقت اپنے محسوسات خود اپنے سامنے ہی وضاحت کرنے سے قاصر رہتی۔ کسی گھر میں میاں بیوی کی تو تکار، کسی گھر میں باپ بیٹے کی گفتگو، کسی گھر کے کھلے دروازے سے آنے والے مہمان کی آمد پر قہقہے، کسی میں موت پر تعزیت، آوازیں بغیر کسی کوشش کے اس کے کانوں پہنچتیں اور وہ ان ہی آوازوں کے ذریعے رشتوں کی اہمیت کو سمجھتے اس عمر تک آپہنچی تھی کہ دل و دماغ میں اٹھتے والے سوال زبان کے ذریعے آواز پانے لگے تھے۔

"اماں نے تو کبھی نہیں بتایا، میں خود ہی کوشش کرکے پتا کرتی ہوں اور لازمی پتا کرتی ہوں۔"

اس نے اس سارا دن کی ذہنی کشمکش کے بعد فائنل فیصلہ کرتے ہوئے سوچا اور صبح کی نسبت ہلکے ذہن کے ساتھ اسکول کے گراؤنڈ میں موجود ان لڑکیوں کے گروپ میں جا بیٹھی۔ اس کی طرح جن کا تانگہ بھی ابھی انہیں لینے نہیں آیا تھا۔ وہ لڑکیاں اپنے درمیان ایک ہفتہ وار رسالہ پھیلائے بیٹھی تھیں، اس رسالے میں رنگ برنگ تصویریں تھیں اور فیشن کے مطابق ملبوسات بھی۔

"اس رسالے میں سب کچھ ہوتا ہے، دین اسلام کی باتیں بھی، کہانیاں بھی، کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی، ملک کے حالات کی خبریں بھی، نت نئی ایجادات کے بارے میں معلومات بھی۔" اس کی اپنی ہم جماعت فردوس جو یہ رسالہ لے کر آئی تھی نے اسے بتایا۔

"اگر تم برا نہ مانو فردوس! تو آج میں یہ رسالہ گھر لے جاؤں۔"

سعدیہ نے تانگے میں بیٹھنے سے پہلے اچانک فردوس سے کہا۔ سعدیہ کا یہ سوال فردوس کے لیے اگرچہ انوکھا تھا مگر اسے سعدیہ کو وہ رسالہ دینے میں کوئی تامل نہ ہوا جو دو ہفتے پرانا تھا اور جسے وہ الف تا یے پڑھ چکی تھی۔ اس نے وہ رسالہ سعدیہ کو دے دیا۔ اس روز سعدیہ اپنے بستے میں ایک نیا جہان لے کر گھر پہنچی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں روزگار کے جھنجھٹ سے یوں آزاد دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ کیا تم جانتی ہو؟" شیکھر نے بہت دن بعد نادیہ کے نظر آنے پر اس سے کہا۔

"شکریہ۔" نادیہ ہولے سے مسکرائی۔ "مگر تمہیں یاد رہے کہ کسی کو ادھار دینے کے لیے میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" شیکھر کھلکھلا کر ہنس دیا۔ "اور تمہیں بھی یاد رہے کہ میں ان دوستوں میں سے نہیں ہوں جو ادھار مانگنے کی خاطر ایسی باتیں کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" نادیہ نے کہا۔ "میں تمہارا نام ایسے دوستوں کی فہرست میں آج ہی شامل کرلوں گی۔ جو ادھار مانگنے کی خاطر ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

"لیکن میں ایسا دوست ضرور ہوں جو یہ پوچھنا چاہے گا کہ نادیہ! کیا تمہاری کوئی لاٹری نکل آئی ہے، کوئی جیک پاٹ ہاتھ لگا ہے یا کوئی دولت مند رشتہ دار مر گیا ہے۔" شیکھر نے کہا اور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

"اور میں ایسی دوست ہوں جو کم از کم تم جیسے دوست کو یہ ضرور بتائے گی کہ ان میں سے کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔" نادیہ مسکرائی اور اس نے ہاتھ میں پکڑے ڈرنک کی بوتل منہ سے لگالی۔

"وہ تو پھر کیا ہوا جو تم ایک دم روزگار ڈھونڈنے کی مشقت سے آزاد ہو گئیں، یقیناً" تم یہ نہیں بتاؤ گی۔" شیکھر نے ترچھی نظروں سے نادیہ کو دیکھا۔

"ہرگز نہیں بتاؤں گی، کیونکہ یہ میرا راز ہے، اور اسے میں کسی پر افشا نہیں کر سکتی۔" نادیہ نے جواب دیا اور ہنس دی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔" شیکھر نے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور پاپ کارن کے پیکٹ سے دانے نکال کر کھانے لگا۔

"کسی شام آنا، میں تمہیں کافی پلاؤں گی اور سینڈوچ بھی کھلاؤں گی، وہ ایسی چیزیں جو مجھے بنانی آتی ہیں۔" نادیہ نے اٹھتے ہوئے شیکھر سے کہا۔

"میں سینڈوچ سے زیادہ بھاجی پوری میں دلچسپی رکھتا ہوں، اگر وہ کسی کو بنانی آتی ہوں تو۔" شیکھر مست ہو رہا تھا۔

"انڈین مسالے۔" نادیہ نے کہا "کسی قیمت پر نہیں۔ زبان کاٹ دیتے ہیں۔"

"اور مغربی کھانے۔" شیکھر نے مندھی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔ "ایک دم بکواس، زبان چاٹ جاتے ہیں۔"

"تو مجھے کیوں کہہ رہے ہو۔" نادیہ نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں مغربی نہیں ہوں۔"

"تو پھر تم کون ہو؟" شیکھر اب مکمل طور پر ٹن ہو چکا تھا، اس کی آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔

"میں پاکستانی ہوں شیکھر!" نادیہ نے شیکھر کی ناک کو انگلی سے چھوتے ہوئے شرارتاً کہا۔ "جی جان سے تمہاری دشمن۔"

"اور تمہیں یہ بھی نہیں پتا کہ تم پاکستانی مسلمان ہو یا پاکستانی لادین۔" شیکھر نے اپنی مست آنکھیں کھولیں اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

نادیہ شیکھر کے اس جملے پر ٹھٹکی اور پھر خاموش ہو گئی۔ اس نے ایک نظر شیکھر پر ڈالی جو آنکھیں موندے کوئی پوربی گیت گنگنا رہا تھا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے اس ریستوران کے دروازے تک پہنچی لیکن وہاں سے واپس مڑ کر وہ دوبارہ شیکھر کے قریب آگئی۔

"ہے شیکھر!" اس نے ایک بار پھر شیکھر کی ناک کو چھو کر اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ "معاف کرنا میں نے تمہیں تنگ کیا۔" اس نے اپنے بالوں کو جھٹک کر چہرے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "میں صرف یہ بتانا چاہتی تھی کہ اپنی ڈائری میں آج یاد سے لکھ لینا، نادیہ بلال پاکستانی مسلمان ہے۔"

شیکھر نے بمشکل آنکھیں کھول کر اس کی بات سنی، اسے سمجھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ "لگتا ہے، آج تم نے

بھی خوب پی لی ہے نادیہ!" وہ بولا اور ہنستے ہنستے آنکھیں موندھ لیں۔

"ٹھیک ہی تو ہنسا تھا شیکھر۔" یونیورسٹی روڈ پر سائیکل چلاتے ہوئے نادیہ نے شیکھر کے ردِعمل پر اچ... طرح کھول لینے کے بعد سوچا۔ "میرے حلیے، گفتگو اور طرزِ زندگی کو دیکھ کر کوئی کیسے مان سکتا ہے کہ میں پاکستا... مسلمان ہوں۔ یقیناً" اس بات کو سال کا سب سے بڑا لطیفہ قرار دیتے ہوئے اتنی ہی زور سے ہنسنا چاہیے۔ جتن... اونچی آواز میں شیکھر ہنسا تھا۔"

اسے خود پر غصہ آرہا تھا یا کسی اور پر' یہ شاید اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا مگر وہ اپنا سارا غصہ سائیکل کے پیڈلز پر اتار رہی تھی جنہیں وہ اتنی تیزی سے گھما رہی تھی کہ وہ چرخ چوں کی آوازیں دینے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا حال ہے ماہ نور؟"

"آئی ایم سوری' میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"اچھا' چلو۔" کوئی بات نہیں' میں نے شاید غلط نمبر پر کال کر دی۔ کیا خیال ہے' بند کر دوں فون پھر؟"

"میں کسی ایسے شخص سے بات کیوں کروں' جو اپنی مرضی سے بات کرتا اور پہچانتا ہے۔ مرضی نہ ہو تو بالکل اجنبی بن جاتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم سخت ناراض ہو اور تمہیں ہونا بھی چاہیے۔"

"نہیں۔ تم کچھ نہیں جانتے' اور ہر بار مجھے اسی طرح ہرٹ کرتے ہو۔ آئی ایم سوری۔ میں بار بار ہرٹ ہونا نہیں چاہتی۔"

"پلیز! ایسی بات مت کرو' کل رات ایسا نہیں تھا کہ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ میں تم سے بات کرنا اور تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا' یقین کرو' ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"پھر تم نے ایسا کیوں کیا' مجھے منع کیوں کیا۔ مجھے میسج کرکے کیوں روکا۔"

"سمجھو' اس میں کچھ مصلحت تھی۔ اس وقت ہم ایک بزنس میٹنگ سے اٹھ کر آئے تھے اور اس وقت میرے ساتھ ایسے ہی لوگ تھے جن کے ساتھ ہمارے صرف بزنس ریلیشنز ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔ مجھے تو صرف تم سے ہیلو ہائے کرنا تھی' میرے ساتھ میرے بابا اور ممی تھیں' سلمان بھی تھا' میں تمہیں ان سے ملواتی اور بس۔"

"میرے ساتھ بھی میرے ڈیڈی تھے ماہ نور' اور لوگوں کے علاوہ۔"

"میں سمجھ گئی تھی' میں نے انہیں دیکھا تھا اور دیکھتے ہی پہچان گئی کہ وہ ہی تمہارے ڈیڈی تھے' تم دونوں ایک دوسرے سے انتہا سے زیادہ مشابہت رکھتے ہو۔ تمہارے درمیان صرف عمروں کا فرق ہے۔ لیکن کیا فرق پڑتا تھا۔ کہ وہ تمہارے ساتھ تھے' میں ان سے بھی مل لیتی۔"

"نہیں ماہ نور! تم نہیں سمجھو گی۔ ڈیڈی کا مزاج عام انسانوں سے بہت مختلف ہے' وہ تعلقات اور رشتوں کو بھی بزنس میٹرز کی طرح ہینڈل کرنے کے عادی ہیں' نفع نقصان کی کیلکولیشن کی طرح ان کو بھی کیلکولیٹ کرتے ہیں' میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے جیسی مخلص اور اچھی دوست کے ساتھ میری دوستی کا تعلق ان کی نظروں کے سامنے آئے۔ میرے معاملے میں وہ بے حد حساس بھی ہیں' انہیں ہر اس انسان کی چوکسی کرنے کا خبط بھی ہے جس سے میرا تعلق ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میں اپنے معاملات ان سے بہت خفیہ رکھتا ہوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی' وہ تمہارے فادر ہیں' تمہیں ان کے ساتھ فرینک ہونا چاہیے۔"

"میں ان کے ساتھ ہر معاملے میں فرینک ہوں مگر میں ان کے مزاج کی وجہ سے اپنے پیارے تعلقات کو جھلاہٹ میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ چپ سی ہو گئی۔

"تم خاموش کیوں ہو گئیں' میں جانتا ہوں' تم الجھن میں پڑ گئیں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے' لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ تمہیں یہ بات' مجھے پہلے بتا دینی چاہیے تھی۔ جیسے تم ...اور بہت سی باتیں مجھے بتائیں' اگر مجھے پتا ہوتا تو شاید میں اس طرح تمہیں مخاطب نہ کرتی' میں تو سمجھی تم لاہور ...ئے ہوئے ہو جیسا کہ تم نے بتایا تھا کہ تم آنے والے ہو اور اتفاق سے نظر بھی آگئے ہو تو اپنی فیملی سے تمہیں ...تی۔"

"میں نے تمہیں میسج میں بتایا تو تھا کہ میں ابھی ادھر ہی ہوں اور ان شاءاللہ تم سے اور تمہاری فیملی سے ...رور ملوں گا۔"

"ہاں ضرور۔"

"کل کی میٹنگ میری آخری مصروفیت تھی' اس کے بعد میں نے اس سیزن کا آف لے لیا ہے اور اب میں کچھ ...ت کے لیے اس ہنگامہ خیز' تیز رفتار زندگی سے بالکل فارغ ہوں' اپنی مرضی اور اپنے مزاج کے مطابق وقت ...گزارنے کے لیے۔"

"تمہارے ڈیڈی اب تمہاری چوکسی نہیں کریں گے؟"

"کریں گے۔ کوشش تو ضرور کریں گے لیکن مجھے بھی ان کو جل دینے کے بہت سے طریقے آتے ہیں۔"

"ویسے تم کل رات بہت تیار شیار تھیں' خیر تو تھی۔"

"میں نے تمہیں بتایا تو تھا' میری کزن کی شادی تھی۔ کل رات بارات کا فنکشن تھا' اور تم بھی تو ڈنر سوٹ میں ...ہرگز بندر کے تماشے والے نہیں لگ رہے تھے۔"

"ہاہا' آئی سی۔ مگر تم بہت مختلف لگ رہی تھیں' پہلے میں سمجھا۔ وہ تم نہیں تم نما کوئی لڑکی تھیں اور میری ...نظریں دھوکا کھا رہی تھیں۔"

"کیا واقعی میں نے اوورڈو کر لیا تھا۔"

"اوورڈو کیا مطلب۔"

"مطلب میری ایک کزن کہہ رہی تھی میں نے خود کو ضرورت سے زیادہ ڈیکوریٹ کر لیا تھا' اس کا مطلب میں ...بہت بری لگ رہی تھی' مجھے پہلے ہی شک تھا' رانیہ کی بچی جھوٹ بول رہی تھی مجھے تسلی دینے کے لیے' وہ تو مذاق کر رہی تھی۔"

"ویسے تو میرے پلے تمہاری کوئی بات نہیں پڑ رہی' لیکن تم کل رات مجھے ہر بار سے زیادہ مختلف لگ رہی تھیں' شاید مجھے اپنی بات کی وضاحت کرنی نہیں آرہی۔"

"صاف کہو نا کہ میں چڑیل لگ رہی تھی' ایک تو میری ممی انہیں مجھے ڈارک اور برائٹ کلرز پہنانے کا خبط ہے' چاہے وہ مجھ پر کتنے ہی برے کیوں نہ لگ رہے ہوں۔"

"یار! تم تو رونے لگیں۔ یہ کیا بات ہوئی۔"

"مجھے یہ سوچ کر رونا آرہا ہے کہ کل رات میں کس کانفیڈنس کے ساتھ سارے فنکشن کے دوران ادھر ادھر اڑی پھر رہی تھی جبکہ لوگ میری چڑیلوں جیسی شکل پر ہنس رہے ہوں گے۔"

"افوہ بھئی۔ تم تو بہت ہی کانشس ہو گئیں' میری بھی سمجھ میں وہ الفاظ نہیں آرہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔"

"نہ بھی کہو تو بھی مجھے پتا ہے۔"

"اچھا چھوڑو' اس بات کو' یہ بتاؤ کہ آج کل کیا ہو رہا ہے۔"

"شادی کے ہنگاموں میں کتنے ہی دن ضائع ہو گئے' اور اب تو اسٹڈیز کا بہت ہی زیادہ پریشر ہو گا۔"

"مطلب تم سے ملاقات مشکل ہے۔"

"نہیں۔ ایسا بھی ہرگز نہیں ہے تم میرے گھر آؤنا کسی دن' بلکہ ایک دو دن میں ہی آجاؤ' کیونکہ میرے چچا کی فیملی نے دو' تین دن میں واپس چلے جانا ہے اور ان کے ساتھ کھاری بھی چلا جائے گا' پتا ہے کھاری' اس سائیں کو بہت یاد کرتا ہے' جو اسے بابے منگو کے میلے پر ملا تھا۔"

"ہاہاہا۔"

"بات سنو' تم نے آف لے لیا ہے' کہیں کوئی نیا بہروپ بدلنے کا ارادہ تو نہیں۔"

"ہاہاہا۔ اچھا ایسا ہے کہ ایک دوست کی کال آرہی ہے ذرا اس کی بات سن لوں' تمہیں پھر کسی وقت کال کرتا ہوں۔"

"ہاں ضرور۔ اپنا خیال رکھنا۔"

ماہ نور نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا اور مسکرا دی۔ وہ سعد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میسج کی ٹون نے اسے سوچ سے چونکا دیا۔ اس نے میسج پڑھا۔

"یاد آگیا' میں تمہارے کل والے روپ کے بارے میں دراصل کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ میں کہنا چاہ رہا تھا۔"

Girl you are amazing
just the way you are
(تم جیسی بھی ہو مبہوت کر دیتی ہو)

☆ ☆ ☆

"آپ کے والدین ہوری کہاں رہتے ہیں جناب۔"

کھاری نے مرغ کڑاہی اور کٹا کٹ پلیٹ میں اکٹھے ڈال کر ان کو ملاتے ہوئے محمد رضوان الحق سے پوچھا۔ وہ محمد رضوان الحق کی دعوت پر دیسی کھانوں کے اس ہوٹل کی ایک میز پر بیٹھا خود کو انتہائی اہم شخصیت  تھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں پتا بھائی افتخار!" رضوان الحق نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں میز پر رکھے شیشے کے پھول دان پر جماتے ہوئے کہا۔ شیشے کے اس پھول دان میں پتلی سی شاخ پر سجا گلاب کا مصنوعی پھول بے بسی سے ایک طرف گردن نیہوڑائے جھول رہا تھا۔

"میں نے مدت ہوئی' انہیں کھو دیا۔" اس نے کھانے میں مگن کھاری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کھاری کا لقمہ بناتا ہاتھ ایک دم رک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر رضوان الحق کی طرف دیکھا اور پھر سر ہلا کر توجہ دوبارہ لقمے پر مبذول کر لی۔

"بڑے خوش قسمت ہو جی پھرتے تسی۔ تساں نے ان کو کھو دیا۔ الیرہ کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اوناں کو

کبھی پایا بھی تھا' ہے نا؟" اس نے تائید طلب نظروں سے رضوان کو دیکھا۔ "مطلب تساں نے اپنے والدین دیکھے ہیں؟" رضوان نے سر ہلایا۔

"ہاں دیکھے ہیں' افتخار بھائی!" اس نے کہا۔ "جب میں چھوٹا تھا تو ماں اور باپ دونوں کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔"

"تو پھر آپ تو خوش قسمت ہوئے نا جی!" کھاری نے روٹی کے آخری نوالے سے پلیٹ صاف کرنے کے بعد نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"شاید" رضوان شاید کھاری کی بات سمجھ نہیں پایا تھا اس لیے اس نے گومگو میں جواب دیا۔

"میں ہوں نا۔" کھاری نے ٹشو پیپر سے صاف کرنے کے بعد ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے اپنے ماں پیو دیکھے بھی نہیں۔" "میں اوناں کی شکلاں سے بھی واقف نہیں۔ مجھے ان کا نام پتا' اگا پچھا بھی نہیں پتا' ماسی جنت کہنی ہے۔ کھاری باؤ بوتی پرچولیں (زیادہ کھوج) نہ کیا کر' بوتے سوال نہ پوچھا کر' اگلے کہیں گے جا اوئے افتخار احمد! پتا نہیں تو حلال کا بھی ہے کہ نہیں۔"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ رضوان الحق نے دیکھا ہنستے ہوئے کھاری کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"ایس لیے میں تو سوچتا بھی نہیں' میں تو کچھ پچھدا بھی نہیں۔" کھاری نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ٹشو پیپر سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا اور سر اٹھا کر رضوان کی طرف دیکھا۔

"بوتا ہنسیے (زیادہ ہنسو) تو آنکھوں میں اتھرو (آنسو) آجاتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر آنکھوں پر ایک دفعہ پھر ٹشو پیپر رکھ لیا۔

"پتا نہیں افتخار بھائی۔" رضوان الحق نے جھرجھری لینے کے بعد سر ہلایا۔ "کون زیادہ خوش قسمت ہے۔ لیکن ایک بات ہے' میں نے تو خود اپنے ماں باپ کو چھوڑا' میں بہت سال پہلے گھر سے بھاگ گیا تھا۔"

"اچھا جی!" کھاری نے حیرت کا شکار ہوتے ہوئے کہا۔

"فرق دیکھو افتخار بھائی! تم نے ماں باپ نہیں پائے پھر بھی اللہ نے تمہیں ایک محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا۔ میں نے ماں باپ پائے لیکن ٹھکانے کو لات مار دی۔ تمہیں یہ فکر نہیں ستاتی کہ سارا دن کام کرنے کے بعد رات کہاں گزارنی ہے۔ مجھے یہ فکر سارا دن ڈھنگ سے کام نہیں کرنے دیتی کہ دن تو گزر گیا' رات کا کیا ہو گا۔"

کھاری آنکھیں کھولے دم بخود بیٹھا رضوان کی بات سن رہا تھا۔

"تم نے آنکھ کھولی، ہوش سنبھالا تو اپنے نہ سہی، اپنوں جیسے کچھ رشتے اپنے اردگرد پائے، میں نے آنکھ کھولی اردگرد اپنوں کو پایا، مگر جب اپنوں سے بچھڑ گیا تو پھر کوئی اپنا نہ بن سکا۔ میں اس اتنی بڑی دنیا میں، اللہ کے اتنے زیادہ بندوں کے درمیان بالکل اکیلا ہوں افتخار بھائی!"

اب کے جھرجھری لینے کی باری کھاری کی تھی۔

"اوئے ہوئے ہوئے!" کھاری نے آنکھیں جھپکا کر سرہلاتے ہوئے کہا۔ "بھلا دسو، دنیا وچ جس کو پھولو (کھوج لگاؤ) وہی دکھی ہے۔"

"نہیں افتخار بھائی یہ دنیا کا جو میلہ ہے نا، اس میں سب بندوں کو خوش ہونے کا موقع بھی ملتا ہے، دکھ کی کہانی سنا کر ہم بندے ناشکری بھی کرتے ہیں اور دکھ کی کہانی سنا سنا کر خوش بھی ہوتے ہیں۔" رضوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کئی لوگ ہیں جی دنیا میں۔" کھاری نے رضوان کی بات سمجھے بغیر اسے مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے بڑے ایسے دیکھے ہیں جو کبھی دکھی نہیں ہوندے، سدا خوش رہندے ہیں۔" "یہ اپنی جو ماہ نور بی بی ہے نا،" پھر اس نے بازو میز پر رکھ کر آگے جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"وہی جو آج تم نے دیکھی جب تم مجھے لینے نہیں آئے تھے۔" اس نے رضوان کو یاد کرایا۔

"ہاں!" رضوان نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ اسے وہ لڑکی یاد آگئی جو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے افتخار سے اس کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور جس نے دوستانہ انداز میں اسے ہیلو بھی کہا تھا اور جس کی عمر، مسکراہٹ، زندہ دلی اور چہرے پر چھائے خوشگوار تاثرات کو دیکھ کر رضوان کو نجانے کیوں ایک پرانا چہرہ، ایک گزرا وقت، ایک پرانا تعلق یاد آگیا تھا۔

"اس کو کوئی دکھ نہیں ہے۔" کھاری نے جیسے رضوان کو ایک راز کی بات بتائی "اس کو اکیلی کو نہیں، اس کے خاندان میں کسی کو کوئی دکھ نہیں، سارے بڑے خوش ہیں اللہ کے فضل سے۔"

"چلو افتخار بھائی! اچھی بات ہے۔" رضوان نے وہ کہنے کا ارادہ منسوخ کرتے ہوئے کہا جو وہ افتخار کی اس بات کے جواب میں کہنا چاہتا تھا۔

"دعا کرو جو خوش ہیں ہمیشہ خوش رہیں، ان کو کبھی کوئی دکھ نہ پہنچے۔" اس نے کھاری کی طرف دیکھا جو اس کی بات کی تائید میں سرہلا رہا تھا۔

"چلو پھر تو طے ہے نا کہ تسی ہمارے پاس آرہے ہو میلے تے؟" کھاری نے مسکراتے ہوئے موضوع گفتگو بدلا۔ اسے رضوان الحق کی اس مہمان نوازی کا بدلہ چکانے کی فکر ہورہی تھی جس کی وجہ سے اس نے کئی دنوں بعد اتنا مزے دار دیسی کھانا کھایا تھا۔

"ہاں، وہ تو میں ضرور آؤں گا ان شاءاللہ۔" رضوان نے کہا۔

"چلو فیر، میں تو واپس جا کر بس آپ کے آنے کی اڈیک (انتظار) میں ہی رہوں گا۔" کھاری خوش ہوتے ہوئے بولا۔ بیرے نے اس کے سامنے فیرنی کی ٹھوٹھیاں لا کر رکھی تھیں۔

"واہ وئی واہ۔" وہ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھا لاہور شہر میں بس فاس فوڈ (فاسٹ فوڈ) اور انگریزی، چینی، جپانی کھانے ہی ملتے ہیں۔" اس نے رضوان سے کہا جو مسکرا رہا تھا۔

"چینی، جپانی سے یاد آیا، آپ کے ابا جی چینی جپانی تھے کہ اماں ہوری؟" اس نے سوال کرنے کے بعد ایک نظر رضوان پر یہ دیکھنے کے لیے ڈالی کہ وہ اس انتہائی ذاتی سوال پر ناراض تو نہیں ہوا۔

اس نے دیکھا رضوان کا چہرہ ہی نہیں چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

"آپ کا کیا خیال ہے، کون ہو گا ان دونوں میں سے؟" اس نے کہا۔

"کئی لوگوں کی تو اماں جی ہی باہر کی ہوتی ہیں، ابے ادھر کے ہی ہوتے ہیں۔" کھاری نے اپنی معلومات کھنگال کر جواب دیا۔ "ہمارے پنڈ میں گجروں کا بیٹا گیا تھا جرمنی اس نے ادھر میم سے شادی کرلی تھی، ایک دفعہ میم لے کر آیا تھا۔ ہماری جو چوہدرانی ہیں نا ان کو میم کا بڑا چاہ (شوق) چڑھا، اونہاں نے میم کی دعوت بھی کی تھی فارم ہاؤس پر۔ چوہدری صاحب بولے لو دسو گجروں کا پتر اب اتنا اپارٹمنٹ (امپورٹنٹ) ہوگیا ہے۔"

وہ ٹانگ پر ہاتھ مارتے ہوئے زور سے ہنسا۔ رضوان دلچسپی سے اس کی بات سنتے ہوئے مسکرایا۔

"پر اس کے بعد وہ مڑ کے نہیں آیا۔" کھاری نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اتنے اتنے اس کے ایانے (بچے) ہیں۔" اس نے ہاتھ کی بلندی سے اندازہ کراتے ہوئے کہا۔ "چٹے دودھ، نرے انگریز۔ اونہاں کی تصویریں گجروں کے گھر بیٹھک کی دیوار پر فریم میں لگی ہیں۔" رضوان نے مسکراتے ہوئے سرہلایا۔

"پر جناب! تسی کیوں واپس آگئے باہر سے، ادھر ای جی کے پاس ہی رہنا تھا، ابے ہوروں کی کمائیاں کھاتے آرام سے۔" "اوئے ہوئے آپ ادھر سے بھاگ کے تو نئیں آئے ہو گے ہوائی جہاز میں اڈھ (اڑ) کے آئے ہو گے۔ آئندہ یہ نہ کہا کرو کہ میں گھر سے بھاگا تھا، کہا کرو میں گھروں اڈیا (اڑا) تھا۔"

"واہ افتخار بھائی! آپ باتیں بہت مزے کی کرتے ہو۔" رضوان نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا۔

"خیر جو بھی ہوا ہو گا۔ آپ کی مرضی تھی، نہیں رہے ماں پیو کے پاس۔" کھاری نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ "پر آپ کو پتا اڈریس (ایڈریس) تو یاد ہو گا نا؟" اس نے سوالیہ انداز میں رضوان کو دیکھا "تے پھر کدھی واپس چلے جاؤ، ماں پیو معاف کردیتے ہیں، کوئی بات نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک کہتے ہو افتخار بھائی!" رضوان نے اٹھتے ہوئے متانت سے جواب دیا۔ "مگر بہت سے کام ہم چاہتے ہوئے بھی نہیں کرپاتے۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" کھاری نے کھڑے ہو کر رضوان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "پر آگے سے ایک بات یاد رکھنا۔"

"وہ کیا؟" رضوان نے کھاری سے کسی نصیحت کی توقع کی۔

"مجھے بھائی کہا ہے تو مجھے کھاری کہہ کر بلایا کرو۔ اور یہ آپ جناب بھی نہیں کرنی۔ تسی بھانویں کتنے ورے (سال) ہی مجھ سے وڈے (بڑے) ہو، میں نے بھی آپ جناب نہیں کرنی آئندہ توں۔"

"اوکے، اوکے کھاری بھائی ڈن!" رضوان نے مسکرا کر کہا۔

"ڈن نہیں، ڈزن، ڈزن۔" کھاری نے فرضی پستول تانتے ہوئے منہ سے آواز نکالی۔ دونوں زور سے ہنس دیے۔



"تمہیں ایک بات بتاؤں۔" ماہ نور نے محویت سے سعد کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ضرور۔"

"تم ڈنر سوٹ میں واقعی بہت اچھے لگ رہے تھے۔"

"تھینک یو۔" وہ مسکرایا۔

"اس روز میں سمجھی کہ جیسے تم نے مجھے خود کو مخاطب کرنے سے روکا ہے تو کیا پتا یہ بھی تمہارا کوئی بہروپ ہو۔"

وہ زور سے ہنسا۔ "روپ میں بہروپ نہیں ہوتا لڑکی، بہروپ دیکھنا تھا تو کل تم لنڈا بازار آتیں۔"

"نہیں واقعی؟" ماہ نور کا بازو اور ہاتھ پر ٹکا چہرہ اپنے اس اسٹینڈ پر ہل گیا۔
"ہاں!" وہ مسکرایا۔
"تم نے وہ جراثیموں سے بھرپور پرانے، کسی کے اترے کپڑے بیچے؟" ماہ نور کی آنکھیں کی پوری کھل گئیں۔
"ہاں بالکل۔" سعد نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر ماہ نور کے سامنے پھیلائے۔ "مگر دیکھو، مجھے کچھ نہیں ہوا اب تک۔"
"شاید میں تمہیں کبھی سمجھ نہ پاؤں۔" ماہ نور نے سر ہلایا۔ "تم یہ سب کیوں کرتے ہو۔"
"کیا کرو گی سمجھ کر؟" اس نے کہا۔ "ایسے ہی ٹھیک ہے۔"
"گویا تم آج کل آف ہو پھر سے۔"
"ہاں سیزنل آف۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔
"وہ جو اس روز تمہارے رائٹ ہینڈ پر کھڑے تھے، وہ جو بالکل تمہارے جیسے تھے عمروں کے فرق کے سوا، وہ تمہارے ڈیڈی تھے نا؟"
"ہاں، کیسے لگے تمہیں؟"
"ایک دم زبردست!" ماہ نور نے بچوں کی طرح پرجوش انداز میں کہا۔ "اتنے ہینڈسم اور گریس فل۔"
"میں نے بتایا تھا تمہیں کہ وہ ایسے ہی ہیں۔"
"لیکن کیا تم دونوں سی آئی ڈی کے ایجنٹ ہو یا پھر خفیہ والے تمہارے پیچھے لگے ہیں جو تم ان کے سامنے مجھ سے ملنا نہیں چاہ رہے تھے۔" ماہ نور کو ایک بار پھر اس دن والی مایوسی یاد آگئی۔
"ایسا کچھ نہیں ہے۔" سعد نے شکردان سے چینی اپنی چائے کے کپ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل ان کا اکلوتا اور قیمتی بیٹا ہوں، شاید ان کا دنیا میں واحد رشتہ، اسی لیے وہ میرے معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ ہر وقت میری نگرانی پر تلے رہتے ہیں۔ انہیں مجھ سے متعلق کسی نئے شخص کا پتا چل جائے تو اس کے بارے میں بھی چوکنے ہو جاتے ہیں کہ کہیں وہ نیا شخص مجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچانے والا۔ بس اسی لیے میں ان سے اپنے کچھ ایسے تعلق چھپا کر رکھتا ہوں مبادا میرا اتنا پیارا تعلق ان کی چھان بین کا شکار نہ ہونے لگے۔"
"توبہ ہے، کتنی ان نیچرل زندگی ہے بھئی؟" ماہ نور نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔
"بس ایسی ہی ہے کیا کیا جائے۔" سعد نے سر ترچھا کرتے ہوئے ماہ نور کو دیکھا۔ "لگتا ہے تم جلد تنگ آجاؤ گی مجھ سے اور میری دوستی سے۔"
"نہیں، ہرگز نہیں۔" ماہ نور نے سختی سے سر ہلایا۔ "میں تمہارے بارے میں اتنا تو بہرحال جانتی ہوں کہ تم کیسے ہو۔"
"واقعی!" سعد نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "جب ہی میرے بارے میں فوراً بدگمانی کا شکار ہو جاتی ہو۔"
"وہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔" ماہ نور نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے لنڈے کے کپڑے اور تم۔" اس نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو وحشت ہو رہی ہے یہ سوچ کر۔"
"کل اگر تم مجھے وہاں دیکھ لیتیں تو کون ہو تم ـــ تم کون ہو' کی پکار ڈالتیں آگے بڑھتیں اور کیا پتا کپڑوں کی اس لاٹ پر جا گرتیں۔" سعد نے اسے چڑایا۔
"توبہ اللہ نہ کرے۔" ماہ نور کو تصور کر کے خوف آگیا۔
"اچھا یہ بتاؤ کہ تم میرے گھر کب آرہے ہو؟" پھر اس نے موضوع بدلا۔
"جب تم بلاؤ گی۔"

"میں تو آج بھی چاہ رہی تھی کہ تم مجھے یہاں بلانے کے بجائے میرے گھر آتے۔"
"میں نے سوچا، پہلے تمہارا موڈ تو چیک کر لوں پھر تمہارے گھر پہنچوں، کہیں اب کے تم پہچاننے سے انکار کر دو۔"
"ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔" ماہ نور نے فوراً جواب دیا۔
"اچھا یہ بتاؤ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری وہ جو خالہ ہیں جن کا ذکر تم نے کئی بار کیا ان سے مل سکوں۔"
"خدیجہ اور فاطمہ خالہ!" ماہ نور نے پرجوش ہوتے ہوئے کہا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں، اتنی سویٹ خواتین ہیں وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ فاطمہ خالہ تو کئی بار مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ سعد سے ہمیں ضرور ملوانا۔"
"اچھا؟" سعد کو حیرت ہوئی۔ "وہ مجھے کیسے جانتی ہیں بھلا؟" اچانک ماہ نور کو احساس ہوا، وہ کچھ زیادہ بول گئی تھی۔
"وہ۔" اس نے جواز سوچتے ہوئے ادھر ادھر آنکھیں گھمائیں۔
"ہاں وہ۔" اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔ "فاطمہ خالہ کو کھاری۔ نے بتایا تھا کہ میلے والے سائیں کی آواز بہت اچھی تھی۔"
"اچھا!" سعد مسکرایا۔ "مگر وہ تو میلے والا سائیں تھا، تمہاری خالہ کو سعد کا کیسے پتا چلا؟"
"ہاں وہ نا۔" ماہ نور کو فوراً احساس ہوا کہ اس نے غلط جواز پیش کر دیا تھا۔ "وہ شاید فلز اظہور کے گھر جانے کے حوالے سے ذکر ہوا تھا کہ تمہارے ساتھ میں وہاں گئی تھی۔"
"اچھا!" وہ ہنسا۔ "چلو مان لیتے ہیں۔ یہ بات مانی جاسکتی ہے۔"
"ہوں!" ماہ نور نے لمبا سانس لیتے ہوئے پہلو بدلا۔
"ویسے لاہور کی فضا اور یہاں کا ماحول اسلام آباد سے بالکل مختلف ہے۔" سعد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ریستوران کے اوپن ایریا میں بیٹھے تھے۔
"یہاں بے تکلفی اور بے ساختگی سی ہے جبکہ اسلام آباد میں ہر وقت بیوروکریٹک فضا چھائی رہتی ہے، بے تکلفی اور بے ساختگی نام کو بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔"
"اسی لیے تو جو مزا یہاں ہے، وہاں کہاں۔" ماہ نور مسکرائی۔
"وہ جگہ جہاں سارہ خان رہتی ہے، وہ بھی ہے تو چھوٹی سی مگر وہاں سادگی کی فضا ہے تصنع اور بناوٹ سے پاک وہ جگہ بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔" سعد کو یاد آیا اور اس نے دانستہ اپنی بات مکمل کر کے ماہ نور کے چہرے کے تاثرات جانچنے کی کوشش کی۔
"تم نے وہ پھول دیکھے؟" جواب میں ماہ نور نے سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے جھٹکا اور بالکل ہی مختلف بات کی۔
سعد نے پھولوں کے ان تختوں کی طرف دیکھا جن کی طرف ماہ نور نے اشارہ کیا تھا۔ سفید پھولوں کا ایک تختہ سبز پتوں اور شاخوں پر کھڑا تھا، یہ پھول بہار کی مخصوص مہک سارے میں پھیلا رہے تھے۔
لاہور میں بہار آچکی تھی۔

☆ ☆ ☆

آپا رابعہ نے بستر جھاڑ کر دوبارہ بچھاتے ہوئے کن اکھیوں سے کرسی پر کتاب لے کر بیٹھی سعدیہ کو دیکھا۔ اس نے پھول دار کاٹن کا دھلا دھلایا اور احتیاط سے استری شدہ سوٹ پہن رکھا تھا، اس کے سیاہ گھنے اور سیدھے بال

سلیقے سے کنگھی کر کے چٹیا کی شکل میں گندھے تھے' اس نے پاؤں میں سستی سی چپل پہن رکھی تھی' اس کے پاؤں صاف ستھرے اور پاؤں کے ناخن طریقے سے ترشے ہوئے تھے۔

"یہ اسکول سے واپس آکر کتنے سلیقے سے کپڑے پہننے لگی ہے اور اسکول سے واپسی پر بھی کتنا ٹائم بالوں میں کنگھی کرنے پر لگا دیتی ہے' کیا یہ وہی سعدیہ ہے جو ایک رنگ کے کپڑے پہنتی تھی یا تین رنگوں کے اسے کوئی پروا نہیں ہوتی تھی' کیا یہ وہی سعدیہ ہے جو کئی کئی دن بالوں میں کنگھی نہیں کرتی تھی' بس اوپر اوپر سے کنگھی پھیر نیچے الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ اسکول چلی جاتی تھی اور سارا سارا دن یونہی گزار دیتی تھی' پورے ہفتے کے بعد اتوار کی چھٹی کے دن' جب وہ ان کے ہاتھ لگتی تھی تو وہ اس کے بالوں میں تیل لگا کر کنگھی پھیر پھیر کر اس کے بالوں کو سلجھاتی تھیں۔

"کیا یہ وہی سعدیہ ہے؟" آپا رابعہ نے بے یقینی سے ایک بار پھر سعدیہ کو دیکھا جس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور عمر کے ساتھ بڑھتے شعور کی جھلک بھی۔

"وقت کہاں سے اور کب گزر گیا۔" انہوں نے گم صم ہوتے ہوئے سوچا۔

"سعدیہ کے چہرے پر نظر آتا اعتماد علم کا تحفہ ہے یا عقل کا؟" وہ سوچتی رہ گئیں۔

"کتنے پرچے باقی رہ گئے تمہارے؟" اپنی سوچوں کی روانی سے گھبرا کر انہوں نے سوال کیا' ان کا لہجہ درشت تھا یا تلخ' انہیں خود اندازہ نہیں ہو پایا۔

"دو۔" سعدیہ نے کتاب سے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔

"نویں کے بعد گھر بیٹھ کر پڑھنا پڑے گا۔" وہ ہاتھ میں پکڑی بستر کی چادر رکھ کر سعدیہ کے قریب چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"کیوں؟" سعدیہ نے کتاب سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھا' اس کے ماتھے پر تین چار بل بھی پڑ گئے تھے۔

"دسویں میں اسکول کے اخراجات بھی بڑھ جائیں گے اور تانگے کا کرایہ بھی' تمہارا ابا جی کی محدود سی آمدنی میں یہ اخراجات پورے کرنے مشکل ہو جائیں گے اس لیے۔" انہوں نے سعدیہ کے ماتھے پر پڑے بلوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے اماں؟" اب کے سعدیہ باقاعدہ حرکت میں آگئی۔ "کیا مطلب اخراجات پورے نہیں ہوں گے۔" اس نے پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو ڈاکٹر بنانا ہے آپ نے؟ ڈاکٹر بننے پر کتنا پیسہ لگتا ہے پتا ہے آپ کو...؟" اس نے ان کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"بس ایک ہی سال میں خبر ہو گئی ہمیں کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔" آپا رابعہ نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "گھر بٹھا کر میٹرک کروا لیں بڑی بات ہے' ڈاکٹر بننے کے لیے جتنا سر اٹھانا پڑتا ہے' اتنا اٹھائیں گے تو ہماری گردنیں ٹوٹ جائیں گی۔"

"مگر آپ نے یہ خواب دیکھا تھا' آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔"

سعدیہ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ آپا رابعہ سے سوال و جواب کے بدلے اسے اس کی زندگی کے واحد خواب اور اکلوتی آرزو سے دست برداری کی سزا ملنے والی تھی۔

"ایک ہی سال کے اخراجات نے بتا دیا کہ خواب بھی اپنی اوقات کے مطابق ہی دیکھنے چاہئیں اور خواہشیں بھی بساط تک محدود رکھنی چاہئیں۔"

آپا رابعہ نے اپنا بازو سعدیہ کے ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر بستر پر چھوڑی چادر سیدھی کر کے

بچھانے میں مصروف ہو گئیں۔ اس دوران تین' چار بار انہوں نے سعدیہ کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کا دھیان کتاب سے بالکل ہٹ چکا تھا۔ ان کے الفاظ کی بے رنگی نے اس کے تن سے سفید اوور آل اور گلے میں پڑا اسٹیتھسکوپ آن واحد میں چھین لیا تھا۔ وہ مضطرب اور پریشان نظر آرہی تھی۔

"کہیں یہ کل کا پرچہ بھی خراب نہ کر بیٹھے۔ شاید مجھے اس کے پرچے ختم ہو جانے کا انتظار کر لینا چاہیے تھا۔" انہوں نے سوچا۔ لیکن وہ کیا کرتیں سعدیہ کے بڑے ہو جانے کے متعلق اچانک آنے والے خیال نے انہیں اس بری طرح ہڑبڑا دیا تھا کہ وہ سعدیہ کی سرکشی پکڑتی سوچ اور گستاخی کی حدود میں داخل ہوتی زبان کو فی الفور گرفت کے جال میں دبوچ لینا چاہتی تھیں۔

ان سے انتظار ہو سکا تھا نہ صبر' انہوں نے جوابی حملہ کرنے میں دیر لگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹنے اور اس کا حلیہ درست کرنے کے بعد جب وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھیں' ان کے دل کو یقین ہو چکا تھا کہ سعدیہ آئندہ ان کے سامنے سوال کرنے اور طعنہ زنی سے پرہیز کرے گی مگر کمرے کے بند ہوتے کواڑ کے پیچھے بیٹھی سعدیہ کے ذہن میں کیسے کیسے خیالات امڈ رہے تھے' آپا رابعہ کو ان کا گمان بھی ہوتا تو شاید ان کی منصوبہ بندی کچھ اور ہوتی۔



"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔" فائزہ نے اپنے سامنے بیٹھے سعد سے رسمی سا جملہ بولتے ہوئے کہا۔ "مجھے ان بچوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے جو اچھے طریقے سے اپنے کیریر میں سیٹل ہو چکے ہوتے ہیں' کیونکہ ایسا ہو جانے کے بعد ان کے پیرنٹس کو سکھ کا سانس لینے کا موقع ملتا ہے۔"

"کیا یہ ہمیشہ اتنے ہی کیلکولیٹڈ الفاظ بولتی ہوں گی۔" سعد نے اپنی پلیٹ میں رکھے چیز بالز میں سے ایک میں کانٹا کھبوتے ہوئے سوچا۔

اسے ایسے لوگوں سے مل کر کبھی بھی بہت زیادہ خوشی نہیں ہوتی تھی جو الفاظ اور لمحوں کی جمع تفریق کرنے کے بعد ایک خاص تناسب کے ساتھ بولنے کے عادی ہوتے تھے۔ اس نے فوراً" فائزہ کو اپنے ایسے ملاقاتیوں کی فہرست میں داخل کر لیا۔

"میرا بیٹا سلمان لاپروا ہے اور غیر مستقل مزاج۔ ایم بی اے کر لینے کے بعد سے اب تک دو سالوں میں وہ چھ جاب بدل چکا ہے صرف اور صرف اپنے غیر پیشہ ورانہ رویے کی وجہ سے۔" ان کے لہجے میں سختی ابھر آئی۔ "اور یہ ماہ نور ہے۔" انہوں نے تنقید کا رخ ماہ نور کی طرف موڑا۔ "میں نے اپنی زندگی میں اتنی لاپروا اور غیر ذمہ دار لڑکی کوئی دوسری نہیں دیکھی۔"

سعد نے نظر اٹھا کر ماہ نور کی طرف دیکھا جو اپنی ماں کی ان باتوں سے بے نیاز ناخنوں پر تازہ تازہ لگائی نیل پالش کو پھونکیں مار مار کر سکھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"اسے ابھی تک یہ ہی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ جو کچھ پڑھ رہی ہے کس لیے پڑھ رہی ہے' اسے پڑھ لینے کے بعد اس نے کرنا کیا ہے۔ ہر دوسرے دن مستقبل سے متعلق اس کے منصوبے بدل جاتے ہیں' کبھی یہ آرٹ کی دنیا میں انقلاب لانے کا منصوبہ بنا رہی ہوتی ہے' کبھی این جی او بنانے اور چلانے کا عزم ہو رہا ہوتا ہے' کبھی اپنے چچا کے ساتھ ایگری کلچر کی فیلڈ میں انقلاب برپا کرنے کے پلان بن رہے ہوتے ہیں تو کبھی کسی خالہ کے پاس ملک سے باہر جا کر کوئی ریسرچ کرنے کا پروگرام بن رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ ان سب منصوبوں کا اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں جو یہ اصل میں پڑھ رہی ہے۔" انہوں نے ایک سخت نگاہ نور پر ڈالی۔ "اس کے ساتھ کی لڑکیاں میں نے

دیکھا ہے' اپنی مصروف روٹین کے باوجود مختلف نجی کمپنیوں کے لیے فری لانسنگ کررہی ہیں' کیوں بھلا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے سعد کو دیکھا۔

"اس لیے کہ وہ اپنی پروفیشنل لائن اور فیوچر کیریر کے بارے میں سیریس ہیں۔" انہوں نے خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا۔ "جبکہ اس کے بارے میں تو سوچ سوچ کر میری عقل جواب دے گئی ہے۔" جس لڑکی کو اتنے سالوں میں یہ پتا نہیں چلا ہو کہ اسے کس موقع پر کون سا ڈریس پہننا چاہیے' اس سے فیوچر پلاننگ میں سنجیدگی کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ ہمارے جیسے پیرنٹس کی فکریں کون سمجھ سکتا ہے، جو اولاد کی بہتری کے لیے بھاگے پھرتے ہیں اور اولاد ہے کہ اپنا کوئی سرا تک نہیں پکڑاتی۔"

انہوں نے افسردگی کے ساتھ سعد کو دیکھا اور اپنا چشمہ اتار کر صاف کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں "اچھا بھئی سعد سلطان! ایک بار پھر کہوں گی' تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ پلیز تکلف مت کرنا' کمفو ٹیبل ہوکر چائے انجوائے کرو' مجھے ایک ضروری کام سے نہ جانا ہوتا تو مزید تمہارے ساتھ بیٹھتی۔"

وہ آہستگی سے سعد کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے نپے تلے الفاظ بولنے کے بعد کمرے سے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد سعد اور ماہ نور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ماہ نور بے اختیار ہنس دی۔

"تم نے دیکھا' میری ممی کتنی ٹائم کانشس ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "کتنے وقت میں انہیں کتنی باتیں کرنی ہیں' انہوں نے پہلے سے سوچا ہوتا ہے۔"

"ہاں' میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا۔" سعد نے سر ہلایا۔ "مگر انہیں تم سے اتنی شکایتیں کیوں ہیں بھئی؟" اس نے شرارت بھرے انداز میں ماہ نور کو دیکھا۔

"دراصل ممی پکی perfectionist (کاملیت پسند) ہیں' وہ اپنے مقرر کردہ معیار سے نیچے ہمارے لیے کچھ سوچ ہی نہیں سکتیں اور ہم سے' بلکہ ہم سے ہی کیا ہر ایک سے' مطلب بابا سے لے کر گھر کے ایک عام ملازم تک سے یہ توقع کرتی ہیں کہ وہ اس perfection کے معیار کو چھوئے جو انہوں نے اپنے ذہن میں سوچی ہوئی ہے۔ کسی کام میں' کسی بات میں کوئی بھی کجی یا کمی انہیں ٹینشن میں ڈال دیتی ہے۔"

"یہ کافی مشکل صورت حال نہیں۔" سعد نے چائے کی پیالی کے سنہری کنارے پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"مشکل!" ماہ نور نے بے بسی سے کہا۔ "بہت ہی مشکل صورت حال ہے۔" "ایک دفعہ ایسی ہی ٹینشن کا شکار ہوکر ممی اسپتال بھی پہنچ چکی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"تو پھر تم لوگ یقیناً" انہیں غیر معمولی سے زیادہ ٹینشن دیتے ہوگے۔" سعد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"نہیں' ایسا نہیں ہے۔" ماہ نور نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی پر تنے دبیز پردوں کی ڈوری کھینچ کر ہٹاتے ہوئے کہا۔ "ہم انہیں خوش' مطمئن اور پرسکون رکھنے کی حتی الوسیع کوشش کرتے ہیں مگر سوچو' ہم انسان ہیں' مشینی کل پرزے تو نہیں جو ہر وقت یک ساں چلتے رہیں۔"

"یہ بھی ہے۔" سعد کے لیے یہ ایک نئی اور انجانی صورت حال تھی۔

"میں ڈیڈی کو اور ڈیڈی مجھے کتنا زچ کرتے ہیں لیکن شکر ہم میں سے کوئی ہاسپٹل نہیں پہنچتا۔" اس نے سوچا اور اپنی سوچ پر خود ہی مسکرا دیا۔

"لو کھاری اور سردار چاچا بھی آگئے۔" ماہ نور کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ لوگ تائی صابرہ کو فائنل شاپنگ کرانے گئے ہوئے تھے' کل یہ لوگ واپس جارہے ہیں' تم ملو گے نا ان سے بھی؟" اس نے سعد کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور۔" وہ چائے کا کپ میز پر رکھ کر بولا۔ "میں یہاں تم سے اور تم سے متعلق لوگوں سے ہی تو ملنے آیا ہوں۔"

اس کی بات کے جواب میں ماہ نور کے چہرے پر جو مسکراہٹ ابھری تھی وہ بہت دل فریب تھی۔ سعد اس مسکراہٹ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔



"تم نے یہ تین اسکیچ بکس جو کلر کی ہیں' ان میں تمہارا ہاتھ مشاقی سے رواں ہوا لگتا ہے۔" سیمی آنٹی نے عینک کے اوپر سے ہاتھ میں پکڑی کلرنگ بک کے صفحے پلٹتے ہوئے ماہرانہ رائے کا اظہار کیا۔

"امپروومنٹ ہے نا؟" سارہ نے بچوں کے سے شوق کے ساتھ سوال کیا۔

"یقیناً ہے۔" سیمی آنٹی نے کلرنگ بک میز پر رکھتے ہوئے چشمہ ناک کی پھننگ سے اوپر کی طرف کھسکایا۔

"دیکھا!" سارہ گھٹنوں کے درمیان ہاتھ دباتے ہوئے مسکرائی۔ "اس سے ثابت ہوا کہ میں اتنی بھی بے کار نہیں ہوئی۔"

"یہ تمہارا اپنا خیال تھا کہ تم بالکل بے کار ہوچکی ہو' کسی دوسرے نے تمہیں ہرگز یہ نہیں کہا تھا۔" سیمی آنٹی نے اسے یاد دلایا۔

"اب یہ تو ہوگیا۔" سارہ نے ایسے ظاہر کیا جیسے اس نے سیمی آنٹی کی بات سنی ہی نہیں اور کلرنگ بکس اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں "اور اس ڈو کو تو میں اتنی شکلوں میں ڈھال چکی کہ اب کوئی اور شکل یاد نہیں آرہی کہ کیا بناؤں؟"

"ہاں۔۔۔ وہ جو ایفل ٹاور تم نے بنایا تھا۔" سیمی آنٹی نے اس کی حوصلہ افزائی کی خاطر کہا اور ایسے سر ہلایا جیسے وہ سارہ کے کام سے شدید متاثر ہوں۔ "وہ تو بھئی کمال تھا۔ میں نے سنبھال کر رکھا ہے' اسے اسی بیس پر جس پر تم نے بنا کر رکھا تھا۔"

"ارے اس پر کیا آپ مجھے کوئی ایوارڈ دیں گی؟" سارہ کو سیمی آنٹی کی تعریف پر خوشی ہوئی۔

"نہیں۔" سیمی آنٹی نے سر ہلایا۔ "جب سعد آئے گا تو میں اسے دکھاؤں گی' وہ بہت خوش ہوگا۔ اور یہ کلرنگ بکس بھی دکھائیں گے اسے۔"

"چھوڑیں۔" سارہ نے ہاتھ بڑھا کر کلرنگ بکس سیمی آنٹی سے لے لیں "رہنے دیں۔"

"ہیں!" سیمی آنٹی سارہ کے اس ردعمل پر ہکا بکا رہ گئیں "لیکن کیوں بھئی؟" انہوں نے سوالیہ انداز میں سارہ کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال نہیں کہ سعد کو میرے ان کاموں میں دلچسپی ہوگی۔" سارہ نے کسی روٹھے ہوئے بچے کی سی آواز میں کہا "آپ نے دیکھا نہیں تھا' پچھلی بار بھی اس نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ زبردستی تعریف کرائی تھی بلکہ زبردستی ہر چیز دکھانی پڑی تھی۔"

"اوہ!" سیمی آنٹی کو دل میں ایک ہلکا سا اطمینان اترتا محسوس ہوا' گویا سعد کو اس سمت کا اندازہ ہوچکا تھا جس پر سارہ کے سلسلے میں اسے چلنا تھا۔"

"ایسا نہیں ہوسکتا۔" انہوں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کوئی بھی کام ایسا نہیں ہوسکتا جسے سعد دیکھنا اور تعریف کرنا نہ چاہے۔"

"ایسا ہوا ہے۔" سارہ نے سنجیدگی سے کہا "ہوا ہے ایسا۔" اس نے اپنی بات دہراتے ہوئے سیمی آنٹی کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو' مان لو میں سچ کہہ رہی ہوں۔

"ہو سکتا ہے۔" سیمی آنٹی نے مزید بحث نہیں کی۔

"لیکن کیا پتا اس کا دل چاہتا ہو کہ اب تم اس کام میں آگے مزید بہتری لاؤ۔" انہوں نے ایک مرتبہ پھر کلرنگ بک کھولتے ہوئے کہا "اور دیکھ لو ہر صفحے کے بعد تمہاری کلرنگ میں فرق آیا ہے اور آخری صفحے تک پہنچ کر یہ خاصی میچور ہو چکی ہے۔" انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا "اس کا مطلب ہے تم نے اس کی بات کو چیلنج سمجھ کر اس کو قبول کیا ہے۔"

"ہوں۔" سارہ کے دل سے ایک انجانا سا بوجھ سیمی آنٹی کی یہ بات سن کر کسی قدر کم ہوا "آپ کو یاد ہے نا پہلے بھی جب کبھی مجھے کوئی چیلنج کرتا تھا کہ نہیں سارہ خان تم یہ کام نہیں کر سکتیں تو پھر وہ کام کر کے دکھانا میرے لیے جینے مرنے کا مسئلہ بن جایا کرتا تھا۔"

"ہاں!" سیمی آنٹی نے سارہ کے ساتھ ماضی کی گلیوں میں اترتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی نے جب تمہیں کہا تھا کہ تم آگ لگی جیکٹ کے ساتھ ٹائر میں سے خود کو نہیں گزار سکتیں۔"

"اور جب خان بابا نے کہا تھا شیری اچانک سرکس چھوڑ کر چلی گئی' کون ہے' جو موت کے کنویں میں شیری کی طرح موٹر سائیکل یا گاڑی چلا کر دکھائے۔" سارہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی نظر کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے سرمئی پہاڑوں پر جیسے ماضی کی فلم کا فیتہ چل رہا تھا اور گزرے وقت کے نقوش ابھر اور مٹ رہے تھے۔

"اور وہ یاد ہے' آپ کو۔" اس نے کچھ یاد آنے پر بلند آواز میں کہا۔ "جب رکو نے مجھے چیلنج کیا کہ اس کی سائیکل چلاتے ہوئے کیلا کھا کر دکھاؤں؟"

"ہاں بالکل یاد ہے' جس کی پریکٹس کرتے ہوئے تم سائیکل سمیت بیس مرتبہ تو گری ہی ہو گی اور کتنے ہی کیلے تمہارے نیچے آکر چپٹے ہوئے تھے۔"

"لیکن دسویں روز جب میں رکو کے لباس میں ملبوس ہو کر سر پر جوکر زہیٹ سجائے ناک پر سرخ ٹینس بال جمائے' چہرے پر ہو بہو اس کے جیسا پینٹ سجائے رنگ میں اتری تھی تو نہ تو میرے پاؤں کی رفتار میں کوئی فرق آیا تھا نہ ہی کیلے کھانے کی رفتار میں ایسی رکاوٹ آئی تھی کہ کسی کو شک ہو سکے یہ رکو نہیں کوئی اور ہے۔ پورا مجمع رکو' رکو کا شور مچا رہا تھا اور میں نے سائیکل چلاتے ہوئے نجانے کتنے ہی ایسے لوگوں سے جا جا کر ہاتھ ملائے تھے جو اس شہر کے چند روزہ سرکس ہی میں رکو سے اتنے مانوس ہو چکے تھے کہ اس کے پرستار بن گئے تھے۔"

"رکو تو جدھر جاتا تھا پرستاروں کا ایک ہجوم اس کے پیچھے رکو رکو کے نعرے لگاتا اس کی حرکات و سکنات کا نظارہ کرتا تھا۔" سیمی آنٹی نے بھی کھوئے کھوئے انداز میں یاد کیا۔

"جوکرز تو سرکس کا حصہ ہوتے ہیں' مگر رکو جیسا مسخرہ کسی' کسی سرکس میں ہی ہوتا ہو گا' وہ معمول سے ہٹ کر حرکتیں کرتا تھا تو تلی Unusual بالکل معمول سے ہٹ کر' ہے نا۔" انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں!" سارہ نے کچھ دیر تک پہاڑ پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد لمبا سانس لیتے ہوئے سیمی آنٹی کی طرف دیکھا۔ "رکو خوش قسمت ہے سیمی آنٹی! ابھی تک بلیو ہیون سرکس سے جڑا ہو گا۔ ایک کے بعد ایک شہر گھومتا وہ تو اب تک پورا پاکستان دیکھ چکا ہو گا۔" اس کے لہجے میں ایک نامحسوس سا دکھ اور اداسی ابھرنے لگی تھی۔

"شہر در شہر پھرتا بلیو ہیون سرکس اگر کبھی پہاڑوں کے دامن میں سمٹے اس چھوٹے سے علاقے میں بھی آ نکلے تو..... تو کیا ہو گا سارہ؟" سیمی آنٹی اپنی عمر اور تجربے کی حقیقت کو فراموش کرتے ہوئے بولیں۔

"تو کا تو کوئی سوال ہی نہیں سیمی آنٹی۔" سارہ کے لہجے میں اداسی آ گئی "بلیو ہیون سرکس کی انتظامیہ کم آبادی والے علاقوں کا رخ نہیں کرتی۔ آپ بھول گئیں کیا؟"

"ارے ہاں!" سیمی آنٹی نے چشمہ اتار کر اپنی نم آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"ایک بات پوچھوں سارہ؟" چشمہ دوبارہ آنکھوں پر لگاتے ہوئے انہوں نے سارہ کی طرف دیکھا۔

"تم کو رکو سے شدید محبت تھی نا!" انہوں نے سارہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اور اس کو تم سے شدید محبت تھی؟" انہوں نے سر ہلاتے ہوئے جیسے خود ہی اپنی بات کی تائید کی۔

"صرف خان کے ڈر سے تم لوگ اس محبت کا اظہار نہیں کرتے تھے۔"

"آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟" سارہ نے سرد لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے اس وقت بھی یہ خیال آتا تھا جب ہم دونوں بلیو ہیون کا حصہ تھے اور مجھے وہ راتیں بھی یاد ہیں جب تم نیند میں یا پھر مسکن دواؤں کے زیر اثر سوتے ہوئے رکو کو پکارتی تھیں اور اسے پکارتے ہوئے زار زار رویا کرتی تھیں۔" سیمی آنٹی کے لہجے میں اپنی بات پر اعتماد شامل تھا "سرکس سے متعلق تم نے کبھی کسی اور کو تو نیند میں بلایا نہ جاگتے میں یاد کیا' خان سے زیادہ تم کس کے قریب رہیں اور تتلی سے زیادہ تمہاری کس سے دوستی تھی' ماسٹر مجو جو تمہیں ٹریننگ دیتا تھا اور مس نینا جو تمہارے بال سنوارتی اور میک اپ کرتی تھی۔ تم نے وہاں سے آکر بھولے سے کسی کو یاد نہیں کیا۔ صرف رکو ہی کیوں؟ بھلا رکو ہی کیوں؟" سیمی آنٹی نے بات کے آخر میں دو دفعہ اپنا سوال دہرایا اور سامنے دیکھنے لگیں۔

"جو محبت ہوتی ہے سیمی آنٹی!" کچھ توقف کے بعد سیمی کے کانوں کو ہوا کے ساتھ سرسراتی سارہ کی آواز سنائی دی۔

"اس کی ٹانگیں اور بازو کسی حادثے کے نتیجے میں ٹوٹ نہیں جاتے' محبت کی رگوں میں دوڑتا جذبات کا خون' انسان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بعد نکلنے والے خون کی طرح بہہ کر نچڑ نہیں جایا کرتا۔ محبت گونگی نہیں ہوتی' وہ کچھ کہے بغیر بھی اپنے ہونے کا احساس دلا دیتی ہے' محبت بہری بھی نہیں ہوتی کہ محبوب کی پکار' اس کی فریاد' اس کی آنکھوں میں اتری اذیت کی زبان نہ سن سکے۔" سیمی آنٹی نے چونک کر سارہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" سارہ نے سر ہلایا۔ "محبت میں اتنی گرم جوشی' اتنی بے ساختگی' اتنا احساس' اتنا خیال ہوتا ہے کہ اس کا زبان سے لفظوں میں اظہار نہ بھی کیا جائے تو بھی وہ دل کو اپنے احاطے میں لیے رکھتی ہے' محبت کی بتی محبوب کے دماغ میں ہر وقت جلتی رہتی ہے کیونکہ اس کی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ سورج اس کے سامنے چراغ بن جاتا ہے۔ محبت کی ایک پکار محبت کرنے والے کے لیے کافی ہوتی ہے' جس کا پیچھا کرتے وہ فوراً محبوب تک پہنچ جاتا ہے جیسے..... جیسے" سارہ جوش جذبات میں بولتے بولتے اچانک رک گئی۔

"جیسے!" سیمی آنٹی نے سامنے سے پڑتی سورج کی شعاعوں کو اپنی آنکھوں تک آنے سے روکنے کے لیے ہاتھ کا چھجا بنا کر ماتھے پر رکھتے ہوئے اس کے تکلے سے سارہ کو دیکھا۔

"جیسے سعد کی محبت۔ جو میری ہر پکار سن لیتی ہے' جو میری ہر رمز کو جان لیتی ہے' جو میرا ہر اشارہ سمجھ لیتی ہے۔"

سارہ کے الفاظ تھے یا طاقتور کرنٹ جو سیمی آنٹی کی سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔ انہوں نے بے یقینی سے سارہ کی طرف دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"واہ بھئی برخوردار! تمہیں تو ہمارے علاقے کی گلی گلی اور محلّے محلّے کا پتا ہے۔" ماہ نور کے چچا سردار کو سعد سلطان سے مل کر حقیقی خوشی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں اسے دیکھنے اور ماہ نور کے اس سے تعارف کروانے پر وہ اسے ان پڑھے لکھے امیر کبیر گھرانوں کا ویسا ہی لڑکا سمجھے تھے جو اکثر لوگوں سے میل ملاقاتوں کے دوران نظر آتے رہتے تھے' لیکن اس لڑکے سے گفتگو کرنے کے بعد انہیں محسوس ہوا تھا کہ وہ ان عام لڑکوں سے ذرا مختلف تھا۔ اس

سے اپنے گاؤں اور اردگرد کے علاقوں کا تذکرہ سن کر وہ چونکے تھے اور یہ جان کر اور بھی حیران ہوئے تھے کہ اس کا اپنا ان علاقوں سے کوئی تعلق نہیں تھا' وہ ویسے ہی ان سے واقف تھا۔

"میں نے عموماً" دیکھا ہے کہ آج کل کے لڑکوں کو دیہاتوں اور ان کے کلچر میں ایسی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوتی۔" انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن مجھے ایسے علاقوں کے گلی' محلوں' چوپالوں اور دکانوں میں بہت کچھ ایسا ملتا ہے جن سے میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔" اس لڑکے نے کہا۔

"مجھے جب کبھی بھی ایسی جگہوں پر جانے کا موقع ملا میں بہت کچھ سیکھ کر وہاں سے آیا۔"

"ہاں ایک ٹولہ آج کل کے نوجوانوں کا ایسا بھی ہے جو ثقافت' ثقافتی حسن' ہنرمندیوں' دستکاریوں کا چرچا کرنے اور ان کے ذریعے خود اپنی پروموشن کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔" چوہدری صاحب کو یاد آیا۔ "تم ایسے کسی ٹولے کے ممبر تو نہیں ہو؟" انہوں نے شک کی نظر سعد پر ڈالی۔

"میں ایک فرد واحد ہوں انکل! میرا کسی ٹولے یا گروپ سے کوئی تعلق نہیں' میرے کسی جاننے والے کو ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں' اس لیے میں اکیلا ہی ان جگہوں میں گھومتا پھرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ اپنی ماہ نور کو بھی بڑا شوق ہے ایسی باتوں کا۔" تائی صابرہ جو اب تک خاموش بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھیں زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔ "پچھلے سال کافی دن ہمارے پاس رہی تھی' اسے گاؤں بڑا پسند آیا تھا' ہر گاؤں سے زیادہ تو اس کو باندر والے کا تماشا دیکھنے کا شوق تھا' روز بچے دوڑاتی تھی۔ جاؤ جا کر دیکھ کر آؤ' باندر والا آیا کہ نہیں' وہ کم بخت بھی ایک دفعہ آ کر کہیں غروند ہی گیا (غائب ہی ہو گیا)۔ پھر چوہدری صاحب نے پیسے دانے دے کر خاص طور پر بلایا باندر والے کو' پھر بھلا کیا ہوا تھا۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے چوہدری صاحب کی طرف دیکھا اور ادھر سے جواب نہ پا کر سعد کی طرف دیکھنے لگیں۔

"پتا نہیں وہ باندر والا کوئی اور تھا یا اس کی باندر' باندری کوئی اور تھی۔ ماہ نور کا تو موڈ ہی نہیں ٹھیک ہوا بڑے دن' فیر بابے منگو کا میلہ بھی اسے پسند نہ آیا' غصے کے مارے اسی دن سامان باندھ کر واپس اپنے گھر۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا' تائی صابرہ کی بات سنتے ہوئے سعد کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی' اس نے ماہ نور کو دیکھا جو خجل ہوتے ہوئے تائی صابرہ کو گھور رہی تھی۔

"واہ بھئی ماہ نور! ثابت ہوا کہ تم کوئی بات دل میں رکھنا چاہو بھی تو نہیں رکھ سکتیں۔" اس روز ماہ نور کے گھر کافی وقت گزارنے کے بعد جب وہ واپس جانے کے لیے نکلا' اس نے گھر کے گیٹ کے قریب کھڑے ہو کر ماہ نور سے کہا۔

"ہاں شاید۔" ماہ نور نے سادگی سے اعتراف کیا۔ "میں بوکھلاہٹ اور دباؤ میں کئی ایسی حرکتیں کر جاتی ہوں جو نہیں کرنی چاہئیں۔"

"شاید اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ تم بہت پیور ہو' تم میں بالکل فریب نہیں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ آج ہم اچھے دوست ہیں۔" اس نے کہا۔

"دوست!" ماہ نور کا ذہن اس ایک لفظ پر اٹک گیا۔ "کیا یہ تعلق صرف دوستی کا ہے؟" اس نے سوچا' وہ شاید اس سوچ کو الفاظ میں ڈھال کر سعد کے گوش گزار بھی کر دیتی جو یقیناً" بعد میں اس کو اپنی عجلت پسندی اور حماقت محسوس ہوتی لیکن اس سے پہلے کہ وہ یہ کام کرتی' چوکیدار کے کمرے سے کھاری نے اچانک باہر نکل کر اسے اس حماقت سے بچا لیا۔

"ارے کھاری!" وہ بے اختیار مسکرا دی۔ "مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ تمہیں کھاری سے بھی ملوانا تھا۔" اس

نے سعد سے کہا۔

"کھاری! ان سے ملو' یہ سعد سلطان ہیں۔" اس نے کھاری کی طرف دیکھا۔ کھاری نے سعد کی طرف دیکھا اور ہاتھ ماتھے تک لے جاتے ہوئے اسے سلام کیا۔

"اچھا تو تم کھاری ہو۔" سعد نے مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ کھاری نے ایک نظر سعد کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ڈالی اور دوسری ماہ نور پر' اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ ماہ نور نے سر کو ہلکا سا ہلایا۔ کھاری نے سعد کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

"کیوں بھئی کھاری! باندر لولا لنگڑا تھا یا باندری اور ان دونوں میں سے کانا کون تھا بھلا؟" سعد نے گرم جوشی سے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

کھاری نے ایک بار پھر چونک کر ماہ نور کو دیکھا۔ وہ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"سعد نے بھی بندر' بندریا کے اس جوڑے کو دیکھا ہوا ہے کھاری!" ماہ نور نے اس کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔

کھاری نے ایک نظر سعد پر ڈالی اور نظریں جھکا کر بولا۔ "صحیح طرح یاد نئیں باؤ جی!"

"چلو کوئی بات نہیں' یہ بتاؤ کیسے ہو۔" سعد کے انداز میں بے تکلفی تھی۔

"ٹھیک ٹھاک۔" کھاری نے اپنے جوتے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔

"سعد بابے منگو کے میلے والے سائیں سے بھی مل چکا ہے کھاری۔" ماہ نور نے کھاری کو مزید بوکھلانے کے لیے شرارتاً" کہا۔

کھاری نے ایک دفعہ پھر نظر اٹھا کر سعد کو دیکھا۔ "سمجھ آگئی مہ نور بی بی!" اس نے نیچی آواز میں جواب دیا۔ کھاری کی یہ بات ماہ نور نے بے دھیانی سے سنی اور سعد نے سننے کے بعد کھاری کو غور سے دیکھا۔

"ٹھیک ہے ماہ نور! پھر ملیں گے' اب میں چلتا ہوں۔" اگلے لمحے وہ ماہ نور سے مخاطب ہوا۔

"اچھا بھئی کھاری!" اس نے کھاری کا بازو تھپتھپایا۔ "تم سے مل کر اچھا لگا۔ تمہارے علاقے میں پھر آنا ہوا تو تم سے ملاقات ہو گی۔"

"ارے ہاں کھاری۔" ماہ نور مسکراتے ہوئے بولی۔ "سردار چاچا نے سعد کو فارم ہاؤس پر انوائٹ کیا ہے۔ سعد کو گاؤں کے لوگوں پر کچھ ریسرچ کرنی ہے نا تو سردار چاچا نے کہا ہے' وہ فارم ہاؤس کا مہمان بن کر جب تک چاہے ان کے پاس رہے۔ اب جب سعد وہاں جائے گا تو پتا چلے گا تم کتنے اچھے میزبان ہو۔" وہ خوش ہو کر بتا رہی تھی۔

ماہ نور کی توقع کے خلاف کھاری نے اپنی جون میں آ کر بے تحاشا بولنے کے بجائے سر ہلا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے جی!"

ماہ نور نے ایک مسکراتی نظر کھاری پر ڈالی اور پھر سعد کو دیکھ کر شانے اچکا دیے۔

"Perhaps he is a bit down today" (شاید آج اس کا موڈ اچھا نہیں ہے) اس نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" سعد نے سر ہلایا اور ہاتھ ہلا کر گیٹ سے باہر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔

"کیا بات ہے کھاری! ٹھیک تو ہو تم۔" سعد کے جانے کے بعد ماہ نور نے کھاری کی طرف دیکھا۔

"تساں ان باؤ صاب سے کہنا تھا مہ نور بی بی! ان سے پچھنا (پوچھنا) تھا اینہاں کو سائیں جی کا گیت آوندا کہ نئیں (ان کو سائیں جی کا گیت آتا ہے کہ نہیں)۔" کھاری نے اچانک کہا۔

"پتا نہیں۔" ماہ نور' کھاری کی اس بات پر بوکھلا کر بولی۔

"پچھنا (پوچھنا) تھا ناں جی' آوندا (آتا) ہو گا ضرور۔" کھاری نے کہا اور اپنے کندھے پر رکھی چادر جھاڑ کر اسے

اپنے اردگرد لپیٹتا سرونٹ کوارٹرز کی طرف چل دیا۔



سعدیہ پر چھائی گہری خاموشی اور اپنی بات کے جواب میں کسی خاص ردعمل کے نہ آنے پر آپا رابعہ کو دل ہی دل میں تشویش تھی۔ سعدیہ نے اپنے باقی دو پرچے سکون سے دیے تھے اور پرچوں کے بعد دوبارہ اسکول جانے سے پہلے ایک ہفتے کی چھٹیاں دی گئی تھیں۔ پرچوں سے فارغ ہونے کے بعد سعدیہ نے گھر کے کل دو کمروں، جن میں سے ایک میں وہ لوگ سوتے بیٹھتے تھے اور دوسرے میں ضرورت کا سامان رکھا تھا کی تفصیلی صفائی کی تھی۔ جھاڑ پونچھ، فالتو چیزوں کو نکال باہر کرنے اور فرشوں کی دھلائی کا کام دو دن میں مکمل ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے چھوٹے سے چھپر کے نیچے اینٹوں کی دیواروں سے بنے اس ننھے سے باورچی خانے کی راہ لی تھی جو بارش اور تیز دھوپ کی تپش کے دنوں میں کھانا پکانے کے کام آتا تھا، ورنہ تو سارا سال صحن میں گڑے مٹی کے چولہے پر ہی کھانا بنایا جاتا تھا۔

"جو ٹوٹا پھوٹا سامان اور کاٹھ کباڑ میں نے سیڑھیوں کے نیچے جمع کیا ہے، اسے بڑی سڑک والے کباڑ خانے میں بیچ کر پیسے مجھے لا دو۔" آپا رابعہ نے سنا، سعدیہ مسجد میں حفظ کے لیے آنے والے حفیظ سے کہہ رہی تھی۔

"بوتلیں الگ کرکے رکھنی تھیں نا سعدیہ باجی!" حفیظ جواب میں سیڑھیوں کے نیچے جھکا سامان کا جائزہ لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بس جو ہے لے جاؤ اور جتنے پیسے ملیں۔ ایمان داری سے لاکر دے دینا، کھا مت لینا۔" سعدیہ اسے تاکید کر رہی تھی۔

"اور ہاں نائلون کے برتن بیچنے والا آئے تو مجھے بتانا۔" کاٹھ کباڑ لے کر جاتے ہوئے حفیظ کو اس نے پیچھے سے پکار کر کہا تھا۔

"بدھ کے بدھ وار آتا ہے وہ۔" حفیظ نے گردن موڑ کر جواب دیا تھا۔

"پھر بھاگ کے جاؤ اور یہ چیزیں بیچ کر آؤ، آج بدھ ہے۔" سعدیہ نے تیزی سے کہا اور صحن کی طرف مڑی۔

"کیا کرنے ہیں پیسے، اور کیوں بلا رہی ہو پھیری والے کو؟" اس کے سامنے آپا رابعہ کھڑی تھیں۔

"جو مسالے چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں پڑے ادھر ادھر رلتے رہتے ہیں، انہیں محفوظ کرکے رکھنے کے لیے دو تین ڈبے خریدنے ہیں اور بس۔" سعدیہ نے نرمی سے جواب دیا تھا۔ "ان چیزوں سے دو، تین ڈبے خریدنے کے پیسے ہی مل جائیں، بڑی بات ہے۔" وہ ننھے سے باورچی خانے میں گھس کر بولی۔

"ابھی تک ایسے چل ہی رہا ہے نا!" آپا رابعہ اس کے پیچھے آئیں۔

"ہر بات پر اعتراض نہ کیا کریں اماں!" سعدیہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "میرے دل میں مزید سوال اٹھنے لگیں گے۔ یہ۔" اس نے نمک، مرچ اور ہلدی کی چھوٹی چھوٹی تھیلیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "انہیں یوں رکھے دیکھ کر خیال آتا ہے یقیناً "ہمارا تعلق خانہ بدوشوں کے خاندان سے ہے، جو مستقل ٹھکانے بنا کر رہتے ہیں نہ مستقل گھرداری کا سامان اپنے پاس رکھتے ہیں، بدسلیقگی اور پھوہڑپن کا پورا اشتہار ہے یہ باورچی خانہ۔"

آپا رابعہ کو لگا جیسے کسی نے ان کے چہرے پر سامنے سے گھونسا مارا ہو۔

"توکل اور غناء، سادگی اور فقر کی دولت جس کے ہاتھ آجائے وہ دنیا کی پریشانیوں اور غموں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، اسے شکر کی اور صبر کی دولت عطا ہو جاتی ہے۔ وہ سامان دنیا کے ـــ جھنجھٹوں سے آزاد رہتا ہے اسے سامان آخرت کی فکر آگھیرتی ہے اور وہ اس کے اسباب ڈھونڈنے لگتا ہے۔" انہیں کسی کی آواز سنائی دی۔

"توکل اور غناء، سادگی اور فقر۔" انہوں نے دل میں دہرایا۔

"بدسلیقگی اور پھوہڑپن۔" انہوں نے الفاظ کا تجزیہ کیا۔

"دنیا اور آخرت۔" وہ جانے نہ پانے، فکر اور بے فکری، ہونے اور نہ ہونے کی کشمکش میں پڑنے لگیں۔

"آپ کے پاس میرے کسی سوال کا جواب نہیں ہے اماں!" سعدیہ نے ان کے چہرے پر چھائے اضطراب کو دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولی۔ "بہتر ہے کہ مجھے وہ کرنے دیں جو میں چاہتی ہوں، ورنہ میرے سوالوں اور ان کے جواب میں آپ کی خاموشی یا پھر ہار جیت کا سلسلہ دراز ہو جائے گا۔"

آپا رابعہ سعدیہ کی بات کے جواب میں خاموش رہیں اور اسی خاموشی کے ساتھ باورچی خانے سے نکل کر صحن میں آگئیں۔ صحن میں دھوپ نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ انہوں نے مٹی سے لیپے پتے صاف ستھرے صحن کو دیکھا اور بے بسی سے دائیں بائیں سر گھمایا۔ کیا اس خالی صحن میں کہیں کوئی ایسی قینچی دستیاب تھی جس کے ذریعے وہ سعدیہ کے نئے نئے نکلتے پر قینچ کر سکتیں۔ اسی دم ان کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس دستک نے جیسے اپنا ہاتھ بڑھا کر وہ قینچی ان کے ہاتھ میں پکڑا دی تھی۔



"غضب خدا کا، سنا ہے مسجد کے ساتھ والی پرچون کی دکان میں جوا کھیلا جاتا ہے۔"

"کون سی دکان؟"

"ارے وہی تنگ تاریک پرچون کی دکان، جس میں دن کے وقت بھی کالی رات جیسا اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ سودا لینے جاؤ تو دکان والا لالٹین ہاتھ میں پکڑ کر ڈبوں میں جھانک جھانک کر سودا نکالتا ہے اور تولنے کے وقت لالٹین گاہک کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے لو جی ذرا اونچی کرکے پکڑنا میں ذرا سودا تول لوں۔"

"تو ایسی اندھیری دکان میں جوا کھیلنے والوں کی آنکھیں نہیں جاتیں یا وہ پہلے ہی آنکھوں سے پٹ ہیں۔"

"جواری تو بصارت کی دولت سے مالا مال بھی اندھوں موافق ہوتا ہے۔"

"واہ بھئی۔ تمہیں پتے کی یہ بات کس نے بتائی؟"

"تم ہمیشہ ایسی باتوں پر مجھے شرمندہ کرتی ہو۔ کیا دین اسلام کی باتیں ضرور میں کسی سے سیکھنے ہی جاؤں تو مجھے پتا چلے گا، پیدائشی مسلمان ہوں میں، گاؤں کے مراثیوں کے سرپنچ، گامے میراثی نے اذان دی تھی میرے کان میں۔"

"واہ واہ یقیناً "خاصا سریلا ہوگا گاما میراثی!"

"میراثی سارے سریلے ہوتے ہیں وہ تو بھانڈ ہوتے ہیں جو بیٹھے گلوں اور بے سری آواز میں گاتے ہیں۔"

"اچھا جی، مجھے تو علم نہیں تھا کہ بھانڈ اور میراثی دو الگ الگ Species (اقسام) ہیں۔"

"توبہ توبہ بھانڈ تو مسخرا ہوتا ہے، نقلچی، جھوٹی تعریفیں کرنے والا بھانڈ ہوتا ہے لوگ کہتے ہیں گاتا ہے۔"

"کانوں کو ہاتھ ایسے لگا رہی ہو جیسے کوئی گناہ کی بات کہہ دی میں نے۔" "کانوں کو ہاتھ نہ لگاؤں تو اور کیا کروں، میراثی کی شان میں گستاخی کردی تم نے۔"

"ہیں واقعی؟"

"ہاں تو اور کیا، میراثی کی تو شان یہ ہے کہ بڑے بڑے عزت دار اس کے پاس اپنے شجرے رکھواتے ہیں۔"

"جب ہی تو وہ میراثی جب کسی کی عزت اتارنے پر آتا ہے تو اس کے آباؤ اجداد کی شان میں ایسے ایسے قصیدے پڑھتا ہے کہ سننے والے کو جگہ نہیں ملتی سر چھپانے کو۔۔۔۔"

"بس تو پھر سمجھ لو میراثی کی شان کیا ہے' اس کی زبان کھل جانے کے ڈر سے بڑے بڑے اس کے سامنے اپنی دستار جھکا دیتے ہیں۔"

"اچھا تو پھر اگر بھانڈ ہی لوگوں کی جھوٹی تعریفیں کرتا ہے تو تم میراثن ہو کر کیوں ایسا کرتی ہو۔"

"میں نے کب کسی کی جھوٹی تعریف کی؟"

"روز کرتی ہو' اس روز اسلام آباد والے کو کیا کہہ رہی تھیں۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"کہ نیلی جرسی اور کالی پتلون میں وہ وحید مراد لگ رہا تھا۔"

"کیا نہیں لگ رہا تھا' گلے میں سرخ ڈبی دار مفلر ڈالے سالگرہ والا وحید مراد لگ رہا تھا کہ نہیں لگ رہا تھا؟"

"توبہ' مبالغہ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"

"اور اس سیٹھ حسین ہوٹل والے کو کہتی ہو' صدقے جاؤں آپ کی قسمت کے' واری جاؤں آپ کے بھاگوں کے' جو رفیق آتا ہے چوہدری کے ساتھ تو دونوں کو شانوں والی جوڑی اور موتیوں والی سرکار کے لقب کون دیتا ہے؟"

"آئے ہائے پھر یہ تو کہنا ہی پڑتا ہے' ایسی تعریفوں سے ذرا خمیر لگ جاتا ہے ان لوگوں کو' جیب ہلکی کرتے ہوئے بھار نہیں محسوس کرتے۔"

"مجھے تو لگتا ہے کہ اگر واقعی بھانڈ اور میراثی الگ الگ species ہیں تو پھر تم دونوں کی مکسڈ بریڈ سے تعلق رکھتی ہو۔"

"اچھا چلو جو بھی ہوں' انسان تو سمجھتی ہو نا مجھے۔"

"ہاہاہا' مکسڈ بریڈ' سمجھ میں آئی نہیں بات' انسان ہونے کا پوچھنے لگیں۔"

"ایک تو جب تم پڑھے لکھوں والی باتوں پر اتر آتی ہو تو میرا دل چاہتا ہے میں اپنے کانوں کے بٹن بند کر دوں۔"

"اور تمہارے ساتھ رہ رہ کر مجھے کبھی کبھی ایسے لگتا ہے' مجھ میں بھی لوگوں کی جھوٹی تعریفیں کرنے کے جراثیم منتقل ہوتے جا رہے ہیں۔"

"چلو اچھی بات ہے' کامیاب انسان میں ان جراثیم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ویسے ایک بات ہے۔"

"کیا۔"

"اسلام آباد والے کے ذکر پر تمہارے چہرے پر پھلجڑیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ ہیں نا؟"

"چلو چلو' بکواس نہ کرو' اس میں کون سی ایسی خاص بات ہے' جو میرا چہرہ اس کے نام پر گلنار ہو گا۔"

"وہ عاشق خاص ہے تمہارا' چاکلیٹی ہیرو' وحید مراد' وہی تو ہے' جو دل سے تمہاری قدر کرتا ہے اور تمہارے چھوٹے چھوٹے معاملات کے متعلق بھی فکرمند رہتا ہے۔"

"پتا نہیں۔"

"تمہیں نہیں پتا میری مٹروالی شہزادی تو کسے پتا ہے کہ جب مٹر کی چبھن محسوس ہونے پر نیند نہیں آتی' تو خوابوں کی پنکھیاں کون جھلاتا ہے تمہیں۔"

"اچھا چلو زیادہ باتیں نہ بناؤ' اندھیری پرچون کی دکان میں جوئے کا قصہ سناؤ۔"

"قیامت آنے والی ہے' مجھے لگتا ہے' اوپر مسجد کے سنہری مینار سر اٹھائے کھڑے ہیں' سبز گنبد دور سے اپنی چھب دکھلاتا ہے' جس کے اسپیکر سے پانچ بار اللہ کے پیاروں کو نماز کے لیے جمع ہو جانے کا بلاوا ملتا ہے اور نیچے اندھیری دکان میں خدا کی مار پڑے' پھٹکارے' جواری جوا کھیلتے ہیں۔ سنا ہے سینکڑوں کا نہیں ہزاروں کا جوا کھیلا جاتا ہے روز وہاں... اور ان جواریوں کو پولیس سے کون بچاتا ہے بھلا۔"

"کون؟"

"طیفا لاٹر اور کون۔"

"وہ جو بانو کے گھر مہینے کا راشن بھجتا ہے؟"

"ہاں وہی ہے' جو پرچون کی دکان پر چھاپہ پڑنے دیتا ہے نہ تالاب والی گلی میں شراب کی بھٹی بند ہونے دیتا ہے۔"

"وہی ہے نا جو ہمارے گھر سے ہر رات کو اٹھتی ساز و آواز کی صدا پر ناک بھوں چڑھانے والے محلے داروں کو چوں بھی نہیں کرنے دیتا؟"

"ہاں وہی۔"

"اب آواز کیوں پست ہو گئی تمہاری؟ یاد آیا کہ نہیں ہمارے رزق روٹی کے وسیلے کو سایہ دینے والا بھی طیفا لاٹر ہی ہے۔"

"نہیں بھولی نہیں' کبھی' مگر اس گھر میں' میں' ہم' طیفا لاٹر کیا سارا محلہ جانتا ہے' قمار باز اور زانی شرابی نہیں اچھی آواز کے شوقین آتے ہیں' یہاں لچوں لفنگوں کی نہیں' غزل اور گیت کے شائقوں کی محفل جمتی ہے' شعر سنائے جاتے ہیں اور ادب و تاریخ پر بحث ہوتی ہے۔ یہ کسی رنڈی کا ڈیرا نہیں' سروں کی ملکہ کا ٹھکانہ ہے' اسی لیے طیفا لاٹر اس طرف کسی کو آنکھ اٹھانے نہیں دیتا۔"

"دل کو بہلانے کے لیے ہر کوئی اپنے لیے دلیلیں ڈھونڈ لیتا ہے میری عزیز از جان سہیلی! "یہ طوائف کا ڈیرا ہے یا سُر کی محفل کا ٹھکانہ' دونوں برابر ہیں۔"

"گناہ تو ہونے ہیں' ہوتے ہی رہنے ہیں' ابلیس نے یونہی تو اللہ سے مہلت نہیں مانگی تھی پر مسجد کے نیچے جوا' یہ تو بہت بری بات ہے نا۔"

"مسجد کے زیر سایہ خرابات کا منظر ہے۔"

"کس کا منظر ہے؟"

"رہنے دو' تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

"چلو نہ بتاؤ۔ میں اسلام آباد والے سے پوچھ لوں گی کہ مسجد کے زیر سایہ کون سا منظر ہوتا ہے۔"

"وہ بے چارہ دو جمع دو چار کرنے والا' تمہیں ان شاعرانہ تعلیوں کا مطلب کیا سمجھا پائے گا۔"

"کیوں نہیں سمجھا پائے گا' وہی تو ہے' جو تم سے میر' درد' ناسخ اور آتش کی غزلوں کی فرمائشیں کرتا ہے۔ باقی لکیر کے فقیروں کی طوطی تو غالب سے شروع ہو کر غالب پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ غالب نہ ہوا غالبا" ہو گیا' جو سب سے اچھی شاعری کرتا تھا۔"

"واہ دیکھ لو' تمہیں پڑھوں لکھوں کی محفل میں بیٹھ کر کیسی ٹھکانے کی گفتگو کرنی آ گئی۔"

"پھر بھی میراثن ہونے کا طعنہ دینے سے باز نہیں آئیں۔"

"میراثن کی تو شان ہی اور ہے' بڑے بڑوں کے تجربوں کی امین میراثن۔"

"ہاہاہا۔"



"آپ کی دوست فلزا ظہور سے ملاقات کے بعد آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا مجھے' کیونکہ ماہ نور نے بتایا تھا۔ وہ

فلزا ظہور کو آپ کے توسط سے جانتی ہے۔"

"یہ سمجھا ہوگا کہ آپ بھی فلزا ظہور کی طرح انتہائی مردم بے زار اور کھڑوس خواتین ہوں گی۔" ماہ نور نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھا تم نے فاطمہ اور خدیجہ خالہ کتنی سویٹ ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ مسکرایا۔

"وہ بے چاری بھی ایسی تو نہیں ہوا کرتی تھی جیسی تم لوگ بتا رہے ہو۔" خدیجہ نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نجانے اتنے سالوں میں اس پر کیا گزری بے چاری جو وہ ایسی ہوگئی۔"

"وہ کیا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں؟" سعد نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے، کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد، ان کے بعد کسی بھائی بہن کے نہ ہونے کی وجہ سے خاندانی تعلقات کی عدم موجودگی میں تنہائی کا شکار ہو جاتی ہے۔"

"ارے اس کا تو خاصا بھرا پرا خاندان تھا۔ اس کا باپ جی سی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر تھا، دادا ایچی سن میں پڑھاتا تھا، ایک چچا کیمبرج سے گریجویشن کر کے آیا تھا اور اس کا نانا پاکستانی سفارت کار تھا، اس کے خاندان کی اگلی نسلیں تو یہاں وہاں ہر جگہ کے ۔۔۔ اہم عہدوں پر کام کر رہی ہوں گی، وہ تنہا کیسے ہو سکتی ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

"لیکن شاید تمہیں یاد نہیں فاطمہ! فلزا کے اکلوتے بھائی اکبر نے خودکشی کرلی تھی زمانہ طالب علمی میں ہی۔"

"وہ اسٹوڈنٹ لیڈر تھا، اس پر نجانے کہاں کہاں سے دباؤ پڑا، کس کس بات کے لیے، اس کی خودکشی کا ایک پس منظر تھا۔ فلزا کی تنہائی کا کوئی پس منظر نہیں بنتا۔"

"ہر خاتون آپ کی طرح نہیں ہوتی فاطمہ، خدیجہ خالہ! اکثر خواتین شادی نہ ہونے کو ایک مس ہیپ (سانحہ) سمجھنے لگتی ہیں اور پھر باقی عمر اسی محرومی کے شیڈوز (سایوں) تلے گزار دیتی ہیں، کڑھتی، جلتی، بھنتی۔" ماہ نور نے خیال ظاہر کیا اور جھر جھری لی۔ "اف جیسے وہ فلزا ظہور تھیں، میرے اللہ مجھے ایسے لگ رہا تھا، میں منکر نکیر کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی جب میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔"

"اگر ماہ نور کی یہ منطق مان لی جائے تو کیا یہ حقیقت ہے کہ فلزا ظہور نے شادی نہیں کی تھی؟" یہ سوال پوچھتے ہوئے نجانے کیوں سعد کو اپنا دل معمول سے زیادہ تیز رفتار سے دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔

"آخری خبریں، جو اس کے بارے میں، ہم تک پہنچی تھیں، ان کے مطابق تو نہیں کی تھی۔" خدیجہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے۔" سعد کے لہجے میں عجیب سا اضطرار تھا۔

"غالباً"! خدیجہ نے گردن پیچھے کر کے نگاہیں چھت سے لگاتے ہوئے کہا۔ "آج سے بیس اکیس سال پہلے کی۔"

"اوہ۔" سعد نے جیسے خود سے کوئی بات کی۔ "ہو سکتا ہے کوئی خفیہ شادی کر رکھی ہو۔"

"خفیہ کیوں کرنی تھی اس نے، اس کا خاندان پڑھا لکھا اور روشن خیال تھا، اس نے کس سے اپنی شادی چھپانی تھی۔" خدیجہ نے سعد کے خیال کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔

"سن اٹھاسی میں وہ لندن چلی گئی تھی اور یہ ہی اس کے بارے میں آخری اطلاع ملی تھی۔" فاطمہ نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "کئی سال بعد میں نے ایک میگزین میں فن مصوری کے بارے میں ایک مضمون میں اس کا سرسری تذکرہ پڑھا جس میں اس کا تعلق اسلام آباد سے ظاہر کیا گیا تھا جب ہی تو ماہ نور سے میں نے کہا کہ پتا کرنا بھلا وہ اسلام آباد میں ہی رہتی ہے کہ واپس چلی گئی۔"

"ہوں۔" سعد فلزا ظہور سے متعلق خدیجہ اور فاطمہ کی ایک ایک بات غور سے سن رہا تھا۔ "وہ قلندرانہ

مزاج رکھتی ہیں غالباً۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ان کا کام بہت اعلا ہے مگر انہیں شہرت میں کوئی دلچسپی نہیں' اسی لیے جب ماہ نور کے کہنے پر میں نے ان کا پتا لگانے کی کوشش کی تو یہ جان کر حیرت ہوئی' آرٹ کے بڑے بڑے قدر دانوں کو بھی ان کے بارے میں علم نہیں تھا' یاد ہے ناماہ نور۔"

اس نے تائید حاصل کرنے کے لیے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ماہ نور کے چہرے پر بے زاری اور ناگواری کا تاثر تھا۔

"او یہ تو اس موضوع سے چڑنے لگی۔" اسے خیال گزرا۔

"یہ موفنز آپ نے خود بیک کیے ہیں کیا؟" ماہ نور کی خاطر فوراً" موضوع بدلتے ہوئے اس نے خدیجہ سے پوچھا۔

"ہاں!" وہ مسکرائیں۔ "کیسے لگے تمہیں؟"

"بہت اچھے ہیں۔" وہ خدیجہ کے سٹنگ روم میں چہار طرف نظر ڈالنے لگا۔

"مجھے فلزا کے بارے میں جان کر دکھ ہو رہا ہے!" فاطمہ جو کچھ دیر کے لیے اٹھ کر کمرے سے باہر گئی تھیں' واپس آتے ہوئے بولیں۔ "وقت کیسے کیسے نقوش چھوڑ جاتا ہے انسانوں کے چہروں اور حالات پر۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ایک پرانا البم کھولتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے کالج کے دنوں کا یہ البم ڈھونڈ کر صرف تم بچوں کو یہ دکھانے کے لیے لائی ہوں کہ اس وقت کی فلزا کو دیکھو اور جانو کہ وقت کتنا بڑا فیکٹر ہے۔"

سعد اور ماہ نور اپنی نشستوں پر آگے کھسکتے ہوئے اس میز پر جھک گئے جس پر فاطمہ نے البم رکھا تھا۔ البم کے شروع کے صفحات پر ٹرانسپیرنٹ کاغذ کے نیچے خدیجہ اور فاطمہ کی جوانی کی تصویریں چپکی تھیں۔

"اف خدیجہ! فاطمہ خالہ! آپ لوگ تو بیوٹی کوئنز تھیں۔" ماہ نور نے مسرت چھلکاتے لہجے میں تبصرہ کیا۔ "اف فاطمہ خالہ! آپ میک اپ میں کتنی اسٹائلو لگ رہی ہیں۔" اس نے ایک تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ اس زمانے کے ہائی فیشنز' خدیجہ خالہ آپ بھی جینز شرٹس پہنا کرتی تھیں کیا؟"

وہ ایک ایک تصویر پر تبصرہ کر رہی تھی۔

"یہ آپ کے بھائی ہیں نا' بالکل آپ سے شکل مل رہی ہے' یہ آپ کی امی یہ ابو' دیکھیں میں نے سب کو پہچان لیا۔"

سعد کو ماہ نور کی تبصرے اور سوال کرتی آواز اچھی لگ رہی تھی مگر اسے فلزا ظہور کی جوانی کی تصویر دیکھنے کی جلدی تھی۔ ماہ نور کے ایک ایک تصویر کو دیکھ کر ایکسائیٹڈ ہونے اور رک رک کر تبصرے کرنے پر اسے کوفت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ دیکھو' یہاں پہچانو فلزا کو؟" وہ صفحہ آگیا جس پر خدیجہ اور فاطمہ کی کالج یونیفارم میں مختلف تصویریں چپکی تھیں۔ سہیلیوں کے ساتھ' اکیلے اور ایک دو تصویریں کلاس میٹس اور ٹیچرز کے ساتھ گروپ کی شکل میں بھی تھیں۔ ماہ نور اور سعد کی تجسس بھری نظریں ایک ایک تصویر پر تیزی سے پھسلنے لگیں۔

"یہ۔" ماہ نور نے ایک تصویر پر انگلی رکھی' فاطمہ نے انکار میں سر ہلایا۔

ماہ نور نے ایک دو مزید تصویروں کی طرف اشارہ کیا مگر فاطمہ نفی میں سر ہلاتی رہیں۔

"یہ ہیں فلزا ظہور۔" سعد نے ایک تصویر پر انگلی رکھی جس میں فاطمہ اور خدیجہ دو لڑکیوں کے گلوں میں بانہیں ڈالے کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"ایگزیکٹلی (بالکل)۔" فاطمہ نے بے ساختہ کہا اور سعد کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔ سعد نے مسکراتے ہوئے ماہ نور کو دیکھا' وہ اسے جتانا چاہ رہا تھا کہ اس نے فلزا کو پہچان لیا تھا مگر ماہ نور کو برا سا منہ بناتے دیکھ کر اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو سمیٹ لیا۔

"یہ بڑی یادگار تصویر ہے!" فاطمہ اس تصویر کو دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ "اس میں' میں' خدیجہ' فلزا اور شہناز ہیں' ہم لوگ پنجاب یونیورسٹی کا بین الکلیاتی تقریری مقابلہ اٹینڈ کرنے گئے تھے' شہناز کنیرڈ میں پڑھتی تھی اور ہم ایف سی میں۔"

"شہناز کون فاطمہ خالہ؟" ماہ نور نے میز سے چائے کے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہماری کزن تھی شہناز۔" فاطمہ سے البم لے کر وہ تصویر دیکھتے ہوئے خدیجہ نے کہا۔ "بہت ذہین اور محنتی لڑکی تھی اللہ نے اسے حسن کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی خوبیوں سے نواز رکھا تھا۔"

"اب کہاں رہتی ہیں وہ؟" ماہ نور ٹرے اٹھا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"اب شاید وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔" خدیجہ کے لہجے میں تاسف اتر آیا۔

"شاید۔" ماہ نور اور سعد بیک وقت بولے۔

"ہاں!" خدیجہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے البم بند کیا۔ "سنا تھا شہناز کے شوہر نے اسے قتل کر دیا تھا۔"

"اوہ۔" اب کے بھی ماہ نور اور سعد کی آواز کمرے میں ایک ہی وقت میں گونجی۔

"آپ نے سنا تھا۔" ماہ نور ٹرے واپس ٹیبل پر رکھ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "مطلب آپ کو خود کو نہیں پتا۔"

"شہناز کی آواز بڑی اچھی تھی۔" خدیجہ نے بتانا شروع کیا۔ "وہ جسے کہتے ہیں نا کوالٹی وائس —— وہ اسکول کے زمانے میں گلوکاری اور نعت خوانی کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی' پھر وہ اپنے والدین کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی' اس کے والد ہمارے ماموں تھے۔ ایک بار چھٹیوں میں وہ لوگ پاکستان آئے ہمارے ایک کزن کی شادی تھی وہاں شہناز نے یونہی رشتہ داروں کی محفل میں دو' تین اس وقت کے مشہور نغمے سنائے۔ معلوم نہیں تھا کہ رشتہ داروں کی اس محفل میں بیٹھا ہماری رشتے کی ایک خالہ کا دیور ریڈیو پر کام کرتا تھا۔ اس نے جو شہناز کی آواز سنی تو بس نجانے کہاں اور کب اس کی جان کو ہی چمٹ گیا۔ ہم میں سے کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی اور وہ شہناز کو سبز باغ دکھا کر ریڈیو اسٹیشن لے گیا آڈیشن کے لیے۔ شہناز بی بی نے آڈیشن دیا اور پاس ہو گئی اور اپنے ابا سے ضد کرنے لگی کہ اسے یہیں پاکستان میں رہ کر پڑھنا ہے۔ ابا مجھے غالباً" بچی کو لندن کے نامعقول ماحول سے چڑ ہو گئی تھی' سو یہاں داخلہ کروا کر اسے ہمارے دوسرے ماموں کے پاس چھوڑ گئے۔ شہناز اور وہ ریڈیو پروڈیوسر صاحب شہناز کا کیسٹ مارکیٹ میں لانے کی تیاریوں میں جٹ گئے۔ اعتبار اور اعتماد کا زمانہ تھا' چھوٹے ماموں کی فیملی نے توجہ ہی نہیں کی کہ لڑکی کالج جاتی بھی تھی یا نہیں' دیر سے گھر لوٹتی تھی تو ایسا کیوں تھا' سب اپنی زندگیوں میں مگن تھے' مگر سب کی زندگیوں میں بے چینی کا پٹاخہ تو اس وقت پھوٹا جب شہناز کے گیت ریڈیو پر چلے پھر اس کا کیسٹ مارکیٹ میں آیا اور پھر جناب عالی شہناز بی بی ریڈیو سے اٹھ کر ایک دن ٹی وی سکرین پر جلوہ گر ہو گئیں۔ یہ خبر پل کی پل میں ادھر سے اٹھی اور لندن پہنچ گئی۔ بس جناب پھر کیا تھا شہناز کے والد صوم وصلوٰۃ کے پابند' شرع کے عاشق۔ غصے میں آگ بگولہ۔ آکر چھوٹے ماموں اور شہناز کے سر پر وہ برسے وہ برسے کہ الاماں۔ ادھر شہناز پر شہرت اور کامیابی کے بھوت نے اپنے پنجے گاڑ دیے تھے۔ اس نے باپ کی اس ڈیمانڈ پر کہ ان لغویات سے فوراً" چھٹکارا حاصل کرلے' صاف انکار کر دیا۔ خوب مار ماری' بحثا بحثی ہوئی مگر نہ شہناز اپنے موقف سے ہٹی نہ والد صاحب میں لچک آئی۔" خدیجہ سانس لینے کو رکیں۔

"ہمارے خاندان کے لیے یہ ناقابل قبول صورت حال تھی۔" خدیجہ کے رکنے پر فاطمہ نے قصے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "زمانہ بدل رہا تھا' مگر ہمارے یہاں شخصی آزادی کی حد کی ایک واضح لکیر جو نجانے کب کھینچ دی گئی تھی اسے مٹانے کا کوئی تصور تک کرنے کو تیار نہیں تھا۔" فاطمہ نے بات سناتے سناتے سعد پر نظر

ڈالی۔ انہیں اس کے چہرے پر تجسس اور محویت نظر آئی۔

"لڑکا قصے اور داستانیں سننے کا شوقین لگتا ہے۔" انہوں نے دل میں سوچا۔

"پھر کیا ہوا؟" کمرے میں ماہ نور کی آواز گونجی۔

"پھر ایسا ہوا کہ شہناز کے والد نے اس سے لاتعلقی کا اعلان کرتے ہوئے اسے اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کردینے کی دھمکی دے دی۔"

"اوہ یہ تو ایکسٹریم ری ایکشن ہو گیا نا۔" ماہ نور نے بے ساختہ کہا۔

"ایکشن بھی تو ایکسٹریم تھا نا۔" سعد نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور خدیجہ کی طرف دیکھا' وہ آگے کیا سنانے والی تھیں۔

"شہناز پر ان دھمکیوں اور اعلانوں کا مطلق اثر نہیں ہوا' اس کی جوانی اور بغاوت اپنے جوبن پر تھی۔ خاندان کے بزرگوں' نوجوانوں' بچوں تک نے اسے ہر ممکن سمجھانے کی کوشش کی مگر اسے شاید سمجھنا ہی نہیں تھا۔ اس نے ماموں یعنی اپنے والد سے کہا کہ وہ اس سے کیا لاتعلقی اختیار کریں گے' وہ خود ہی ایسے والدین کی اولاد کہلانا نہیں چاہتی جو اولاد کو اپنی مرضی سے جینے کی آزادی دینے کو تیار نہیں۔ ماموں نے شہناز سے لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے اسے عاق کردیا اور خود واپس چلے گئے۔ جاتے جاتے سارے خاندان کو یہ دھمکی بھی دے گئے کہ جس کسی نے شہناز سے کوئی تعلق رکھا' اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اس دھمکی کو خاندان بھر نے اس طرح لیا کہ جیسے شہناز سے تعلق رکھنے والا ملعون قرار دے دیا جائے گا۔" خدیجہ نے کہا۔

"بپھری ہوئی شہناز نے چھوٹے ماموں کے گھر سے سامان اٹھایا اور اللہ جانے کہاں گئی کہ اس کے بعد کبھی کہیں نظر نہیں آئی۔ ایک بار ایک موسیقی کی محفل میں ایک عزیز کو ملی اور اسے پہچاننے سے انکار کردیا۔ پھر بہت عرصے بعد کہیں سے اڑتی اڑتی خبر آئی کہ شہناز نے کسی امیر شخص سے شادی کرلی تھی جس نے کسی وجہ سے اس کا گلا کاٹ کر اسے قتل کردیا۔"

"ہائے!" ماہ نور نے خوف سے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ سعد نے ایک نظر ماہ نور پر ڈالی اور پھر خدیجہ کی طرف دیکھا۔

"اور شہناز کے والد' ان کا گھرانہ؟" اس نے سوال کیا۔

"ماموں بے چارے تو اس صدمے سے جو واپس جا کر بیمار پڑے تو شاید ایک سال بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ مضبوط اعصاب کے آدمی تھے مگر یہ انہونی اور پھر جذباتی فیصلے کے نتائج یعنی شہناز سے دوری کو سہہ نہیں پائے۔ پہلے فالج گرا اور زبان مفلوج ہوئی پھر دل فیل ہو گیا۔ ان کی دوسری بیٹی رئیسہ ان کی وصیت کے مطابق سب جائیداد اور سازو سامان کی مالک بن گئی' بیوی کا پہلے ہی انتقال ہوچکا تھا' اللہ اللہ خیر صلا۔" خدیجہ نے قصہ لپیٹتے ہوئے کہا۔

"یہ خبر تو آپ نے صرف سنی ہی تھی نا کہ شہناز کا قتل ہو گیا' کنفرم تو نہیں ہوئی یہ خبر۔" سعد نے کہا۔ خدیجہ نے جواب دینے سے پہلے ایک نظر سعد پر ڈالی' اضطراب اور تجسس کی کیفیت میں وہ اپنی نشست پر آگے کھسکتا ہوا عین اس کے کنارے پر بیٹھا تھا۔

"شہناز کے قصے کا آخری حصہ یعنی اس کا قتل لاکھ سنسنی خیز سہی مگر یہ لڑکا کچھ زیادہ ہی مضطرب نہیں ہو رہا۔" انہوں نے سوچا۔

"اس کے بعد چونکہ اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی اور ہمارے جیسے خاندانوں کا اکثر یہ المیہ ہوتا ہے کہ خاندانی شرافت و نجابت بچانے کی خاطر اس قسم کے قصوں سے پہلوتہی کرلی جاتی ہے' لہٰذا پھر نہ کوئی اس پر بولا نہ کسی نے بات کی۔" انہوں نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"ہم دونوں بہنوں کو البتہ شہناز اکثر یاد آجاتی ہے۔" فاطمہ نے کہا۔ "وہ ہماری ہم عمر تھی' کزن ہونے کے علاوہ قریبی دوست بھی تھی' اس لیے ہماری بہت سی یادیں اس سے وابستہ ہیں لیکن خاندان کے اکثر بزرگوں کی وفات کے بعد چونکہ اب ہم لوگ بزرگوں کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں تو وہی خاندانی شرافت و نجابت امانت بن کر ہمارے ہاتھوں میں آچکی ہے' کس سے پوچھیں شہناز کا قتل کیسے ہوا' ہوا بھی کہ نہیں ہوا؟"

فاطمہ کی بات سن کر سعد نے سر جھکا لیا۔ "جی یہ بھی ٹھیک ہے۔" کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اُفوہ سعد! کیا تم یہاں فلرٹ ظہور اور اس کی قسم کے دوسرے لوگوں کو ڈسکس کرنے آئے ہو۔" ماہ نور نے جھنجلاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"سعد کو لگتا ہے' ماضی کے قصوں میں خاصی دلچسپی ہے۔" خدیجہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولیں۔

"بے شک۔" سعد نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا اور ماہ نور کی طرف دیکھا۔ "مس ہیولیشم قسم کی اولڈ لیڈیز کے قصوں میں خصوصاً"!"

"گویا اپنی ہم عمر لڑکیوں میں تمہاری دلچسپی بالکل صفر ہے۔" فاطمہ نے دانستہ کہا اور شرارت بھرے انداز میں ہنس دیں۔

"ہوں!" سعد نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ نمبر دو ترجیح کہی جاسکتی ہے۔" اس کے چہرے پر بھی شرارت کا رنگ تھا۔

"ماہ نور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔" فاطمہ مسکرائیں۔ "اسے میلوں میں کافی گاتے سائیں' بندر کے تماشے دکھاتے مداری' مٹی کے برتن بناتے کمہار قسم کے لوگ خوب اٹریکٹ کرتے ہیں۔"

"مطلب artisans" (ہنرمند)۔" خدیجہ نے اضافہ کیا۔

"گویا سوانگ بھرنے والے لوگ ماہ نور کو اٹریکٹ کرتے ہیں!" سعد ہنستے ہوئے ماہ نور کو دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے' اب مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔" ماہ نور نے ناراض انداز میں ٹرے اٹھائی اور کچن کی طرف چل دی۔

"بہت اچھی' بے ریا اور نیک دل لڑکی ہے۔" ماہ نور کے جانے کے بعد فاطمہ نے سعد سے کہا۔ سعد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ کا کیا خیال ہے' آپ کی کزن شہناز جیسی سنگر اور ایک میلوں میں گانے والی میراثن میں کوئی مماثلت ہوسکتی ہے' کیا وہ ایک ہی کیٹگری میں شامل ہوسکتی ہیں۔" اس نے جلدی سے فاطمہ سے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے' بالکل نہیں۔" فاطمہ نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد کہا۔ "شہناز کی کوئی آڈیو کیسٹ یا ریڈیو پاکستان کی میوزک لائبریری میں محفوظ ریکارڈز شاید کہیں مل سکیں' تم کو موقع ملے تو کہیں سے ڈھونڈ کر سننا' تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ شہناز کی شخصیت میں اس کا خاندانی وقار اور رکھ رکھاؤ کیسے بولتا ہے' میراثن کا جو اسٹیٹس ہے' شہناز اس سے' بہت بلند' بہت مختلف تھی۔"

"ہمارے معاشرے میں البتہ یہ رواج عام ہے۔" خدیجہ نے ان دونوں کی بات سنتے ہوئے کہا۔ "فلم میں کام کرنے والی لڑکی لاکھ چلا چلا کر کہے' اس کا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے' ہم لوگ یہ ثابت کرنے پر تل جاتے ہیں کہ ضرور اس کا تعلق ریڈ لائٹ ایریا سے ہی ہے' اسی طرح جو گلوکار وغیرہ ہیں' ان کے فیملی بیک گراؤنڈز کو نظر انداز کرکے عامیانہ سے انداز میں کہہ دیا جاتا ہے' میراثی ہیں یہ گویے سارے' سب کا پس

منظر یہ ہی ہے۔"
فاطمہ نے دیکھا خدیجہ کی یہ بات سن کر لمحہ بھر کے لیے سعد کے چہرے پر کرب کی لہر دوڑی تھی۔ جسے دیکھ کر فاطمہ نے دل میں خود سے کوئی بات کہی اور سر ہلا دیا۔
"اگر فلزا ظہور نامہ ختم ہو گیا ہو تو کوئی اور بات کر لی جائے۔" اسی دم ماہ نور نے کمرے میں آ کر گفتگو کا موضوع بدل ڈالا۔



"میں تو بڑا اداس ہو گیا تھا بھین جی، پر ڈیوٹی تو پھر ڈیوٹی ہوتی ہے نا۔" کھاری نے آپا رابعہ کے قریب تخت پوش پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ "بھگتانی پڑتی ہے۔"
"بہت دنوں بعد شکل دیکھی ہے تمہاری ایسا لگتا ہے دل میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔" آپا رابعہ نے محبت بھرے انداز میں کھاری کو دیکھا۔
"او جی لکھ دنیا کہے لہور لہور ہے، میں تو بس اکو (ایک) ہی بات کہتا ہوں جو مزا چھجو دے چوبارے او نہ بلخ نہ بخارے۔" کھاری کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ اسے گاؤں واپس آ کر مانوسیت اور اپنائیت کا جو احساس ہو رہا تھا اس کا اندازہ وہی کر سکتا تھا۔
"میں بڑی کوشش کیتی (کی) جی مگر میرے سبق پیچھے پڑ گئے۔" اس نے آپا رابعہ کو بتایا۔
"ادھر لہور میں کسی کو اتنا ٹائم ہی نہیں کہ دو گھڑی تھم کے کھاری وچارے (بے چارے) کو تھوڑا سبق سیپارے کا ہی دے دے۔" اس کے لہجے میں گلہ تھا۔
"سبق صرف استاد ہی دے سکتا ہے کھاری۔ وہ بھی اپنا!" آپا رابعہ نے محبت بھرے انداز میں کھاری کے بال سہلاتے ہوئے کہا۔
"پر وڈے بزرگ تو کہتے ہیں علم دینا اور لینا پڑھن والے (طالب علم) تے پڑھان والے (معلم) کا کام ہے بلکہ فرض ہے۔"
"پڑھانے والا ہر کوئی نہیں نا ہوتا کھاری۔" آپا رابعہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
"چلو خیر معاملہ یہ ہے کہ پچھلا سبق بھی ایک واری فیر پکا کرانا ہے اور نواں (نیا) تو دینا ہی ہے۔" کھاری نے اصل معاملہ ان کے گوش گزار کیا۔
"یعنی سب بھول گئے۔" آپا رابعہ کو افسوس ہوا۔
"بھل نہیں گیا۔" کھاری نے ان کو تسلی دی۔ "پکا کرنا ہے۔"
"کان آگے سے پکڑو یا پیچھے سے ایک ہی بات ہے!" آپا رابعہ کو اس کی چالاکی پر ہنسی آ گئی۔ "یہ کیا ہے۔" انہوں نے صحن میں رکھے تھیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کھاری لے کر آیا تھا۔
"سبزی بھیجی ہے چوہدری صاحب نے، سنگھاڑے بھی ہیں، شکر قندیاں بھی، کچھ فروٹ بھی ہے۔ ایک تھیلے میں آٹا ہے اور ایک میں چینی۔"
"شکر ہے چوہدری صاحب واپس آئے۔ مانو رونق لوٹ آئی ہمارے گھر میں۔ اونچی شانیں سلامت رہیں چوہدری صاحب کی۔" آپا رابعہ نے وافر مقدار میں چیزیں دیکھتے ہوئے کہا اور کھاری کی طرف متوجہ ہوئیں، جو لاہور میں قیام کے دوران گزرے واقعات انہیں سنا رہا تھا۔
"السلام علیکم سعدیہ باؤ... کیا حال چال ہے۔" اسی دوران سعدیہ سیڑھیاں اتر کر چھت سے نیچے آئی تو کھاری

نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا۔ سعدیہ نے کھاری کو جواب دینے کے بجائے راستے میں رکھی لکڑی کی نیچی چوکی کو پاؤں سے ٹھڈا مارا اور ان دونوں کے قریب سے گزرتی کمرے میں چلی گئی۔

"اوئے ہوئے ہوئے..." کھاری نے سعدیہ کو اندر جاتے دیکھ کر آپا رابعہ سے کہا۔

"سعدیہ باؤ نے تو لگتا ہے نری مرچوں کا سالن کھالیا ہے' بھلیکے سے" (غلطی سے) وہ ہنسا۔ آپا رابعہ نے خفگی سے سر جھٹکا۔

"پرچے ختم ہو گئے؟" کھاری نے سوالیہ نظروں سے آپا رابعہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں...!" آپا رابعہ نے خفگی سے جواب دیا۔

"تے پھر کیا مسئلہ ہو گیا سعدیہ کو' ہنسے' کھیلے' خوش رہے' اگوں دسویں پڑھنی ہے۔" کھاری نے اپنی عقل اور سوچ کے مطابق خیال ظاہر کیا۔ "پر وہ تو لگتا ہے اگ (آگ) کا گولہ بن گئی ہے۔"

"کوئی دسویں نہیں پڑھنی اس نے' یہ گھر بیٹھے اب۔" آپا رابعہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"ہیں جی!" کھاری کو ایک دم کرنٹ سا لگا۔ "کیوں نہیں پڑھنی جی؟"

"بس۔" آپا رابعہ نے سر جھٹکا۔ "ہم میں اب اتنا دم نہیں اتنا خرچا کرنے کا۔"

"پر سعدیہ نے تو ڈاکٹر بننا ہے جی!" کھاری اٹکتے ہوئے بولا۔

"ڈاکٹر بننا ہے۔" آپا رابعہ نے تلخ لہجے میں اس کی بات دہرائی۔ "زکوٰۃ خیراتوں پر بھی کبھی کوئی ڈاکٹر بن سکا ہے۔ ہمارے پاس کون سے خزانے ہیں جن کے منہ کھول کر اسے ڈاکٹر بنائیں گے۔"

بات کچھ کھاری کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ مزید کوئی سوال پوچھے بغیر آپا رابعہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فارم ہاؤس لوٹ آیا۔

"لو جی۔ میں ان کے گھر سوغاتیں دینے گیا۔ یہ ادھر حاضری لگانے آگئے۔" چوہدری صاحب کے آنے کا سن کر واپسی پر مولوی سراج کو فارم ہاؤس کے ملاقاتیوں والے کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس نے سوچا۔ "جو سچ پوچھو تو مولی صاحب بھی نا بڑے ہی چول ہیں۔" اس نے سر جھٹکا۔ "ذرا صبر تو کرو بھائی! چوہدری صاحب کو خود فکر ہے' وہ پہنچا دیں گے چیزیں آپ کے گھر' پر صبر کدھر سے آئے' بڑا مسئلہ ہے بھئی۔" وہ دل میں سوچتا اور سر جھٹکتا رہا۔

اس رات چوہدری صاحب کے بلاوے پر بھی اسے فوراً" مولوی سراج سرفراز کا ہی خیال آیا تھا۔ "لو جی چوہدری صاب سوچدے ہوں گے کہ میں آگا پیچھا کر گیا ہوں' سوغاتیں نہیں پہنچائیں میں نے مولی صاب کے گھر۔" وہ دل ہی دل میں سوچتا اور مولوی سراج کو کوستا چوہدری صاحب کے پاس آیا تھا۔

"بیٹھو کھاری!" چوہدری صاحب' جو ماسٹر کمال سے میٹنگ کر رہے تھے انہوں نے ماسٹر کمال کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ماسٹر کمال کے جانے کے بعد چوہدری صاحب نے کھاری سے کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کرنے کا حکم دیا۔

"کھاری بیٹا جی... میں نے تجھے کبھی غیر سمجھا؟" لاک کر کے واپس آنے کے بعد جب وہ چوہدری صاحب کے سامنے بیٹھا تو انہوں نے سوال کیا۔

"نہیں جی...!" کھاری نے سر ہلایا۔

"کوئی مسئلہ' کوئی شکایت' کبھی تجھے مجھ سے ہوئی ہو۔" دوسرا سوال آیا۔

"نہیں جی!"

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

نازیہ جمال



"او کے بھابھی! پھر شام کو ملتے ہیں۔ اللہ حافظ۔"

راشدہ نے الوداعی کلمات کی ادائی کے بعد ریسیور رکھ دیا۔ آج شام کھانے پہ ان کے بھائی، بھابھی اور سارے بچے ان کے گھر آرہے تھے۔

چند سال قبل ان کی بڑی بیٹی طوبیٰ کے لیے بھابھی سیلہ نے پسندیدگی ظاہر کی تھی۔ اس وقت طوبیٰ خاصی کم عمر تھی۔ اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر پچھلے ہفتے جوں ہی ارسلان کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب ملی تو احمد اور سیلہ نے سوچا کہ اب ارسلان کی بات پکی کردی جائے۔ طوبیٰ کا ماسٹرز بھی مکمل ہونے والا تھا اور ارسلان بھی خیر سے اپنے پاؤں پہ کھڑا ہوچکا تھا۔ سو آج سیلہ نے نند کو اپنی آمد کے مقصد سے فون پہ آگاہ کردیا تھا۔

راشدہ تو خوشی سے جھوم اٹھیں۔ اونچا لمبا، بے حد خوبرو، فرماں بردار اور سلجھا ہوا بھتیجا۔ ارسلان اپنی اولاد سے بھی پیارا لگتا ہے۔ وہ طوبیٰ کے لیے جیسے ہم سفر کی خواہاں تھیں، وہ ارسلان کی شکل میں انہیں مل چکا تھا۔

انہوں نے بے حد مسرور ہو کر اسی وقت ڈنر کی تیاری شروع کردی۔ بلال کو بھیج کر کافی لمبا چوڑا سودا منگوایا گیا۔ طوبیٰ کچن میں جت گئی اور عمارہ پردوں اور فرنیچر کی سیٹنگ بدلنے لگی۔

ماموں، ممانی بلا مبالغہ ہر ماہ باقاعدگی سے ان کے گھر کا چکر لگاتے رہتے تھے۔ مگر آج ان کی آمد کی وجہ ہی خاص تھی۔ سو اہتمام تو بنتا تھا۔

کھانا بے تکلف ماحول میں کھایا گیا۔ سیلہ اور ا... اپنے ساتھ کافی کچھ لائے تھے۔ سونے کا نفیس سیٹ، پانچ عدد ریڈی میڈ کام دار سوٹ، مٹھائی، پھل..... شادی طوبیٰ کے ماسٹرز کے بعد ہونا قرار پائی تھی۔



زیبی آنٹی کی ماہا نے ایف ایس سی میں بورڈ میں تیسری پوزیشن لی تو سارے خاندان میں خوشی کی لہر د... گئی۔

"رات فون پر تمہارے ابو اور میں نے زیبی کو مبارک باد تو دی تھی۔ مگر جانا تو بنتا ہے۔ سارا خاندان ان کے گھر جاکر مبارک باد دے رہا ہے۔ میں خالہ ہو... لیٹ جاؤں تو زیبی ضرور محسوس کرے گی۔" جر... کے بٹن بند کرتے ہوئے راشدہ بولیں۔

"جی امی! گھر جاکر مبارک باد دینا، فون پہ مبارک... دینے سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ آپ آنٹی اور ماہا... ہماری طرف سے بھی ضرور مبارک باد دیجیے گا۔ ہم خو... بھی چکر لگائیں گے۔" طوبیٰ نے ماں کو چادر تھمائی۔ باہر بلال ہارن پہ ہارن دے رہا تھا کہ اسے بہت جلدی... ہے۔

"اچھا! تم گھر کا خیال رکھنا۔ یہ لڑکا تو اتاؤلا ہوا جا... ہے۔ آرہی ہوں بھئی۔" بلال کو زور سے ہانک لگا کر راشدہ پرس اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

عصر کے قریب ان کی واپسی ہوئی۔ گھر کا تقری... سارا کام طوبیٰ نے سنبھالا ہوا تھا۔ آٹا گوندھتے ہو...

اس نے محسوس کیا کہ راشدہ بہن کے گھر سے واپسی پر کچھ چپ چپ تھیں۔ چہرہ پرسوچ لکیروں سے سجا تھا۔

"کیا ہوا امی! زیبی آنٹی کے ہاں سب خیریت تو ہے نا۔" گیلے ہاتھ دوپٹے سے خشک کرتے ہوئے وہ ان کے پاس آبیٹھی۔

"ہاں! سب ٹھیک ہے۔" راشدہ نے ایک لمبی سانس بھری۔

"تمہاری آنٹی بتا رہی تھیں کہ ماہا کے بے شمار رشتے آرہے ہیں۔ تمہارے خالوان ہی میں سے کسی ایک کو ہاں کہنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"تو...؟" اسے ماں کی الجھن پھر بھی سمجھ میں نہ آئی۔

"طوبیٰ! میرا دل بہت چاہتا ہے کہ میں ماہا کو اپنے بلال کے لیے مانگ لوں۔"

"سچ امی! آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔" وہ ان کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی خوشی سے چیخ پڑی۔

"مجھے ماہا کتنی اچھی لگتی ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں



سکتی۔ بلکہ مجھے کیا عمارہ کو اور بلال کو بھی۔۔۔"

"کیا بلال نے کوئی ایسی بات کی تم سے؟"

راشدہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ انداز کھوجتا ہوا تھا، جیسے طوبیٰ کی بات کی صداقت کو جانچنا چاہ رہی ہوں۔

"جی امی! بلال نے مجھے بہت پہلے کہا تھا کہ اسے ماہا اچھی لگتی ہے۔ ہے تو کٹ کھنی اور جھگڑالو، لیکن خوب صورت اور ذہین ہے، اس لیے چل جائے گی۔" بولتے ہوئے طوبیٰ ایک دم ہنس پڑی۔ بہن، بھائیوں میں دوستانہ بے تکلفی تھی۔ بلا جھجک اپنے دل کی باتیں ایک دوسرے سے کرلیا کرتے تھے۔

"ہاں! اچھی تو مجھے بھی لگتی ہے۔" راشدہ نے سر اثبات میں ہلایا۔ "زیبی اور اکرام بہت بے صبرے ہو رہے ہیں۔ ورنہ عمر ہی کیا ہے بچوں کی۔ میں چاہتی تھی ذرا سمجھ دار ہو جائیں۔"

"ارے امی! فی الحال تو رشتہ پکا کرتے ہیں۔ شادی بلال کی جاب کے بعد ہی ہو گی۔" طوبیٰ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"چلو! دیکھتے ہیں۔ تمہارے ابو سے شام کو بات کرتی ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔"

اور سجاد احمد کو کیا کہنا تھا۔ سوائے اس کے کہ بچوں کی خوشی میں ہی ان کی خوشی ہے۔ سو اسی ہفتے ماہا اور بلال کی نسبت طے کر دی گئی۔

☼ ☼ ☼

ادھر طوبیٰ کا ایم اے کا رزلٹ آیا۔ ادھر راشدہ نے گھر بازار ایک کرکے رکھ دیا۔ انواع و اقسام کے برتن، کپڑے اور اشیائے آرائش و تعیشات وغیرہ خریدیں۔ زیور وہ بہت پہلے کا بنا چکی تھیں۔ فرنیچر عین ٹائم پہ لینے کا ارادہ تھا۔

پہلی اولاد کیا بیاہنے جا رہی تھیں۔ سو ضرورت سے زیادہ پھرتی دکھائی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھائی اور بھابھی تاریخ طے کرنے آ پہنچیں اور ان کی تیاری ہی مکمل نہ ہو، کیونکہ ان کے درمیان یہ ہی طے پایا تھا کہ شادی طوبیٰ کے ماسٹرز کرنے کے بعد ہو گی اور اب طوبیٰ کے رزلٹ کو چھ ماہ ہو چکے تھے۔ سہیلہ کی آمد کسی وقت متوقع تھی۔

سہیلہ اور احمد نے سابقہ معمول برقرار رکھا ہوا تھا، یعنی ہر ماہ ان کے گھر کا چکر لگانا۔ مگر ارسلان کی شادی کا تذکرہ کبھی بھولے سے بھی نہ چھیڑتے۔

راشدہ باتوں ہی باتوں میں طوبیٰ کے جہیز کے ایک ایک آئٹم کا خاصے جتاتے ہوئے انداز میں ذکر کرتیں مگر سہیلہ الٹا اپنے گھر کے مسائل لے بیٹھتیں۔

"راشدہ! تمہارے بھائی کا بزنس آج کل کافی ڈاؤن چل رہا ہے۔" لہجہ بے حد مغموم اور مایوسانہ ہوتا۔

"تو بھابھی! خیر سے ارسلان کی جاب بھی تو ہے۔" راشدہ خوش دلی سے انہیں امید کا جگنو پکڑاتیں۔

"آج کل کی مہنگائی کے مقابلے میں ارسلان کی تنخواہ تو بس اونٹ کے منہ میں زیرے والی جتنی ہے۔ سات بندوں کا کھانا پینا، فیضان کی یونیورسٹی، نعمان کی اکیڈمی، فضا کا کالج اور تمہارے بھائی اور میری دوائیاں۔ سوچو! ارسلان کے چند ہزار روپے کہاں کہاں خرچ ہوتے ہیں۔ بچت تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ سونا کہاں سے کہاں چلا گیا اور ابھی تک بہو کے لیے ایک چھلا تک نہ بنوا سکی۔ ہمت ہے تمہاری جو کچھ اتنی جلدی جوڑ لیا ہے۔"

لوجی! قصہ ہی ختم۔

راشدہ کو بھابھی کا یہ سرد رویہ خاصا کھلا تھا۔ اب خاندان کی تقریبات میں بھی اڑتی اڑتی سنی تھی کہ سہیلہ بھابھی کا فی الحال پانچ سال تک بیٹے کو بیاہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

"طوبیٰ تیئس کی تو ہو چکی ہے۔ پانچ سال بعد تو۔۔۔" ان کی راتوں کی نیند حرام ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

سخت ذہنی دباؤ کے سبب راشدہ کا بی پی خطرناک حد تک شوٹ کر جاتا تھا۔ کھڑے کھڑے گر جاتیں۔ ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے۔

"تم نے خوامخواہ طوبیٰ کی شادی کو سر پہ سوار کر لیا ہے۔ کتنی چھوٹی تو ہے ہماری بیٹی۔" سجاد ان کا ہاتھ پکڑ کے نرمی سے بولے۔

"آپ سمجھ نہیں سکتے۔ ایک ماں کی پریشانیوں کا اندازہ لگانا آپ کے لیے مشکل ہے۔" راشدہ یاسیت سے بولنے لگیں۔

"طوبیٰ کی ہم عمر تقریباً" ساری لڑکیاں شادی شدہ، بال بچوں والی ہو چکی ہیں۔ چار سال کتنے آرام سے گزر گئے ہیں، پتا ہی نہیں۔ بھابھی تو جیسے بھول ہی گئی ہیں کہ بیٹے کی کہیں منگنی بھی کی تھی۔ بہت اچھا کاروبار چل رہا ہے بھائی جان کا۔ ارسلان کی بھی پچھلے دنوں پروموشن ہوئی ہے۔ سب بہانے ہیں۔ خرچا کرنے سے جی چراتی ہیں۔" بولتے بولتے ان کا لہجہ ایک دم کڑوا ہو گیا تھا۔

"جو بھی ہو، اب ان سے اپنے منہ سے کہنا بھی تو بیٹی کی توقیر گھٹاتا ہے۔ کیا کہیں گے کہ ہم پہ بیٹی کی دو وقت کی روٹی بھاری پڑ گئی ہے۔" سجاد رسانیت سے کہنے لگے۔

"بس میری طبیعت ذرا ٹھیک ہو جائے، میں خود احمد بھائی سے ڈائریکٹ بات کرتی ہوں۔ میری بیٹی آخر کب تک ان کے بیٹے کے نام پہ بیٹھی رہے۔" راشدہ کا انداز فیصلہ کن تھا۔

"نہیں! یہ مناسب نہیں لگتا۔" سجاد نے ان سے اتفاق نہ کیا۔

"مناسب کیوں نہیں۔ اپنوں میں مناسب، نامناسب نہیں دیکھا جاتا۔" راشدہ کا انداز ہنوز تھا۔

ابھی وہ اسی بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ زیبی اور اکرام کی آمد ہوئی۔

"ہائے آپا! آپ تو سوکھ کر کانٹا ہوتی جا رہی ہیں۔ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتیں۔" زیبی ان کے گلے لگتے ہوئے محبت سے بولی۔ دونوں میاں، بیوی ان کی عیادت کے سلسلے میں آئے تھے۔

"اچھی بھلی تو ہوں۔ تمہیں پتا نہیں کیوں کانٹا دکھائی دے رہی ہوں۔" وہ ہلکے سے مسکرائیں۔ طوبیٰ اسی وقت چائے اور دیگر لوازمات لے آئی۔

"آپا! میں اور اکرام سوچ رہے ہیں کہ اب ماہا کو اپنے گھر کا کر دیں۔" چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے زیبی سنجیدگی سے بولی۔ "دیکھیں نا! منگنی کو چار سال ہو گئے ہیں۔ جو نصیب میں ہے، وہ تو میں نے تیار کر لیا ہے۔ آپ کے کیا ارادے ہیں۔" زیبی سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔

"ہاں زیب! کیوں نہیں۔ بلال کی جاب کو فی الحال سال ہوا ہے۔ ان شاء اللہ میں زیور تو اسی ماہ بننے دیتی ہوں۔" راشدہ بدقت مسکرا کر بولیں۔

"آپا! جو بھی کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔ آپ کو علم تو ہے، میری دو بیٹیاں اور بھی ہیں، ایک جتنی، مجھے ان کا بھی تو سوچنا ہے۔ پہلے ماہا کے ہاتھ پیلے تو کروں۔" چائے ختم کرنے کے بعد زیبی نے صوفے سے آرام سے ٹیک لگا لی تھی۔

"بس زیب! تم طوبیٰ کی شادی تک صبر کر لو۔ میں جیسے ہی طوبیٰ کے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں، اسی دن خیر سے بلال کی مہندی ہو گی ان شاء اللہ۔"

راشدہ کسی قدر بے چارگی سے بولیں۔ زیبی کے سنجیدہ انداز و اطوار انہیں بری طرح کھٹکے تھے۔ بہن کی طرف سے معمول کی خوش اخلاقی میں بھی کمی پائی تھی۔

"تو کیا جب تک طوبیٰ کی شادی نہیں ہوتی، میری ماہا بیٹھی رہے گی؟ فرض کیا، طوبیٰ کی شادی مزید چار سال آگے ہو جائے تو کیا ماہا کی شادی بھی نہ ہو گی؟"

زیبی کا انداز تیکھا اور لہجہ تلخ تھا۔

راشدہ کو کوئی جواب نہ سوجھ سکا۔

☼ ☼ ☼

"بیگم! کیوں نہ طوبیٰ اور بلال کی شادی ایک ساتھ، اکٹھے کر دیں۔ کم خرچ بالا نشین والی بات ہو گی۔ دوسرے تمہاری خدمت کے لیے بہو بھی آ جائے گی۔" صبح کام پر جاتے ہوئے سجاد کو اچانک خیال آیا تھا۔ فوراً" کہہ بھی ڈالا۔

"پتا نہیں' کیسے الٹے سیدھے خیالات سوجھتے رہتے ہیں آپ کو بھی۔"

راشدہ تپ کر بولیں۔ وہ یوں بھی آج کل خاصی چڑی ہوئی تھیں۔ زیب کا دباؤ جو بڑھتا جا رہا تھا۔

"ہونہہ! ابھی عمر کیا ہے بلال کی۔ جو اتنی بڑی ذمہ داری اس کے سر پر ڈال دوں۔"

یہ خوب صورت سا وسیع گھر' جس کی وہ بلا شرکت غیرے مالک تھیں۔ اپنی راج دھانی میں کسی دوسری ہستی کی شراکت کا خیال ہی انہیں بے چین کر ڈالتا تھا۔ اس گھر کو سجاد نے بہت محنت سے تعمیر کرایا تھا اور انہوں نے بہت محبت سے سجایا اور ان کا اکلوتا لاڈلا بیٹا بلال' جس کی محبت اور کمائی پہ پہلا حق ان کا تھا۔ بھلا اتنی جلدی کیسے بٹوارہ کر لیتیں۔

"امی! ابو ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں۔ اتنا مزا آئے گا' اس طرح ہمیں طوبیٰ کی کمی بھی فیل نہیں ہو گی۔" بالوں پہ ہیر بینڈ چڑھاتے ہوئے عمارہ نے بھی باپ کی رائے سے اتفاق کیا۔ وہ اس وقت کالج کے لیے نکل رہی تھی۔

"تم چپ رہو۔" راشدہ نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

"جس بات کا علم نہ ہو' اس میں دخل دینا ضروری نہیں ہے۔ زیبی اور اکرام سے تو اللہ پوچھے۔ ہتھیلی پہ سرسوں جمانا چاہتے ہیں یہ تو۔ جیسے میں رشتے سے انکار کر رہی ہوں یا جیسے ان کی بیٹی کہیں بھاگی جا رہی ہو۔" راشدہ کا لہجہ حقارت لیے ہوئے تھا۔

"امی!" طوبیٰ صدمے سے جیسے گنگ رہ گئی۔

"ہاں! تو ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔" وہ بری طرح جھنجلائیں۔ طوبیٰ کی ملامت آمیز نظریں ان پر جمی تھیں۔

"ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی تو ہوئے ہیں بلال کو کماتے ہوئے۔ شادی ہو گی' پھر فیملی تو بڑھے گی نا' مزید خرچے' ابھی تو سامنے والا پورشن بنوانا ہے۔ عمارہ کی پڑھائی' جہیز۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ باہر صحن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تو پھر ہو سکتا ہے' مامی سیلہ کا ہاتھ بھی تنگ ہو۔ ارسلان کی تنخواہ پوری نہ پڑ رہی ہو۔ ان کے بھی تو سارے بچے زیر تعلیم ہیں۔" پلیٹیں خشک کر کے اسٹینڈ میں لگاتے ہوئے طوبیٰ سادگی سے بولی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

راشدہ نے ٹھٹک کر بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ نہ جانے انہیں کیوں محسوس ہوا کہ طوبیٰ کی آنکھیں نم ہیں۔ سادہ' سپاٹ چہرہ۔

انہیں کئی بار محسوس ہوا تھا کہ طوبیٰ بہت کم آمیز ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ بہن بھائی اور کزنوں کی محفل میں بیٹھنے سے بھی اکتانے لگی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں اعتماد کی چمک بھی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ اپنی ذات سے دن بدن لاپروا ہوتی جا رہی تھی۔ میلا ملگجا سوٹ' الجھے بکھرے بال' کاجل سے خفا آنکھیں۔ نہ جانے انہیں کیوں لگا جیسے بیٹی کے زندگی کے رنگوں کو پھیکا کرنے میں ان کا اپنا قصور ہو۔ غلطی ان سے ہوئی تھی اور سزا ان کی بیٹی کو مل رہی تھی۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے طوبیٰ' جیسے میں بہولانے سے کترا رہی ہوں۔ یہ ہی سوچ سیلہ بھابھی کی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ہر بیٹے کی ماں سمدھن کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھنے لگے تو سب بچیاں مناسب وقت پہ اپنے گھر کی ہو سکتی ہیں۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ "فوراً" زیبی کا نمبر ملانے لگیں۔ اسے یہ بتانے کے لیے کہ وہ لوگ آج ماہا کی تاریخ لینے آ رہے ہیں۔



سعدیہ عزیز آفریدی

ارماں کا شقو

یہ ہم سب کی متفقہ رائے تھی۔ شفاعت بھیا کبھی نہیں بدل سکتے۔ ان کا مکمل کنٹرول اماں کے ہاتھ میں تھا اور ہم تینوں بھائیوں اور دونوں بہنوں کو اندازہ تھا کہ شادی کے بعد شفاعت بھیا کی بیوی کو کتنے جو کھم اٹھانے پڑیں گے۔ اگر اس نے شفاعت بھیا کو خوش رکھنے کے لیے اماں سے خوش گوار رشتہ استوار کرنے کی کوشش نہ کی۔

بظاہر وہ ہماری بھی اماں تھیں۔ مگر ان سے محبت صرف شفاعت بھیا کو تھی۔ باقی سب اماں کی زبان کی تیزی ان کے غصے اور حاکمیت کی وجہ سے ان سے دور بھاگتے تھے اور اماں بھی ہماری تو خوب گوشمالی کرتیں۔

مگر ان کے ماتھے کی ساری سلوٹیں شفاعت بھیا کو دیکھ کر یوں گم ہو جاتیں جیسے تھی ہی نہیں۔ شفاعت بھیا کی مسکراہٹ بھی اماں کو دیکھ کر اتنی ہی گہری ہو جاتی تھی۔

میں نے اماں کو نرم یا دھیمے لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا۔ بڑے بھیا تو اسی وجہ سے شادی کے چھ ماہ بعد ہی الگ رہنے لگے تھے۔ ان کی بیوی سے اماں کے ناز نخرے نہیں اٹھائے گئے تھے۔

جب بڑے بھیا کی شادی ہوئی میں اس وقت سیکنڈری کلاس میں گیا تھا۔ عائشہ باجی بھاگی بھاگی آئی تھیں۔

ناولٹ



"راحت! اماں' عنایت بھیا کی شادی کر رہی ہیں۔"

"شادی۔۔۔ وہ کیا ہوتی ہے؟" اس زمانے میں سب گھروں میں صرف پی ٹی وی آیا کرتا تھا جبکہ ہمارے گھر میں ٹی وی بھی نہیں تھا۔ میری معصومیت بجا تھی۔ عائشہ باجی یوں خوش ہو رہی تھیں جیسے انہیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

"شادی۔۔۔ وہ ہی جو ابا کی اماں سے ہوئی تھی۔ اسی طرح عنایت بھیا کی دلہن آئے گی۔"

"ابا کی اماں سے شادی ہوئی تو وہ "اماں" بن گئیں۔ عنایت بھیا کی دلہن ہماری کیا کہلائے گی؟" میرا اگلا سوال تھا۔ عائشہ باجی میرے قریب بیٹھ گئیں۔

"بھابھی۔۔۔ وہ ہماری بھابھی کہلائے گی۔ انی خالہ کہتی ہیں بھابھی ماں کی طرح ہوتی ہے۔۔۔ جیسے ماں' ویسے بھابھی۔"

مجھے آج بھی یاد ہے' میں نے اپنی آنکھیں تکلیف سے میچ لی تھیں۔ میں جس پرانی ٹوٹی ہوئی گاڑی سے کھیل رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے آپ سے دور کر دیا تھا۔

"مجھے نہیں چاہیے بھابھی۔۔۔" عائشہ باجی حق دق مجھے دیکھنے لگیں۔

"بھابھی تو اچھی ہوتی ہیں۔" اجمل بھیا میرے پاس آگئے۔ اجمل بھیا شفاعت بھیا سے چھوٹے اور عائشہ باجی سے بڑے تھے۔ میں نے ان کے پیار سے تھامے ہاتھ جھٹک دیے۔

"نہیں اچھی ہوتیں۔ عاشی باجی کہتی ہیں' جیسی اماں' ویسی بھابھی۔ مجھے ایک اور اماں نہیں چاہیے۔ گھر میں ہر وقت شور نہیں چاہیے۔"

رات کو عنایت بھیا نوکری سے لوٹے تو سیدھے میرے کمرے میں آگئے۔ میں گم صم چارپائی پر لیٹا تھا۔

"راحت! کیا سوچ رہے ہو۔" میں نے ان کی شکل دیکھ کر کروٹ بدل لی۔

"مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔" میرا انداز نروٹھا تھا۔ عنایت بھیا میرے قریب بیٹھ گئے۔

"تمہیں کہانیاں سننے کا شوق ہے نا؟" انہوں نے میری ٹوٹ بٹوٹ' عمر عیار کی زنبیل سے سجے بکس ریک کی طرف دیکھ کر جملہ خیر سگالی ادا کیا۔ میں نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔

"آپ مجھے بے وقوف نہ بنائیں۔ اماں نے آج تک مجھے ایک بھی کہانی نہیں سنائی اور وہ ٹی وی نہ لانے کی ضد پر بھی ایسے اڑی ہوئی ہیں' جیسے ٹی وی کوئی بھوت ہو' جو سب کچھ بدل کر رکھ دے گا۔" عنایت بھیا مسکرانے لگے۔

"ٹی وی اگلے ماہ لا رہا ہوں میں۔ صفیہ کو ٹی وی دیکھنے کا بہت شوق ہے۔" میرا منہ اور پھول گیا۔ ٹی وی بھابھی کے لیے لا رہے تھے۔ یہ تو اماں سے بھی آگے تھیں' اپنی بات منوانے کے حوالے سے۔"

"صفیہ بہت پیار دے گی تمہیں۔ وہ میتھس میں بھی بہت اچھی ہے۔ تمہیں اس سے کافی مدد ملے گی۔" عنایت بھیا ساری باتیں ڈھونڈ ڈھونڈ کے لا رہے تھے۔ جن سے میرے اور صفیہ بھابھی کے تعلقات اچھے ہو سکتے۔

"شفاعت بھائی کو پتا ہے یہ بات؟" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"شفو۔۔۔ اسے کیسے نہیں پتا ہوگا' اماں کا چمچہ ہے وہ۔" عنایت بھیا نے شرارت سے کہا تھا۔

اور یوں صفیہ بھابھی دلہن بن کر آگئیں۔ ان کا نکھرا نکھرا روپ میری طبع نفاست کو بہت فرحت بخشتا تھا۔ وہ شوخ اور چنچل سی تھیں۔ اماں کو ان کا یہ انداز زیادہ پسند نہیں تھا۔ مگر مجھے ان کا ہر انداز پسند تھا۔ وہ محبت جو ہمیشہ اماں سے ملنے کی توقع رہتی تھی' وہ صفیہ بھابھی سے مل رہی تھی۔

مگر اماں کا رویہ ناقابل برداشت تھا۔ صفیہ بھابھی کے ہر کام میں نقص ہی نظر آتے تھے۔

"بہت زیادہ نہ ہنسو۔۔۔ ٹی وی کی آواز کم رکھو۔۔۔ گھر میں گانے نہیں بجیں گے۔۔۔ پائل کی آواز بہت بری ہوتی ہے۔"

میں اماں کو نظر بچا' بچا کے گھورتا رہتا' کیونکہ ایک بھی کام ایسا نہیں تھا' جو میرے ننھے سے ذہن کے لحاظ سے برا ہوتا۔ صفیہ بھابھی اماں کے پیٹھ پیچھے بڑبڑاتی رہتیں' ان کے سامنے مسکراتی "جی اماں۔ جی اماں۔۔۔" کی گردان کرتی رہتیں۔

شفاعت بھیا صفیہ بھابھی سے دور رہتے۔ ان کی کل کائنات صرف اماں تھیں۔ دنیا ادھر سے ادھر ہو جاتی' مگر شفاعت بھیا کا محور گول گول اماں کے گرد پھیرے لیتا رہتا۔ یہاں تک کہ بڑے بھیا کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ وہ صفیہ بھابھی کے ساتھ شفٹ ہو گئے اور میرا دل اس گھر میں رہنے کو کرنے کے لیے ہمکنے لگا جہاں صفیہ بھابھی تھیں۔

اور اماں تھیں کہ روز فون کر کے۔۔۔ وہاں بھی ان کا ناطقہ بند کر دیتیں۔ "یہ کھایا کرو۔ وہ پیا کرو۔"

میں چڑ جاتا تھا۔ کاش! میں اماں کو صفیہ بھابھی کی زندگی سے غائب کر دیتا مگر پھر شفاعت بھیا کا کیا ہوتا۔ یکدم دھیمی مسکراہٹ والے شفاعت بھیا آنکھوں میں تیر جاتے۔ ان کی تو دنیا ہی لٹ جاتی۔ میں سوچتا رہتا۔

پھر اچانک پتا چلا۔ اماں کراچی چلی گئیں۔ مجھے صفیہ بھابھی پر ترس آنے لگا۔

ایک رات میں سو رہا تھا' جب عاشی باجی نے مجھے سوتے میں سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا تھا۔

"راحت۔۔۔ سنو نا۔۔۔ راحت!" میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں میں نیند بھری تھی۔

"کیا ہو گیا ہے عاشی باجی! اتنی رات کو کیوں جگایا ہے؟"

"ایک اچھی خبر ہے۔ اپنی صفیہ بھابھی ہیں نا' ان کے ہاں منا آیا ہے۔"

"منا آیا ہے۔ کہاں سے آگیا؟" عاشی باجی جزبز ہو گئیں مگر پھر سنبھالا لے کر بولیں۔

"ان کے پاپا نے انگلینڈ سے بھیجا ہے۔ بہت پیارا ہے۔ اماں بتا رہی ہیں' بالکل عنایت بھیا پر گیا ہے۔" میں حیران پریشان رہ گیا۔

"صفیہ بھابھی کے ابا نے انگلینڈ سے بھیجا ہے تو وہ عنایت بھیا جیسا کیسے ہو گیا؟" عاشی باجی نے میرے سر پر دھپ لگائی۔

"ہو گیا ہو گا کسی طرح۔ تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟ اماں بتا رہی تھیں' اتنے گلابی گلابی ہاتھ پیر ہیں اس کے' اتنی بڑی بڑی آنکھیں ہیں کہ مانو سمندر۔۔۔"

"وہ منا ہے کہ جغرافیہ۔۔۔" میں بے وقوفی سے ہنسنے لگا۔

مگر دو ماہ بعد جب عنایت بھیا' صفیہ بھابھی اور منے کو بھی ساتھ لائے تو میری چیخیں نکل گئیں۔

"منا اتنا پیارا ہوتا ہے۔ مجھے تو لگتا تھا' عاشی باجی بس کہانیاں سنا رہی ہیں۔"

اس دن پہلی بار شفاعت بھیا اور اماں کی آنکھوں

میں' میں نے مسکراہٹ اور خوشی دیکھی۔ شفاعت بھیا بھاگ بھاگ کر صفیہ بھابھی کے کام کر رہے تھے تاکہ کچھ دیر وہ منے کو اپنی گود میں لے سکیں۔

"اماں! صفیہ بھابھی کو کہیں نا' یہیں رک جائیں۔ ابھی تو منے سے میرا دل بھی نہیں بھرا۔" کھانا کھاتے شفاعت بھیا نے منت کی۔ عاشی باجی بھی لقمہ لیتے لیتے اماں کو امید سے دیکھنے لگیں اور میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کہ صفیہ بھابھی کے ساتھ رہوں گا۔

"کہہ کر دیکھتی ہوں عنایت سے' مگر مجھے امید نہیں ہے کہ وہ مانے گا۔" اماں نے گہری سانس لی۔

"کیوں نہیں مانیں گے؟ آپ کہہ کر تو دیکھیں۔" عائشہ باجی کے لہجے میں شفاعت بھیا سے کہیں زیادہ منت سمٹ آئی تھی۔

پھر شام گئے ملنے ملانے سے فارغ ہو کر وہ آنگن میں پڑے تخت پر آکر بیٹھے ہی تھے کہ باتوں باتوں میں اماں نے یہ بات بھی کر دی اور شفاعت بھیا کا نام یوں لیا' جیسے ان کی بات ٹالنا گناہ تھا۔

عنایت بھیا نے وہ بات دوسری باتوں میں گم کر دی' مگر جب میں رات کو منے کو لینے کے لیے ان کے کمرے کی طرف گیا تو مجھے باہر ہی سے صفیہ بھابھی کی آواز سنائی دی۔ وہ عنایت بھیا سے تیز لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ مجھے ان کے لہجے پر حیرت ہوئی۔

"آپ کے گھر والوں میں ایٹی کیٹس نہیں... اٹھنے بیٹھنے کی تمیز ہے' نہ بات کرنے کا سبھاؤ... میں اس ٹپیکل ماحول میں اپنے حاتم کی پرورش نہیں کر سکتی۔ کیسے ایک ہی پلیٹ میں جانوروں کی طرح کھاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی اترنیں پہنتے ہیں۔ عنایت! آپ کیوں چاہتے ہیں جیسا بچپن آپ نے گزارا ہے' میرا بیٹا بھی ویسی ہی زندگی گزارے؟ پڑھے لکھے ماں باپ کا ہو کر بھی وہ راحت جیسا' اجمل جیسا بچہ بنے؟"

میرے قدم وہیں رک گئے میں نے خود کو ٹٹول کر دیکھا۔ مگر کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ عنایت بھیا کی منمناہٹ میرے کانوں کو بہت بری لگ رہی تھی۔

صفیہ بھابھی پھر تیز آواز میں مخاطب ہوئیں۔

"شفاعت... شفاعت... آخر ہے کیا شفاعت؟ خود کو اماں کا چمچہ بنا کر سمجھتا ہے ساری کی ساری اماں اسی کی ہیں۔ ان کی ایک ایک مرضی پر صرف اس کا حق ہے۔ پہلے نہیں کہا' مگر اب کہے دیتی ہوں' مجھے اس گھر سے شفاعت کی وجہ سے ہی جانا پڑا تھا۔"

"شفاعت کی وجہ سے کیوں؟" بھیا کا لہجہ حیرت انگیز تھا اور میرا چہرہ ان کی اس حیرت سے دنگ رہ گیا۔

"وہ سمجھتا ہے' وہ اماں کے بعد اس گھر کا والی وارث ہے۔ ابھی سیکنڈ ایر نہیں کیا' مگر کیسے اجمل' عائشہ' سلمٰی پر رعب گانٹھتا ہے۔ کبھی اس کی نظر میں آپ کے لیے عزت نہیں دیکھی میں نے۔"

"مگر اس نے کبھی مجھ سے بدتمیزی بھی نہیں کی۔ مانتا ہوں وہ اماں کا چمچہ ہے' مگر ہمیشہ مجھ سے دھیمے لہجے میں بات کرتا ہے۔ میری آواز پر اپنی آواز کو اونچا نہیں ہونے دیتا۔"

"مگر آپ نے دیکھا ہے' وہ اس چال بازی سے اپنے من پسند فیصلے کروا ہی لیتا ہے؟ کوئی بھی اس کے اثر سے نہیں بچ سکتا۔ وہ ایک برگد کا درخت ہے' جس کے نیچے اگنے والے سارے پیڑ پودے جل جاتے ہیں اور مجھے اپنے بیٹے کو الگ طرح سے پالنا ہے۔ مجھے روک ٹوک' اپنی مرضی ٹھونسنے کی عادت نہیں ڈالنی اپنے حاتم میں۔" عنایت بھیا کچھ دیر چپ رہے' مگر پھر کچھ یاد آنے پر بولے۔

"مگر اماں کی جس جس بات پر تم دل گرفتہ ہوتی تھیں' صرف وہ ہی تو تمہاری دل جوئی کرتا تھا۔ تمہیں اپنی مرضی پوری کرنے کے لیے راستہ نکالنا اسی نے سکھایا ہے۔ تمہیں اماں نے ٹیپ ریکارڈر چلانے سے روکا تھا تو وہ ہی تو تمہارے لیے واک مین لایا تھا۔ اماں نے تمہاری پائل کی چھن چھن پر اعتراض کیا تو اسی نے تمہیں سنار سے ایسی پائل لا کر دی جو دیکھنے میں تمہاری پائل جیسی تھی' مگر اس میں چھن چھن نہیں ہوتی تھی... اور پھر ایک دفعہ..."

"بس کر دیں۔ آپ نے تو شفاعت نامہ ہی شروع

کر دیا۔ اس نے کچھ اچھا کیا ہے تو کیا ضروری ہے' ہر وقت اسے گایا جائے؟ میں اس وقت نئی نئی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اماں سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے شفاعت سے بنا کر رکھتی تھی تاکہ اماں کا منہ نہ پھول جائے' مگر کسی چیز کو زبردستی قبول کرنے اور مرضی سے قبول کرنے میں فرق ہوتا ہے۔"

عنایت بھیا کچھ نہ بولے میں پلٹا اور بت بن گیا۔ شفاعت بھیا سامنے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے' مگر مجھے شفاعت بھیا سے کوئی ہمدردی نہیں ہوئی۔

ٹھیک تو کہتی ہیں صفیہ بھابھی۔ ہر کسی کو شفاعت بھیا سے کوئی نہ کوئی شکایت ہے اور وہ شکایت بے معنی بھی نہیں۔ شفاعت بھیا واقعی آسان زندگی کو مشکل بنا دیتے ہیں۔

"راحت..." وہ دبے قدموں میرے پیچھے چلنے لگے۔ "کیا میں ایسا ہوں..."

میں نے پلٹ کر انہیں سر سے لے کر پیر تک دیکھا۔

"اس سے بھی زیادہ ناقابل برداشت... جتنا صفیہ بھابھی نے کہا۔"

شفاعت بھیا نے دیوار سے ٹیک لگا لی۔ مجھے لگا' وہ چیخیں گے' چلائیں گے' مگر وہ دھیمے سے بولے۔

"اچھا! پھر ایسا ہی ہو گا۔" کہہ کر وہ مڑ گئے۔

اور بستر پر لیٹنے کے بعد میرے دل کو کچھ ہوا۔

"یہ میں نے شفاعت بھیا سے کیا کہہ دیا۔" میں اٹھ کر بیٹھ گیا' مگر یہ شرمندگی نہیں ڈر تھا۔ اماں کے چمچے یعنی شفاعت بھیا نے میری اور صفیہ بھابھی کی شکایت اماں سے لگا دی تو میری تو جگہ اس گھر میں بچے گی ہی نہیں۔

ساری رات میں سو نہیں سکا۔

اماں فجر میں ہی میرے سر پر آکر کھڑی ہو گئیں۔

"اٹھ جاؤ نواب زادے! غلطی سے مسلمان گھر میں پیدا ہو گئے ہو۔"

اور شرمندگی کا احساس مجھے اسی انداز میں دلایا جاتا

اس لیے مجھے اماں اچھی لگتی تھیں' نہ یہ گھر۔ صفیہ بھابھی کا گھر میرے خیالوں میں چھا گیا تھا۔ باتوں باتوں میں صفیہ بھابھی نے ابا کی چند ایکڑ زمین اور دو باغوں کا حساب کتاب شفاعت بھیا سے پوچھا تو اماں کو پتنگے لگ گئے۔

"صفیہ بی بی! اس کا حساب کتاب میں جانوں یا میرا شفاعت۔ تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی؟ کیا اب بھائیوں' بھائیوں کے بیچ زمین کو لا کر دیوار اٹھا دو گی؟"

عنایت بھیا کی منمناہٹ سنائی دی۔ "نہیں نا اماں جی! صفیہ حساب کتاب میں گولڈ میڈلسٹ ہے۔ وہ تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ شفاعت کو اگر کہیں کوئی الجھن ہے تو وہ حل کر دے۔"

شفاعت بھیا نے اماں کا ہاتھ پکڑا اور اماں کے چہرے پر غصے کا گراف ایک دم نیچے اترنے لگا' جیسے شفاعت بھیا ٹھنڈے میٹھے پانی کا دریا ہوں۔ جسے ہلکا سا چھو لینا ہی اماں کے غصے کے سمندر کو ٹھنڈا اور پرسکون کر دیتا ہو۔

"بھابھی ٹھیک کہتی ہیں اماں! گھر کے معاملات کم از کم تین چار بندوں کو معلوم ہونے چاہئیں۔ عائشہ اور سلمٰی تو دلچسپی نہیں لیتیں۔ اجمل کو آپ نے فوج میں بھیج دیا۔ پیچھے بچے' عنایت' صفیہ بھابھی ہمیں اور آپ۔ اگر کل کو مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو کوئی اور تو ہونا چاہیے نا جو آپ کی مدد کر سکے۔"

"ہاں ہاں! جاؤ۔ تم بھی مر جاؤ۔ میں تو سدا کی گناہ گار ہوں نا! آخری وقت تک قیامت کے بورے سمیٹتی رہوں گی۔" شفاعت بھیا نے اماں کو اپنے چوڑے سینے میں چھپا لیا۔

"اماں! سمجھا کریں۔ میں صرف فرض کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ میں واقعی تھوڑی مر رہا ہوں۔ آپ بہت جلد ہمت ہار دیتی ہیں۔" اماں وہیں بیٹھ گئیں اور ان کا رونا شروع ہو گیا۔

"کیا کروں... جب سے تمہارے ابا یہ ذمے داریاں میرے سر ڈال گئے ہیں' میرے تو حواس ہی ہونق رہتے ہیں۔ یہ نہ ہو جائے' وہ نہ ہو جائے۔ ہر

وقت دل دھڑکتا ہی رہتا ہے۔"

مجھے اماں پر غصہ آگیا تھا۔ اچھا خاصا میلوڈراما تھیں اماں۔ جہاں موقع "نکلتا" نہیں "نکلتا" ڈراما شروع ہوجاتا۔ ورنہ یہی اماں تھیں، ہر وقت ابا سے لڑتی جھگڑتی ہوئی نظر آتی تھیں یہاں تک کہ جب ابا دنیا سے جارہے تھے، تب بھی انہوں نے سکھ کا سانس نہیں لینے دیا تھا۔ جائیداد کی منتقلی کے بکھیڑے لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ مجھے تو ابا کے زندہ رہنے سے ان کے مرنے پر ترس آیا تھا۔ میں نے پھر برا سا منہ بنا کر اماں کو دیکھا اور اسی وقت اماں کے "ونڈر بوائے" سارے کھاتے اٹھا لائے۔

صفیہ بھابھی جیسے جیسے کھاتے دیکھتی جاتیں، حساب کتاب سخت ہوتا جارہا تھا۔ شفاعت بھائی مانو کٹہرے میں لاکر کھڑے کردیے گئے تھے۔

"یہ ساری زمین کس کے نام ہے؟" صفیہ بھابھی نے سوال کیا اور اماں کی آنکھیں ماتھے پر آگئیں۔

"تمہیں اس زمین کے حساب کتاب سے بھی مطلب نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شفو نے کہا تو میں نے تمہیں دکھا دیا، مگر زمین کس کے نام ہے، کس کے نہیں، اس سے تمہیں کیا سروکار۔"

عنایت بھیا جز بز ہونے لگے۔ گھبراہٹ واضح تھی۔ صفیہ بھابھی نے واقعی ایک غلط بات کر ڈالی تھی، مگر صفیہ بھابھی ڈری تھیں، نہ گھبرائی تھیں۔

"پرانے زمانے میں ہوتا ہوگا یہ سب کہ ساری ذمہ داری ایک کے سر ڈال کر سکون سے ہوگئے۔ سب پڑھ لکھ رہے ہیں تو کس کے لیے؟ اماں سب کی زمینیں ان کے نام رجسٹر کروائیں اور خود کو اس گورکھ دھندے سے نکالیں۔ جس کی زمین ہے، وہ خود سنبھالے نا! آپ کہاں اپنے بڑھاپے کو بے آرام کیے پھرتی ہیں؟"

"ہاں ہاں اماں۔۔۔" عنایت بھیا نے سنبھالا لیا اور اماں نے ماضی کی طرح جوتی عنایت بھیا کے کھینچ ماری۔

"جورو کے غلام! تیری اپنی سمجھ بوجھ بھی کام کرتی ہے کہ نہیں؟"

عنایت بھیا کا چہرہ سرخ ہوگیا اور میرا چہرہ ان کی اور بھابھی کی بے عزتی کرنے پر تن گیا۔ بھابھی غصے میں اٹھ کر چلی گئیں اور عنایت بھیا اماں کے ہاتھ پکڑے بیٹھے تھے۔

"آپ غلط نہ سمجھیں۔ مجھے زمین جائیداد سے کوئی سروکار نہیں اماں! آپ جانتی ہیں۔"

اماں نے چشمے کی اوٹ سے عنایت بھیا کو پرکھا۔ سچ جھوٹ کی کسوٹی لگائی اور غصے سے بولیں۔

"پھر تری بیوی کہاں سے سیکھ کر آئی ہے یہ سب؟ اسے مال و دولت سے سروکار تیرے سروکار سے زیادہ لگتا ہے۔ بڑی لوبھی ہے بھئی تیری بیوی۔" عنایت بھیا کچھ کہے بغیر اٹھ گئے۔ پھر دوسرے دن میں حاتم کے ساتھ کھیل رہا تھا، جب چھت پر بیٹھے بیٹھے صفیہ بھابھی عنایت بھیا پر پھٹ پڑیں۔

"اسی لیے نہیں آتی میں یہاں۔ آپ کے گھر والوں کو آپ سے مطلب ہے، نہ آپ کی اولاد سے۔ نہ آپ کے آنے کی خوشی ہے۔ سارے کے سارے کم بخت لالچی ہیں۔"

"ہا ہا آں۔۔۔ یہ کیسی زبان بول رہی ہیں آپ؟ یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔" صوفیہ بھابھی کی بڑی بڑی آنکھوں میں لال ڈورا سا دکھ آنسو بن کر تیر گیا۔

"مجھے بھی پتا نہیں تھا، میں کبھی ایسی زبان بولوں گی۔ میں کانونٹ کی پڑھی اسٹوڈنٹ کو آپ نے کہاں ان جاہلوں میں لاکر کھڑا کردیا ہے۔ یہ اماں ویسے ہر وقت اولاد کے دکھ سے تڑپتی نظر آتی ہیں، مگر اندر سے ان کی لالچ کا پیالا ہی نہیں بھرتا۔ انی خالہ بتاتی ہیں، مرتے مرتے بھی ابا کی جان نہیں چھوڑی تھی۔ جب تک انہوں نے ساری جائیداد ان کے نام نہیں کردی تھی۔"

عنایت بھیا نے خفگی سے گھورا تھا۔

"انی خالہ کا ذکر مت کرو۔ وہ تھیں تو اماں کی چچازاد، مگر ہمیشہ انہیں اماں کے رہن سہن، اچھے حالات سے چڑ ہی ہوتی رہی۔ وہ اماں کو اور ابا کو کبھی اک ساتھ ہنستے بولتے نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر اماں ذہانت سے کام نہ لیتیں تو کب کا وہ ابا سے عقد ثانی کرچکی ہوتیں۔ بیوگی کو بھی ہمیشہ انہوں نے نمائشی دکھ کی طرح چہرے پر سجا کر رکھا۔ ہمیشہ اس دکھ کا کھایا ہے انہوں نے۔۔۔ دنوں اسی گھر میں ڈیرا ڈالے رکھتی تھیں اپنے بچوں کے ساتھ۔ ان کے بچے بھی ان کی طرح آنکھ سے سرمہ چرا لینے والوں میں سے تھے، مگر اماں نے ہر گم ہونے والی چیز پر صبر کیا اور یہی کہا، شوہر کی ہمراہی کے لیے یہ بہت کم قیمت ہے۔ تمہیں پتا ہے، انی خالہ چیزیں چرا کر ان کے سامنے ہی استعمال کرتی تھیں، مگر اماں نے کبھی زبان پر اف تک نہ کیا، کبھی میں یا شفاعت کہہ بھی دیتے کہ یہ چوڑیاں آپ جیسی ہیں، جو گم ہوئی ہیں، یہ کان کی بالی یہ ہنسلی تو بالکل اسی کٹاؤ کی ہے، جو ابا نے آپ کے لیے خاص طور پر بنوائی تھی تو اماں مکر جاتی تھیں کہ "نہیں! یہ انی خالہ کی ہیں۔ تمہارے ابا نے ان کے زیور کو دیکھ کر ہی میرے لیے ـــــ بنوائی تھی۔" انی خالہ مسکراتی رہتیں اور اماں۔۔۔" عنایت بھیا مڑے۔

صوفیہ بھابھی واک مین کان میں لگائے جھوم رہی تھیں۔ عنایت بھیا کو پہلی بار میں نے غصے میں دیکھا انہوں نے واک مین ان کے کان سے نکال کر انہیں گھورا۔

"تمہیں لگتا ہے، میں اب تک جھک مار رہا ہوں۔ بکواس کرتا رہا ہوں؟"

"پتا نہیں مگر مجھے یہ پتا ہے کہ مجھے آپ کے "اماں نامے" میں کوئی دلچسپی نہیں۔" صوفیہ بھابھی نے کندھے اچکا دیے۔

پھر جس شام انہیں کراچی کے لیے نکلنا تھا، وہ ٹیلی فون پر بیٹھی ہوئی کسی سے کہہ رہی تھیں۔

"بس! کیا بتاؤں ممّا! اس گھر میں سارے سنکی اور خبطی لوگوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا، کانونٹ میں پڑھنے والے، سول سروس میں ایٹی پرسنٹ آئی کیو لیول پیچ جیتنے والے عنایت ایسے گھر میں رہتے ہیں۔ سب کچھ بس سمجھیے شفاعت کے انڈر ہے۔ کل اماں کی آنکھ بند ہوئی تو شفاعت نے تو سب کو ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دینا ہے۔۔۔ نہیں ممّا! مجھے یہ کنزرویٹو اور لو مینٹیلٹی پرسنز کے ساتھ نہیں رہنا۔ میں واپس آرہی ہوں شام میں۔ حاتم بھی اپ سیٹ ہوگیا ہے یہاں کے ماحول سے۔ سب نے بچے کو چوما چاٹی کرکے اسپائلٹ کرکے رکھ دیا ہے۔"

پھر پتا نہیں وہ جارہے تھے، جب اچانک میں نے ضد شروع کردی، مجھے عنایت بھائی کے ساتھ جانا ہے۔ عائشہ باجی حیران پریشان تھیں۔

"وہاں اماں نہیں ہوں گی۔" شفاعت بھیا نے ڈرایا۔ میں اور شیر ہوگیا۔

"میں رہ لوں گا اکیلا۔ مجھے کراچی میں پڑھنا ہے۔"

عنایت بھیا نے اماں کی طرف دیکھا۔

"جاتا ہے تو لے جاؤ۔ مجھے تو اس سے پہلے بھی کوئی اچھی امید نہ تھی۔" اماں کی سخت رائے میرا منہ چڑا رہی تھی۔

صوفیہ بھابھی کمرے میں جاکر چیزیں اٹھا پٹخ کرنے لگیں۔

"اب یہ نئی کیا سوجھی؟ ایک نئی ذمہ داری۔۔۔ میں کہے دیتی ہوں، میں حاتم کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالنے دوں گی۔ آپ کی ذمہ داری، آپ کی توجہ صرف حاتم کے لیے ہونی چاہیے۔"

"تم بے فکر رہو۔ میں تمہیں شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

میں چھوٹا سا بیگ تھامے، جو عائشہ باجی نے تیار کر کے دیا تھا، وہیں سے واپس پلٹ آیا۔

"مجھے نہیں جانا عنایت بھیا کے ساتھ۔۔۔"

"اے لڑکے! تمہاری کوئی ایک زبان ہے کہ نہیں؟" اماں نے گھورا اور میں بے دھڑک ان پر چلّا پڑا۔

"آپ کو رکھنا ہے واپس گھر میں یا ضد کرنے کے جرم میں ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکالیں گی؟"

"ماں سے بات کرنے کی تمیز نہیں تمہیں؟" اماں نے میرے قد کا خیال کیے بغیر مجھ پر تھپڑ برسانا شروع

کر دیے۔ شفاعت بھیا بیچ میں آگئے۔

"اماں! چھوٹا ہے' نا سمجھ ہے' اتنا نہیں مارتے۔" اماں کے مشینی انداز میں چلتے ہاتھ یکدم رک گئے۔ جیسے اماں کا ریموٹ کنٹرول بس شفاعت بھیا کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ پوری دنیا جو کہتی ہے' بکواس کرتی ہے' جو کام کرتی ہے' بھاڑ جھونکتی ہے۔

مجھے عنایت بھیا سے کم شفاعت بھیا سے خدا واسطے کا بیر اور نفرت محسوس ہونے لگی۔ اس دن مجھے لگا تھا صفیہ بھابھی کہیں غلط تھیں تو بہت سی جگہوں میں ٹھیک بھی تھیں۔ شفاعت بھیا اماں کے راج دلارے تھے۔ ان کی غلطی بھی اماں کو حد سے بڑھا ہوا ایثار نظر آتی تھی اور ہمارا ایثار بھی اماں کو شک میں لپٹا ہوا غرض سے پُر دکھائی دیتا۔

"مجھے اماں سے نفرت ہے۔ مجھے شفاعت بھیا سے نفرت ہے۔" میرے دل نے کہا اور میرے دماغ نے یہ بات من و عن تسلیم کرلی۔ میرا وقت اب گھر سے باہر گزرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

اس دن میں جیسے ہی گھر میں آیا — شفاعت بھیا کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

"عائشہ.... ادھر آئیں۔ آپ کو پتا بھی ہے امی کا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے' پھر بھی انہیں مشین لگانے دی؟"

عائشہ باجی کی جگہ سلمٰی آپا دوڑی آئیں۔ شفاعت بھیا اماں کو بیڈ پر لٹا رہے تھے۔

"ہونہہ! ہم سب چارپائی پر۔ اماں کے لیے وال ٹو وال کارپٹ اور یہ آرام دہ بیڈ۔" مجھے ایک پرانے غم نے نئی طرح سے چٹکی کاٹی۔

شفاعت بھیا ٹیلی فون کرکے ڈاکٹر انکل کو بلا رہے تھے۔ وہ بی پی آپریٹس سے بی پی چیک کر چکے تو دوا دینے کے لیے آمادہ کرنے لگے' مگر اماں بلا کی ضدی۔ میں نے گردن موڑ کر حالات دیکھے اور پھر سے کارٹون دیکھنے لگا۔ میں بڑا تھا' مگر بچہ بن گیا تھا۔ شاید میں اس منظر سے جان کر بھاگنا چاہ رہا تھا۔ خاص طرح کی بے حسی طاری ہو گئی تھی مجھ پر۔ مجھے اماں سے لگاؤ ہی نہیں رہا تھا۔

"تم بے حس ہو گئے ہو یا بن رہے ہو؟" شفاعت بھیا نے ٹی وی بند کر دیا اور میں نے گھور کے انہیں دیکھا۔

"کیا کوئی اس گھر میں اپنی مرضی سے کام کر سکتا ہے؟" میں نے ٹی وی پھر کھول لیا۔

"راحت! اماں کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر انکل کہہ رہے ہیں' انہیں پرسکون ماحول چاہیے۔" میں نے ٹی وی بند کر دیا۔

"پرسکون ماحول ان کو ہی ملتا ہے' جو پرسکون ماحول کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اماں جیسے لوگ نہیں۔ ہر وقت کل کل۔ زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔"

"راحت۔" زندگی میں پہلی بار شفاعت بھیا نے میرا بازو پوری قوت سے بھینچا تھا۔ ان کی آواز تیز نہیں تھی' مگر لہجہ ضرور تیز تھا۔ ایک لمحہ کے گھورنے سے میرے دل کی ساری دنیا تلپٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ شفاعت بھیا کو میں نے کب اتنے غصے میں دیکھا تھا۔

"اگر اجمل بھیا ہوتے نا تو دو تین ہاتھ جڑ دیتے پوری بتیسی باہر نکلی ہوتی۔ چھوٹے بڑے سے بات کرنے کی تمیز نہیں رہی تمہیں۔" سلمٰی آپا نے خفگی بھری محبت سے میرے بالوں کو چھوا اور میں نے ان کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"شفو بھیا اماں کے چمچے اور آپ سب شفو بھیا کی چمچیاں۔ مجھے کسی سے بات نہیں کرنی۔"

میں گھوم کر گھر کے پچھلے حصے میں نکل گیا' جہاں تخت پڑا ہوا تھا۔ ساری سردیاں اوک میں دھوپ بھر کر صرف اسی حصے کو بھگونے آیا کرتی تھی' مگر ابھی سردی نہیں تھی۔ میں نیم کے درخت کے نیچے بچھے تخت پر بیٹھ گیا۔ نیم کے درخت سے اماں کے کمرے کی پوری کھڑکی باتیں کرتی تھی۔ چاند کھڑکی پر ہوتا تو زور زور سے دستک دے کر کھڑکی سے بات کرتا۔

مگر اماں جیسے سرد مزاج' حس لطیف سے خالی لوگوں کے لیے چاند کو نکا ہی بھلا لگتا تھا۔ شفاعت بھیا صاف نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے اماں کا ہاتھ یوں پکڑا ہوا تھا جیسے ڈاکٹر کا انجکشن اماں کو نہیں' شفو بھیا کو لگنے لگا تھا۔

"ہونہہ! ڈرامے باز۔ نوٹنکی۔" میں باہر بیٹھ بیٹھ کر اپنی زبان' لہجہ سب بھول گیا۔ میں نے اپنے گلی کے یار عبدل کی طرح زمین پر تھوکا بھی تھا۔ عموماً" وہ ایسا اس شخص کو دیکھ کر کرتا تھا' جس سے وہ نفرت کرتا تھا اور مجھے شفاعت عرف شفو بھیا سے شدید نفرت تھی۔

میں دیکھے جا رہا تھا۔ اماں نے آنکھیں بھینچ لی تھیں۔ میں دبے قدموں چلتا اماں کی کھڑکی کے نیچے بیٹھ گیا۔

"اماں! سن لیں ڈاکٹر انکل کیا کہہ رہے ہیں۔ کل جانا ہے آپ کو میرے ساتھ ٹیسٹ کروانے۔ خون بھی ٹیسٹ ہوگا اور ای سی جی بھی کروا کے دل کی پٹی بھی نکلوانی پڑے گی۔ آج آپ کا بی پی بہت ہائی تھا کچھ بھی ہو سکتا تھا آج۔" پھر اماں کی نوٹنکی آواز میرے کانوں میں چبھنے لگی۔

"مجھے عنایت کا دکھ ہوتا ہے۔ کیسا ہیرے جیسا لڑکا صفیہ جیسی چڑیل کے سر منڈھ دیا میں نے۔ بس سوچا تھا' پڑھی لکھی لڑکی ہے' گھر کو سنبھال لے گی' مگر اس نے تو پورے گھر کو ہی تتر بتر کر چھوڑا ہے۔ اجمل اتنی دور ہے مجھ سے اور یہ چھوٹا تو مانو' ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔ کسی کی نہیں سنتا۔ کسی کو کچھ نہیں مانتا۔"

"کچھ نہیں ہوا ہے اے اماں! بچہ ہے۔ اس عمر میں بچے ایسے ہی ضدی خود سر ہو جاتے ہیں۔ اجمل بھی تو ایسا ہی تھا۔ سلمٰی باجی بھی کتنا تنگ کرتی تھیں' مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو گیا نا! وہ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ بس تھوڑا الگ ہے' مگر بہن بھائیوں میں اتنا فرق تو چلتا ہی ہے' ورنہ ایک جیسے مزاج سے دل اوب نہ جائے۔ اجمل غصیلا ہے' عنایت بھیا شیریں ہیں' میں تھوڑا نمکین اور زہریلا ہوں۔ اسی طرح وہ تھوڑا تیکھا ہے' مگر جب وہ اپنی ذمہ داری سمجھے گا تو خود سیدھا چلنے لگے گا' روک ٹوک لگائیں گی تو اڑیل گھوڑے کی طرح بدکے گا' لات مارے گا' رسی تڑانے کی کوشش کرے گا۔ اس کو اس کے مزاج سے سنبھالنا پڑے گا۔"

میں چڑ کر پھر نیم کے درخت کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔ پھر ایک ہلکی سی کنکری لگی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اوپر کی منزل کی کھڑکی پر سلمٰی آپا کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

"کیا غضب کرتے ہو راحت! ایک تو کریلا... وہ بھی نیم چڑھا۔ اماں تو باؤلی ہو جائیں گی تمہیں سدھارنے میں۔"

"ہاں! آئی بڑی ثریا بھوپالی۔" میں نے کانوں پر ہاتھ لے جا کر انہیں چڑایا اور وہ دو منٹ میں نیچے تھیں۔

"کیا کہا' کون ثریا بھوپالی؟"

مجھے ان کا گانا پسند نہیں تھا۔ ایک بار چھپ کر دوستوں کے ساتھ اداکارہ رانی کی فلم دیکھی تھی' تب سے جہاں سلمٰی آپا کی پٹڑی بدلنے لگتی تھیں انہیں "ثریا بھوپالی" کہہ کر چڑایا کرتا۔ میں چڑائے جا رہا تھا' وہ چیخے جا رہی تھیں' جب شفاعت بھیا کی آمد ہوئی۔

"کچھ خیال ہے اماں کی طبیعت کتنی خراب ہے۔ تم دونوں ان کی کھڑکی کے قریب ہو کر اتنا شور۔"

"کھڑکی بند کر دیں۔ ہم کسی کے لیے خود کو باؤنڈ نہیں کر سکتے۔"

"کسی کے لیے۔ وہ اماں ہیں تمہاری۔" شفاعت بھیا صدمے میں تھے کہ سکتے میں' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ مجھے بس غصہ تھا تو سلمٰی آپا پر کہ وہ شفاعت بھیا سے اپنی غلطی کی معافی مانگ رہی تھیں۔ پھر وہ ڈرائنگ روم میں تھیں' جب میں نے ان کے لتے لیے تھے۔ ڈرپوک' بلیک شیپ اور پتا نہیں کیا کیا کہا اور وہ سر جھکا کر بس اتنا بولیں۔

"شفاعت بھیا صحیح کہہ رہے تھے۔ غلطی ہماری تھی۔ ہماری ایک ہی تو اماں ہیں۔ اگر ہم ان کا خیال نہیں رکھیں گے تو کون رکھے گا۔"

"آپ کی ہوں گی۔ میری نہیں۔" عائشہ باجی نے میرا کان پکڑ لیا اور یہ افتاد بالکل غیر متوقع تھی۔

"تمہاری اماں نہیں ہیں تو کیا ہم تمہیں کسی گھوری سے اٹھا کر لائے تھے؟ اماں بے اولاد تھیں کیا؟ بولو... خاک تم پر اپنی انرجی ویسٹ کی انہوں نے۔ کسی گھوری پر ہوتے ـــــ تو قدر ہوتی' نام کیا ہوتا ہے' شناخت کیا ہوتی ہے' باپ کیا ہوتا ہے اور ماں کی نرم گود کیا ہوتی ہے۔ بن مانگے سب کچھ مل رہا ہے تو تیور ہی بگڑتے جا رہے ہیں صاحب بہادر کے۔"

مجھے انتہائی بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ میں پہلی بار رویا تھا۔ اور جب میری ہچکیاں بندھ گئی تھیں تب کسی کے چوڑے سینے اور مضبوط بازوؤں کے حصار نے مجھے بھینچ لیا تھا۔

"وہ پاگل ہے اماں کی بیماری کی وجہ سے بوکھلا گئی ہے۔ میں نے اسے خوب ڈانٹا ہے کہ اماں کے چھوٹو سے پھر کبھی ایسے بات نہ کرنا۔ وہ اماں کی ہی نہیں میری بھی جان ہے۔" میں جو ہچکیوں سے رو رو کے نڈھال تھا' اپنی سدھ بدھ کھو چکا تھا' اس آواز پر کرنٹ لگنے کی رفتار سے چونکا تھا۔ شفاعت بھیا کا سینہ' ان کا دلاسا...

آئی ہیٹ یو شفو بھیا۔" میں نے یکدم چھلانگ لگا کر ان کی طرف سے منہ موڑ لیا اور انہوں نے پلٹ کر اس بے عزتی کی وجہ تک جاننے کی کوشش نہیں کی۔

☼ ☼ ☼

پھر دو سرا دن تھا جب شفاعت بھیا عائشہ باجی کو ساتھ لے کر اماں کے چیک اپ کو چلے گئے تھے۔ پھر ایک ہفتے بعد وہ اسی تخت پر ہراساں بیٹھے تھے۔ میں نے اوپر کی منزل سے دیکھا' مگر ان کا دھیان کسی کی طرف نہیں تھا۔ میں خاموشی سے کچن میں کام کرتی عائشہ باجی کے پیچھے کھڑا ہو گیا ان کے انداز میں بھی بے دھیانی پڑھی ہوئی تھی۔ فکر چہرے پر یہاں سے وہاں تیر رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے..." اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا سلمٰی آپا نے سوال داغ دیا اور میں کولر سے پانی لے کر وہیں بیٹھ گیا کہ وہ کیا کہیں گی۔

"انجیو گرافی بتائی ہے ان کے لیے ہر طرح کا صدمہ جان لیوا ثابت ہو گا۔ ان کے لیے پہلے سے بہت سے لوگ لسٹ پر ہیں' مگر انکل کی جان پہچان کی وجہ سے اماں کی انجیو گرافی اگلے ماہ کی اٹھارہ کو طے پائی ہے۔"

"اگلے مہینے کی اٹھارہ تاریخ؟"

اکتوبر کی اٹھارہ تاریخ... میرے دل کو کچھ ہوا۔ اسی دن تو ابا نے اسپتال میں محنت کرتے ڈاکٹروں کو ناکام و نامراد قرار دے دیا تھا۔

اگر ابا کی طرح اماں بھی چلی گئیں تو...

میرا بدن تپتے سورج کی شعاعوں سا جلنے لگا تھا۔ مجھے لگا تھا مجھ پر جو سائبان تھا' اس کے چاروں کھونٹے زمین سے ایک ایک انچ اوپر آ گئے ہوں اور گزرنے والے ہر دن میں اس سائبان کی میخیں باہر نکلنے کو زور مار رہی تھیں۔

میں اس دن کے بعد سے آج پہلی بار اماں کے کمرے میں گیا تھا۔ اماں نیند کی دوا کے اثر سے سو رہی تھیں اور سامنے کرسی پر شفاعت بھیا بیٹھے تھے۔ میری جان جل کر رہ گئی۔

لگتا ہے' اماں کو صرف انہوں نے اپنے نام الاٹ کروا لیا ہے۔ صبح سے لے کر شام تک اماں کے قریب رہتے ہیں۔ کسی اور کے لیے ـــــ کوئی درز رہنے ہی نہیں دیتے۔

"آ جاؤ راحت! اماں ابھی تمہارا ہی ذکر کر رہی تھیں سونے سے پہلے۔" وہ ہمہ وقت مسکراہٹ سے لیپے پوتے چہرے کے ساتھ میرے سامنے تھے اور میں طنز سے مسکرا دیا۔

"اچھا... ان کو اپنی کسی اور اولاد کی یاد بھی آتی ہے... میں حیران ہوا سن کر۔"

"یہ کیا عجیب بات کی تم نے؟ وہ ہم سب کی اماں ہیں۔ ہم سب میں ان کی جان ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان کے دل سے کوئی بچہ محو ہو جائے یا وہ کسی کو بھول جائیں۔"

"ہو سکتا ہے نا! اگر اماں کے پاس آپ جیسا ہیرے جیسا بیٹا موجود ہو... پھر کہاں یاد آؤں گا میں نافرمان'

عنایت بھیا یا اجمل بھیا' جو اتنی دور بیٹھے ہیں کہ مجھے تو اب ان کی شکل تک بھول گئی ہے۔" شفاعت بھیا پر جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہوا' اسی محبت سے بولے۔

"یہی تو فرق ہے اولاد میں اور ماں میں... سات سمندر دور بھی چلے جاؤ' ماں تب بھی ہمارے خدوخال کی ایک ایک لکیر کو اسی سرعت سے دوہرا سکتی ہے' جیسے اس نے پہلی بار جنم دینے کے بعد ہمارے چہرے کی ایک ایک لکیر کو چھو کر یاد کیا تھا۔"

"ہاں! مگر وہ مائیں دوسری ہوتی ہوں گی۔ ہماری اماں کو تو بس دولت سے غرض ہے۔ اپنی راج دھانی پر سالوں سال حکمرانی کے خواب کے علاوہ ان کی آنکھوں میں اور کسی چیز کا عکس نہیں... نہ میرا نہ آپ کا اور نہ کسی اور کا۔" میں باہر آ گیا۔ شفاعت بھیا کی آنکھیں بجھ گئیں۔

اور تھوڑی دیر بعد میں باہر پڑے جھولے میں بیٹھا کلس رہا تھا۔

"آخر ہماری اماں کو دولت کی اتنی طمع کیوں ہے۔ نہ کبھی گھر پر لگایا' نہ ہم پر۔ بس بینک بھرے جا رہی ہیں۔ صفیہ بھابھی جب یہاں تھیں تو زمینوں کے آنے والے پیسوں سے انہوں نے گھر میں بدلاؤ لانے کی کوشش کی تھی' مگر اماں نے آنکھیں ماتھے پر رکھ کر صاف کہہ دیا۔

"بی بی! یہ اللّے تللّے مجھ سے برداشت نہیں ہوں گے۔ میرے سر پر میرے سائیں کا سایہ نہیں۔ اس رقم سے مجھے گھر چلانا ہے' گھر... مگر تم کیا سمجھو' بچانا لگانا' یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔"

اس دن اماں نے عنایت بھیا سے چیک بک چھین کر شفاعت بھیا کو دے دی تھی۔ نئے دستخط' نیا انسان' مگر میرے دل کا وہی پرانا دکھ اور پرانا داغ۔ آخر ایسا کیا ہے ان شفاعت بھیا میں۔ میں چڑ کر باہر آ گیا اور ایسے میں' میں ہمیشہ عبدل کے پاس جایا کرتا تھا۔

آج عبدل کسی نئے رنگ ڈھنگ میں تھا۔ مجھے دیکھ کر کترانے لگا تھا' مجھے اچنبھا ہوا۔ ہم نے سگریٹ کا دھواں ایک ساتھ اڑایا تھا۔ اور بھی کچھ غلط کام ایک ساتھ کیے تھے' مگر اب یہ ایسا کیا کام تھا' جس کی وجہ سے وہ مجھ سے کنی کترا رہا تھا۔

میں نے جتایا نہیں' مگر رضی سے اگلے دن ذکر کر دیا۔ رضی نے ناک پر انگلی رکھ کر خباثت سے مجھے دیکھا۔ میں پھر بھی نہیں سمجھا تو سر پر دھپ لگا کر بولا۔

"لڑکی کا چکر ہے۔ عبدل کسی سے پیار کرتا ہے۔"

"پیار... عبدل کی ہونے والی بیوی۔" میں نے پیار کی صحیح تعریف بیان کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہنسنا شروع ہو گیا تو رکا نہیں۔ عبدل نے آ کر وجہ جاننے کی کوشش کی اور دونوں میں ہاتھا پائی ہو گئی۔

"چل یہاں سے۔ یہ تیرے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ شفو بھائی نے اگر دیکھ لیا نا' اس چکر بازی میں تو تیرے ساتھ ساتھ میرا بھی جنازہ اٹھ جائے گا۔"

اور میرے دماغ کو ڈنک لگا تھا۔ شفو بھائی گھر سے نکل کر باہر بھی میرے کندھوں پر بیٹھے ہوئے تھے میری جان راکھ ہو گئی اور تب میں نے سوچا' جس کام سے ان کی جان جلے میں وہ کام ضرور کروں گا۔

☼ ☼ ☼

میں نے رضی کے ذریعے ایک دو لڑکیوں سے علیک سلیک کر لی۔ میں ان پر بے دھڑک پاکٹ منی لٹا رہا تھا جب میرے سیکنڈ ایئر کا رزلٹ آیا۔ شفاعت بھیا تو کیا پوچھتے' اجمل بھیا چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے۔ وہ ہی مجھ پر چڑھ دوڑے تھے۔

"یہ رزلٹ ہے...؟" اخبار انہوں نے خالص فوجی آفیسر کی طرح میرے منہ پر کھینچ مارا۔ میرا دل تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"تم کہاں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہو؟ کن چکروں میں رہتے ہو؟ پندرہ دن ہوں میں یہاں... ساری انوسٹی گیشن کر کے چھوڑوں گا۔"

میرا خوف سے دم نکلنے لگا۔ عبدل میرے ان چکروں کی وجہ سے ناراض ہو گیا تھا اور رضی ایک نمبر کا لنڈا تھا۔ اسے جو پیسہ دیتا' وہ اسی کی زبان بولنے لگتا۔ میرے والٹ میں پیسے کم تھے۔ شمو کی سالگرہ بھی

قریب تھی۔ میں جو کھم میں پڑگیا۔ شمو کو تحفہ دوں یا بے غیرت رضی کا منہ بند کرنے کی قیمت۔۔۔ اور بس میرے تابوت میں آخری کیل میری سوچوں کے برخلاف ٹھونک دی گئی۔ اجمل بھیا کے سامنے بیٹھی عدالت میں عبدل شفاعت بھیا کے سامنے بول پڑا۔

"ہم کمی کمین ہیں سرکار! مگر آپ کی عزت نجابت اور شرافت کی بات اور ہے۔ ہم کچھ کریں گے تو لوگ چونکیں گے نہیں۔ ہمارے باپ دادا نے بھی یہ ہی رذیل پن کیا ہے، مگر راحت جب سے اس رضی کی دوستی میں پڑا ہے، کوئی اچھا کام نہیں سیکھا اس نے۔"

شفاعت بھیا سنے جا رہے تھے اور میں سر پیٹ رہا تھا کہ دنیا گول ہے سنا تھا، مگر یہ گول گول گھوم کر شفاعت بھیا کے پاس کیوں لوٹ آتی تھی۔ پھر میں گھر آکر اپنی آوارگی کے نشانات مٹا بھی نہیں سکا تھا کہ شفاعت بھیا نے چھاپہ مارا۔

حرام مشروب کی دو خالی بوتلیں۔ سگریٹ کے پیکٹ، شمو کے خوش بو میں بسے خط۔

بھیا نے سب کچھ ایک کالے شاپر میں ڈالا اور باہر آگئے۔ انہوں نے ایک لفظ نہیں کہا اور اجمل بھیا ان کے چہرے سے کیا کچھ سمجھے۔ کمرا بند کر کے عدالت لگا کر بیٹھ گئے۔ "شفو بھیا کو غصہ کسی چھوٹی بات پر تو نہیں آسکتا۔ میں جانتا ہوں وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں اور اماں کی تربیت کی وجہ سے بہت نرم مزاج۔" میں نے احتجاجا" نظریں اٹھا کر دیکھا اور اجمل بھیا سمجھ گئے۔

"تمہیں پتا نہیں، خدا واسطے کا بیر کیوں ہے میری اماں اور میرے شفو بھیا سے۔"

"بس! وہ دونوں ہیں ہی اسی قابل کہ میں ان کی اپنی زندگی میں انٹری بند کردوں۔" اجمل بھیا غصے کے تیز اور کچھ کچھ ہاتھ چھٹ تھے، سو میرے منہ پر طمانچہ بہت زور سے پڑا تھا۔

"بہت احسان فراموش ہو۔ شفو بھیا نہ ہوتے ناں تو یہ عیش، آرام، یہ لگژریز نہ ہوتیں۔ اماں اگر ابا کا پیسہ جوڑ جوڑ کر نہ رکھتیں تو دیکھتا، عنایت بھیا کیسے اعلا تعلیم حاصل کرتے، کیسے عائشہ میڈیکل جوائن کرتی، سلمیٰ وکالت میں جاتی۔۔۔ اور تم اتنے ناہنجار ہو کہ ان دونوں ہستیوں کا احسان ماننے کے بجائے ان سے اتنی نفرت کرتے ہو۔"

میں کہنے کو تو ایک بار پھر جلتا بلتا مضمون پڑھ سکتا تھا ان دونوں کی شان میں، مگر فوجی ہاتھ سہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس لیے چپ رہا۔ شفاعت بھیا نے دروازے پر دستک دی تھی۔ اجمل بھیا یکدم گھبرا گئے۔

"اگر شفو بھائی کو پتا چلا ناں، میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا ہے تو سمجھ لینا، کمبل ڈال دوں گا تم پر۔"

میں سر جھکا کر بیٹھ گیا، کیونکہ جانتا تھا فوجی آمروں کے دور میں "کمبل ڈالنے" کا مطلب تھا صفحہ ہستی سے کلہتا" یا عارضی طور پر کہیں غائب کردو اور میں ابھی زمین میں دفن ہونے کا موڈ نہیں رکھتا تھا۔

شفاعت بھیا کمرے میں آئے اور بہت تیز نظری سے میرے چہرے کو دیکھا۔

"اجمل نے تم پر ہاتھ اٹھایا ہے؟" میں جز بز ہو گیا۔

"نہیں تو شفو بھیا! وہ شاید الرجی کی وجہ سے لالی آگئی ہے کل سے، بہت خارش ہو رہی تھی۔"

شفاعت بھیا نے تولنے والی نظروں سے دیکھا، پھر دھیمے لہجے میں بولے۔

"تم واقعی شمو سے محبت کرتے ہو؟" یہ سوال تو شاید میں نے کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں کیا تھا۔ شمو کو نظروں میں لے کر پہلی بار خود سے پوچھا۔

"ہاں بھائی راحت! کیا واقعی شمو پر جان چھڑکتے ہو؟" جواب ندارد۔

میں تو بس یار دوستوں میں کالر اکڑا کر، بڑائی مارنے کے لیے شمو کی جان کا روگ بن گیا تھا، مگر مجھے خبر نہیں ہوئی کہ شمو میری جان کو آجائے گی۔ بات اس طرح اور اس قدر پھیلے گی، مجھے اندازہ ہوتا تو کبھی شفو بھیا کی ضد میں اس میدان کارزار میں نہیں کودتا۔

"رضی تمہارا مخلص دوست نہیں۔ جاننا چاہتے ہو تو آج شام کو ایسٹ پارک میں جانا۔ تمہیں رضی پر غصہ آئے گا۔"

وہ کہہ کر چلے گئے اور میرے اندر ایک سوال گھوڑے کی طرح دوڑنے کو چھوڑ گئے۔ میں کبھی اس گھوڑے کے کان پکڑتا۔ کبھی دم پر سوار ہونے کی کوشش کرتا تو یہ گھوڑا مجھے منہ کے بل گرا کر مٹی چٹا دیتا۔

☼ ☼ ☼

خدا خدا کر کے شام آئی۔ میں شفاعت بھیا کی آنکھوں سے بچ کر ایسٹ پارک چلا گیا اور میری آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر آگئیں۔ شمو، رضی کے ساتھ بیٹھی راز و نیاز کی باتیں کر رہی تھی اور ایک بہت بڑا شاپر میرا منہ چڑھا رہا تھا۔ کچی عمر کی پہلی چاہت کا یہ المناک انجام۔

میں کمر موڑ کر گھر آگیا۔ مجھے شمو سے محبت نہیں تھی، مگر میں پھر بھی چیخ چیخ کر رویا تھا اور اپنی چیخوں کو تکیے میں دبا کر مار ڈالتا تھا۔

پھر میں یوں ہی کھڑکی پر کھڑا تھا، جب پچھلی گیلری میں عبدل اور شفاعت بھیا کو میں نے کن من، کن من باتیں کرتے سنا۔ میں سیڑھیاں اتر کر گیلری کے دہانے پر کھڑا ہو گیا اور ساری حسیات سماعت سمیت ان کی باتوں پر لگا دیں۔ ہوا کا رخ میری طرف تھا۔ عبدل کہہ رہا تھا۔

"آپ نے صحیح کہا تھا، شفو بھیا! رضی اور شمو مل کر راحت کو لوٹتے تھے۔ ایسی لتیں لگائی ہی اس لیے تھیں کہ وہ راحت کی جیب پر اپنے شوق پورے کرے۔ شمو نے آپ کے دیے پیسے آدھے آدھے بانٹے۔ میرا تو دل چاہ رہا تھا۔ دونوں کی تھوتھنیاں زمین پر ہی رگڑ دوں، مگر آپ نے منع کیا تھا۔ اس لیے ضبط کرنا پڑا۔"

صدمے پر یہ ایک اور صدمہ۔ دوست بھی ہاتھ سے گیا۔ میں مجنوں ہو کر گھر میں پڑ گیا۔ ساری پڑھائی کھٹائی میں چلی گئی اور تب تک 18 اکتوبر آگئی۔ اماں اسپتال چلی گئیں۔ تب پہلی بار مجھے گھر میں خاموشی کا احساس ہوا۔

شفاعت بھیا اور اجمل بھیا ہسپتال میں تھے۔ عنایت بھیا صفیہ بھابھی کے ساتھ سسرال کے خرچ پر ورلڈ ٹور پر گئے ہوئے تھے۔ کوئی ایک جگہ ٹھکانہ تو تھا نہیں کہ انہیں خبر کی جاتی۔

اللہ اللہ کر کے طویل اور تکلیف دہ انجیو گرافی مکمل ہوئی۔ اماں غنودگی میں بھی "میرا شفو کہاں ہے۔۔۔ شفو کو بلا دو" کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ اجمل بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"شفو بھیا! آپ تو بھوت کی طرح اماں کے حواسوں پر چھائے ہوئے ہیں پلیز! اندر جائیے۔ انہیں اچھا فیل ہو گا۔"

شفاعت بھیا جز بز ہو کر اندر گئے اور اماں کا اطمینان مانو بس اب ساری حکومت ہاتھ میں تھی۔

"شفو! جب تک تجھے نہ دیکھ لوں، دل کو اطمینان نہیں ہوتا۔ اگر مر جاتی تو بھی تجھ پر بڑی خوش گمانی ہے مجھے۔۔۔ تو گھر کو بالکل میری طرح سنبھال لے گا۔"

"ایسی باتیں نہ کریں اماں! شفو بھیا کی ساری طاقت، ساری ہمت آپ سے ہے۔ آپ ان کی سپورٹ پر ہیں، تب ہی یہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قانون کا سکہ چلا پاتے ہیں۔ ورنہ آپ تو جانتی ہیں اپنے بچوں کو۔" اجمل بھیا ہاتھ تھامے ہوئے "شفاعت کی خوبیاں، پارٹ ٹو" چھاپ رہے تھے۔

مجھے اس دن سے پہلے کبھی اجمل بھیا برے نہیں لگے۔ میں نے رخ موڑ لیا۔

"کب تک ناراض رہے گا اپنی اماں سے؟" اماں نے ہاتھ پکڑا اور یوں لگا جیسے جمی ہوئی برف پر کسی نے نمک چھڑک دیا ہو۔ نمک پڑتے ہی برف پگھلنے لگی، مگر پیرا میڈیکل اسٹاف درمیان آگیا اور میں آدھا برف آدھا انسان بنا اماں کو تکتا رہ گیا۔

پچیس دن وہ آئی سی یو میں رہیں، پھر گھر آئیں تو شفاعت بھیا کی توجہ اپنے کام کی طرف گئی۔ ایک دو جگہ ان کی سی وی گئی ہوئی تھی۔ دونوں انٹرویو لیٹر ان کی ناکامی کا منہ چڑا رہے تھے۔

اماں کو پتا چلا تو بہت افسردہ ہوئیں "اگر ڈاک دیکھتا

رہتا تو اتنا اچھا موقع ہاتھ سے نہ نکلتا۔" شفاعت بھیا نے اماں کا ہاتھ تھام لیا۔

"فکر کی کوئی بات نہیں اماں! میں نے جہاں اپنا وقت صرف کیا' وہ اس وقت سے زیادہ قیمتی ثابت ہوگا میرے لیے۔ اگر ملازمت لکھی ہے تو کہیں اور سے کال آجائے گی۔" لمحے بھر کو رکے پھر مسکرا کر بولے "نہ بھی آئی تو بھی اپنی کھیتی باڑی ہے ناں! گزارہ اچھا ہو جائے گا۔"

"اچھا نہیں بہت اچھا ہو جائے گا۔ ابا کے پیسوں پر عیش کررہے ہیں اور خدمت اور ایثار کے ٹیگ لگا لگا کر بے وقوف بنا رکھا ہے سب کو۔" دل میں سوچتے ہوئے میں کمرے میں آتے آتے پلٹ گیا۔

پھر سب سے پہلا معرکہ دوپہر کے کھانے پر اٹھا اماں پرہیزی کھانے کی چور تھیں' ضد پر اڑ گئیں۔ وہ ہی کھائیں گی جو باقی سب کھائیں گے۔

سلمیٰ آپا اسٹڈی روم میں کتاب پڑھتے شفاعت بھیا کو اٹھا لائیں۔

"یہ ہر مسئلے کا حل شفو بھیا کہاں سے بن گئے ہیں' کیوں بن گئے ہیں؟" میں نے جل بھن کر سوچا اور شفاعت بھیا اماں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ انہوں نے نہ ڈاکٹری نسخے کی بات کی' نہ کولیسٹرول کی کہانی ڈالی اور مسکراتے ہوئے بڑی ہی گرمجوشی سے ان کے قریب آ گئے۔

"ارے واہ! چکن اور لوکی... واہ واہ... بہت دن ہو گئے ہیں کھائے ہوئے۔" اماں نے گھور کے انہیں دیکھا اور وہ اماں کے بیڈ پر چوکڑی مار کے بیٹھ گئے۔

پھر یہ ان کا معمول بن گیا۔ وہ ہمیشہ اماں کے ساتھ کھانا کھانے لگے۔ اماں وہی بدمزا کھانا شفو بھیا کی محبت کے ساتھ چپ چاپ کھا لیتیں اور وہ جلد ہی صحت یاب بھی ہو گئی تھیں مگر شفو بھیا کا یہ معمول نہیں بدلا۔ جو اماں کھاتیں' وہ شفو بھیا کھاتے اور مجھے یہ سب نوٹنکی لگتا۔

☼ ☼ ☼

گھر میں تعمیراتی کام شروع ہو گیا۔ ہمارا گھر بڑا' مگر دقیانوسی تھا۔ اب اچانک نئے نقشے سے بنیادیں اٹھائی جارہی تھیں۔

تین ماہ میں گھر بن گیا۔ اندر سے پورشن الگ اور باہر سے گھر ایک لگتا تھا۔

"یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تیرے ابا کی مرضی سے بنا تھا سب کچھ۔" شفو بھیا نے اماں کے گلے میں بانہیں حمائل کیں اور میں نے چہرے پہ اسپورٹس میگزین کی چھایا کرلی۔

"ابا نے اس وقت کے حساب سے بنایا تھا اماں! سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ کسمپرسی سے گزارہ ہو گیا' مگر شادیاں کریں گے تو جگہ کی ضرورت پڑے گی۔ میں نہیں چاہتا' عنایت بھیا جیسا معاملہ پھر ہو۔"

"تو ہم صفیہ جیسی لڑکی کیوں لانے لگے؟" غصہ واضح تھا کیونکہ صفیہ بھابھی اور عنایت بھائی ابھی تک ان کی عیادت کو نہیں آئے تھے۔

"سب اچھے ہوتے ہیں اماں! بس کچھ میں مسائل سمجھنے' انہیں فیس کرنے اور حل کرنے میں مہارت ہوتی ہے اور کچھ جلد گھبرا جاتے ہیں۔ پھر مسائل ضرب در ضرب ہو کر لاینحل بن جاتے ہیں۔ انسان کو محبت سے ساتھ رہنا چاہیے... جبر اور زبردستی سے نہیں۔"

اور پھر اچانک اجمل بھیا کی شادی طے ہو گئی۔ اماں اس کے بھی خلاف تھیں' دونوں بہنیں گھر میں ہیں اور کراس کر کے ایک دم اجمل بھائی کی شادی ہو جائے' مگر بھابھی نور العین کے ابا بستر مرگ پر تھے' اس لیے وہ ان کی شادی اپنی آنکھوں کے سامنے کرنا چاہتے تھے۔

یوں چچا زاد بھائی کے ہاں اماں شگن لے گئیں اور تاریخ طے کر آئیں۔ یہ رشتہ ابا نے طے کر رکھا تھا اور اماں ابا کو نہیں مانتی تھیں' مگر ان کے مرے پڑے فیصلوں کو بڑا مانتی تھیں۔ آخر مشرقی بیوی تھیں۔ میری زبان اور دل کا زہر باہر آنے لگا۔

اجمل بھیا نے ایک بار مجھ پر پھر ہاتھ چھوڑا تھا۔ شفو بھیا ان سے لڑ پڑے۔ یہ ان کے سامنے کا واقعہ تھا جو جھٹلانا اور مکر جانا ناممکن تھا۔ وہ اجمل بھیا کو دور لے گئے اور میں متجسس ہو کر ان کے قریب ہو گیا۔

"اس پر ہاتھ نہ اٹھایا کرو اجمل! میرا دل رکتا ہے۔ کم بخت زبان کا زہریلا سہی' مگر ابا کی کاربن کاپی ہے۔ میں صبح سے شام تک اس کی کتنی غلطیاں اگنور کرتا ہوں' صرف ابا کا چہرہ دیکھ کر۔ میرے ابا نے بڑی تکلیفیں دیکھیں۔ زیادہ تر اپنے غلط فیصلوں سے ہی' مگر میں ابا کو اس رنگ میں پھر سے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔" ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور میرے حلق میں تلخی گھل گئی۔ میں نے ضد میں سگریٹ سلگا لیا۔

"آئے بڑے نوٹنکی' اماں کی طرح... ابا زندہ تھے تو خوش نہیں تھے اور مر گئے تو لوگوں کے سامنے ابا کی محبت کا دم بھر رہے ہیں ہونہہ۔" میں اپنے کمرے میں آگیا۔

☼ ☼ ☼

پھر اجمل بھیا کی شادی ہو گئی۔ نور العین بھابھی اچھی تھیں' مگر وہ اماں ہی کیا جو بہو کو اچھا ہونے کا خطاب دے سکیں۔ روز ہی جھگڑا رہتا' مگر اجمل بھیا کے آگے نور بھابھی کی ایک نہ چلتی۔ وہ بھی شفاعت بھیا کی طرح اماں کے مرید تھے۔

"اماں کبھی غلط نہیں کہتیں' جہاں واقعی کمی ہوتی ہے' وہ اسی کو پوائنٹ آؤٹ کرتی ہیں۔ تمہارے اندر صفیہ بھابھی کی بہت جھلک ہے۔ تم یہ نہ بھولو کہ تمہاری شادی جن حالات میں کی گئی' وہ اماں کا ہی بڑا پن ہے۔ چچی جان کی تمام تر بدتہذیبی اور لڑائی کے باوجود انہوں نے ابا کی زبان کا پاس نبھایا۔ تمہاری جگہ اگر کوئی اور ہوتی تو شاید اماں کی خدمت میں سرنگوں رہتی۔"

"اگر انہوں نے ابا کی زبان کو نبھایا ہے تو مجھے سکون سے رہنے بھی تو دیں۔" اجمل بھیا لال بھبھوکا ہو گئے ان کی بات پر۔

"کیا بے سکونی ہے تمہیں اس گھر میں؟"

"مجھے نہیں پتا۔ بس مجھے آپ کے ساتھ جانا ہے۔"

"سوچوں گا"، جا کر حالات دیکھوں گا' پھر ہی کوئی فیصلہ کروں گا وہ تیزی سے باہر نکلے اور مجھے ٹرے تھامے دیکھ کر اچنبھے سے رک گئے۔

"یہ کیا ہے... کس کے لیے ہے؟" میں گھبرا گیا۔

"وہ نور بھابھی نے کھانا نہیں کھایا تھا' اس لیے شفو بھیا نے کھانا بھیجا ہے ان کے لیے۔"

"شفو بھیا..." وہ زیر لب بڑبڑائے۔ "جاؤ! دے آؤ اسے کھانا..." لمحہ بھر کو رکے' پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "قدر کرو شفاعت بھیا کی۔ دنیا میں جنتی آدمی ہے۔ اس کی "ہوں" پر "ہاں" کہو گے تو دنیا کے ساتھ ساتھ عاقبت بھی سنور جائے گی۔"

میں نے گردن جھکا لی' مگر دل پھر سے شفو بھیا سے آنا کانی کرنے لگا۔ میں کھانا دے کر واپس آگیا۔

☼ ☼ ☼

اجمل بھیا اپنی چھٹیاں گزار کر واپس چلے گئے۔ نور العین بھابھی سارا دن اماں کے دربار میں حاضر رہتیں اور میں کلستا رہتا۔ میں نے پھر سے بی کام میں داخلہ لے لیا تھا۔

پھر ایک جگہ پھنسا تو دوست سے کسی اچھے ٹیوشن سینٹر کی بات کی۔ وہ میری بات پر ایسا ہنسا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

"شفو بھیا ہیں ناں! ایم بی اے کیا ہے انہوں نے ٹاپ ون سے صرف پانچ پرسنٹ کم نمبرز لیے ہیں' اپنی ذمہ داریوں کی وجہ سے۔"

"بس کرو۔ کوئی ذمہ داریاں نہیں ہیں۔ سب خود پھیلا رکھا ہے۔ خالی خولی پبلسٹی۔"

میرا دوست میرا منہ تکنے لگا' مگر ہوا وہی۔ گھوم گھام کر بدھو کو گھر ہی آنا پڑا۔

میں جب شفاعت بھیا کے کمرے میں گیا' وہ کسی کو بہت ارجنٹ کال کر رہے تھے۔ اپنے ڈاکومنٹس سیٹ کر رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو رک گئے۔

"خیریت ہے راحت؟"

میں نے مدعا بتایا تو حرکت کرتے ہاتھ یکدم رک گئے۔ خاموشی سے اپنی اسٹڈی ٹیبل تک گئے اور مجھے سوالات سمجھانے لگے۔ جو چیز میں دس دن میں دربدر کی خاک چھان کر نہیں سیکھ سکا تھا' انہوں نے تین گھنٹے کی محنت سے ایسے مجھے ذہن نشین کرادیں کہ میں خود کو میتھ کا ماسٹر سمجھنے لگا۔ میں اٹھنے لگا تو انہوں نے الٹا مجھے "تھینکس" کہا۔

میں حیران ہوگیا اور دل میں خیال کیا کہ شاید یہ ذلیل کرنے اور مینرز سکھانے کی اعلا کوشش ہوگی' مگر میرے ذہن بے مہار سے بالکل الگ انہوں نے محبت سے مجھے کندھوں سے تھاما اور ان کے لب ملے۔

"مجھے اچھا لگا کہ تم نے اپنی پرابلم میں مجھے ایک بڑے بھائی کی طرح پکارا اور مجھے خوشی ہے کہ میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے دے سکا۔"

محبت۔۔۔ محبت۔۔۔ محبت۔

میری آنکھیں کھلیں اور شرم سے جھک گئیں حالانکہ میرا دل ابھی تک اپنی نفرت پہ قائم تھا۔ دنیا میں دو شخص تھے جن سے مجھے کبھی محبت نہیں ہوسکتی تھی۔

ایک اماں' اور ایک شفاعت بھیا۔

اور دوسرے جنم پر میرا عقیدہ نہیں تھا' سو مجھے یقین تھا' یہ دوری ہمیشہ ایسے ہی رہنی تھی۔ میں ان کے کمرے سے باہر نکل آیا۔

پھر تیسرا دن تھا' جب وہ پہلی بار عنایت بھیا کی طرح تیار ہوکر باہر نکلے۔

سوٹ پہنے اور میچنگ ٹائی لگائے۔ ان کی تیاری میں سو فیصد اماں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لیے اماں پر انحصار کرتے تھے۔ جو شخص زمینوں کا حساب کتاب دیکھتا تھا' جس نے ایم بی اے اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا اور آج نور بھابھی کے بقول ایک آفس میں "اسٹنٹ سی' ای' او" کے عہدے پر جارہا تھا' وہ شخص اپنی زندگی کے ہر کام میں اماں کا محتاج تھا۔ شاید آپ کو حیرت ہو' شفاعت بھیا کو اپنے جوتے کے تسمے تک باندھنے نہیں آتے تھے۔ یہ کام ہمیشہ اماں کرتی تھیں۔ اماں کی طبیعت خراب ہوتی تو وہ جوتی یا بغیر تسمے کے جوتے استعمال کرتے' مگر آج تک انہوں نے تسمے باندھنا نہیں سیکھا تھا۔

میں نے پہلی بار انہیں غور سے دیکھا۔ وہ ہم چاروں بھائیوں میں سب سے زیادہ خوبرو تھے۔ رنگ ان کا ہماری طرح صاف نہیں' بس گندمی تھا' مگر ان کے چہرے کا نور اور شخصیت کا سحر بے حد متاثر کردینے والا تھا۔ میں نے گہری سانس لی۔

"نظر لگانی ہے میرے بھیا کو اتنے غور سے دیکھ کر؟" سلمٰی آپا کا شرارتی انداز دیکھ کر شفاعت بھیا مسکرانے لگے۔ پھر اماں کے تخت پر پیر رکھ کر انہوں نے تسمے بندھوائے اور عازم سفر ہوئے۔

"اچھے لگ رہے تھے ناں آج۔۔۔" آج سلمٰی آپا نے چھٹی کی تھی۔ وجہ شفاعت بھیا کا پہلا دن تھا اور وہ یہ دن انجوائے کرنا چاہتی تھیں۔

"کوئی نہیں۔۔۔" میں منہ بگاڑ کے آگے بڑھ گیا۔ ہر ایک کو شفاعت بھیا کی شخصیت مسحور کن لگتی تھی۔ مگر مجھے ان سے اتنی ہی چڑ محسوس ہوتی تھی۔ پتا نہیں کیوں۔

پھر یوں ہوا شفاعت بھیا روز جانے لگے۔ ان کی تیاری اماں کی خاص مصروفیت ہوتی۔ شفو بھیا کی مصروفیت میں وہ نور العین بھابھی کو بھی بھولے رہتیں۔ نور العین بھابھی کی صفیہ بھابھی سے گاڑی چھننے لگی تھی۔

میں "اماں اور شفاعت بھیا مخالف کیمپ" سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے وہ آسانی سے ہر بات مجھ سے شیئر کرلیتی تھیں۔ پڑھائی' گھریلو سیاست ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یکدم عنایت بھیا لوٹ آئے اور آتے ہی عائشہ باجی کے لیے ایک رشتہ پیش کردیا۔

اماں حق دق رہ گئیں۔ شفاعت بھیا تصویر دیکھنے لگے۔

سلمٰی آپا سے تصویر ہوتی مجھ تک بھی پہنچی' مگر میں نے عائشہ باجی کے چہرے پر کوئی خوشی نہیں دیکھی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی۔ میں ابھی اپنا ہاؤس جاب مکمل کررہی ہوں۔" ان کا احتجاج شفاعت بھیا کے ذریعے اماں تک پہنچا۔ اماں نے جہاں دیدگی سے انکار کی پرتوں میں جانے کیا دیکھا۔ کھٹاک سے عنایت بھائی کو منع کردیا۔

مگر شفاعت بھیا عائشہ باجی کے پاس آگئے۔

"کون ہے وہ۔۔۔" عائشہ باجی کے ہاتھ سے ٹی وی کا ریموٹ چھوٹ کر گر گیا اور رنگ اتر گیا۔ میں کمرے میں جاتے جاتے دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔

کیا کہیں گی عائشہ باجی؟ بڑا سا سوالیہ نشان میرے اردگرد چک پھریاں لینے لگا۔ سامنے شیشے میں عائشہ باجی کے تاثرات واضح تھے۔

"سعید احمد۔۔۔ میرے ساتھ ہی تعلیم حاصل کی ہے۔ ہم دونوں ہاؤس جاب بھی ساتھ کررہے ہیں۔ وہ رشتہ لے کر آنا چاہتے تھے' مگر میں نے منع کردیا۔"

"منع کردیا؟ کیوں' کیا تمہیں لگا ہم ہٹلر ثانی ہیں؟" شفاعت بھیا کے لہجے میں حیرت بھرا دکھ تھا۔ عائشہ باجی نے گھبرا کے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں! مگر صفیہ بھابھی اور عنایت بھائی سے ڈر لگتا تھا۔ کہیں وہ اس کو ایشو نہ بنالیں۔ آپ کو تو پتا ہے ناں' عنایت بھیا نے کس قدر میری تعلیم کی مخالفت کی تھی' پھر صفیہ بھابھی آئیں تو انہوں نے بھی کو ایجوکیشن کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ حالانکہ خود انہوں نے کو ایجوکیشن سے پڑھا۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں شفو بھیا! اگر آپ اس وقت میرے لیے اسٹینڈ نہ لیتے تو میں اپنی تعلیم تک جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا' میں ایک اور بوجھ آپ کے کاندھوں پر ڈال دوں' یہ تو خود غرضی ہوتی۔"

"پاگل۔۔۔ صحیح کہا ہے لوگوں نے۔۔۔ بہنیں واقعی پاگل ہوتی ہیں۔۔۔ محبت میں بھی۔۔۔ بے وقوفی میں بھی۔" انہوں نے ان کا سر تھپتھپایا اور مجھے پتا چل گیا شفو بھائی ایک بار پھر عدالت میں جاکر عائشہ باجی کا مقدمہ لڑنے والے ہیں۔

مگر پھر نور العین بھابھی نے جانے کیا میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ میں نے اپنی اہمیت جتانے کے لیے عائشہ باجی کا یہ راز افشاں کردیا۔ نور العین بھابھی نے چٹخارے لے کر یہ بات صفیہ بھابھی تک پہنچادی اور عنایت بھیا شام کو ہی گھر میں دھرے تھے۔

"شفاعت گھر کو جس طرف لے کر جارہا ہے ناں اماں! دیکھ لیجئے گا' ایک دن سر پکڑ کر روئیں گی آپ۔"

"ہوا کیا ہے۔۔۔؟" اماں حیران تھیں اور شفاعت بھیا پریشان۔

"محبت کی شادی کرنا چاہتی ہے آپ کی بی بنو۔۔۔"

"آئے ہائے! میری بیٹی کے یہ کرتوت نہیں' جو تمہارے تھے۔ تم نے جس طرح ہم ماں بیٹے کو بے وقوف بنا کر شادی کی' میں خوب جانتی ہوں۔ آخر وقت تک میں سمجھتی رہی' میں اپنی پسند سے لڑکے کا گھر بسا رہی ہوں۔ یہ تو بعد میں کھلا' آنکھ مٹکا تھا دونوں کا۔ ہم تو بلاوجہ ہی بدنام ہوگئے۔"

"بس کردیں۔ اپنی بیٹی کے کرتوت نظر نہیں آتے۔ مجھے کوس رہی ہیں۔ سچ کہا کسی نے' ساس کبھی ماں نہیں بن سکتی۔"

"شفاعت رشتہ لایا ہے۔ لڑکا ڈاکٹر ہے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اس لیے میں تو کل لڑکے کے گھر جا رہی ہوں۔"

"عائشہ کو بلائیں۔ میں پوچھتا ہوں اس سے۔"

"کس حق سے پوچھو گے؟ کوئی فرض نبھایا اس کا؟"

مگر صفیہ بھابھی چلتر بازی سے عائشہ باجی کا ہاتھ پکڑ کر لے آئیں۔ اس دن مجھے اپنی بے وقوفی پر سخت غصہ آیا۔ اگر یہ پتا چل جاتا کہ یہ راز کہاں سے "لیک آؤٹ" ہوا ہے تو شفو بھیا مجھے فوراً" سے پیشتر۔۔۔ قتل کردیتے۔ وہ غیروں کی بیٹیوں کی عزت رکھنے پر جان پر کھیل سکتے تھے اور میں کیسا بھائی تھا کہ اپنی بہن کے سر سے آنچل کھینچ لیا تھا۔ اسے رسوا کردیا تھا۔ میں رونے لگا شفاعت بھیا نے سینے سے لگا کر کہا۔

"مت گھبراؤ۔ شادی تو وہیں ہوگی' جہاں عائشہ چاہتی ہے۔"

وہ گول کمرے میں داخل ہوئے۔ صفیہ بھابھی کی

زبان کو سانپ سونگھ گیا۔ نورالعین بھابھی بھی ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"مجھے سعید میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ پسند کرنا کوئی جرم نہیں۔ عائشہ نے فیصلے کا مختار مجھے اور اماں کو بنایا تھا۔ کوئی عہد وپیماں نہیں کیے تھے۔ اگر میں یا اماں منع کر دیتے تو یہ رشتہ کبھی آگے نہیں بڑھتا، مگر جب سعید مجھ سے ملا تو وہ مجھے عائشہ کے لیے بیسٹ چوائس لگا، اس لیے میں نے اماں کی رائے کے بعد سعید کو "ہاں" کر دی ہے۔ وہ اگلے ہفتے رسم کر جائیں گے۔"

اماں نے نظر اٹھا کر دیکھا اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا۔ سلمیٰ آپا خبر دینے عائشہ باجی کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

میں عائشہ باجی کا ہاتھ تھامے اب بھی روئے جا رہا تھا، مگر مجھ میں اخلاقی جرات کی کمی تھی، اس لیے اپنا جرم نہ بتا سکا اور تب ہی شفاعت بھیا کمرے میں آگئے۔ عائشہ باجی بھاگ کر ان کے سینے سے لگ گئیں۔

ان کا ایک ہی خوف تھا۔ بات سارے خاندان میں پھیل جائے گی۔ صفیہ بھابھی خوب نمک مرچ لگا کر بات آگے بڑھائیں گی۔" شفاعت بھیا مسکرائے۔

"تمہاری شادی ہم صفیہ بھابھی کے لائے ہوئے رشتے سے کرواتے، تب بھی وہ کوئی نہ کوئی نقص، کوئی نہ کوئی چٹخارہ ڈھونڈ ہی لیتیں۔ تم دنیا کی فکر مت کرو۔ دنیا نہ آپ کے جینے سے خوش ہوتی ہے، نہ آپ کے مرنے سے۔ بس مستقبل کے اچھے خواب دیکھو۔ سعید کہہ رہا تھا، نکاح کے بعد وہ باہر چلا جائے گا اور پھر کچھ مہینوں بعد تمہیں بھی بلالے گا، اس لیے وہ نکاح جلد چاہتا ہے۔" سر پر ہاتھ رکھ کر وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

"تم یہاں نہیں ہوگی تو پھر فکر بھی مت کرو کہ دنیا تمہارے لیے کیا کیا کہانیاں بناتی اور بگاڑتی ہے۔ جب سال دو سال بعد لوٹو گی تو تمہارے چہرے کی خوشی سے ہی ان سب کے منہ بند ہو جائیں گے۔"

☼ ☼ ☼

دوسری صبح عنایت بھیا اور صفیہ بھابھی واپس چلے گئے۔ اس بار وہ اپنا جینا مرنا ختم کر کے گئے تھے۔ اس دن اماں کو پھر درد ہوا تھا۔ ساری رات شفاعت بھیا ان کے سرہانے بیٹھے رہے۔

"اولاد ماں سے دور نہیں رہ سکتی۔ ابھی وقتی غصہ ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ عنایت بھیا خود لوٹ آئیں گے۔"

"اگر میں نہ رہی، تب لوٹا تو کس کام۔۔۔"

"اماں۔۔۔" شفاعت بھیا نے خفگی سے اماں کو دیکھا۔ پھر وہ ساری رات کونسلنگ کرتے رہے۔ دوسری صبح اماں کھڑی ان کے لیے ڈریس اور میچنگ ٹائی نکال رہی تھیں۔

"شفاعت بھیا جادوگر ہیں واقعی۔۔۔" میں نے سوچا اور دل میں ٹٹولا۔ نفرت کے منہ پر کسی نے کس کر دونوں ہاتھ رکھ دیے تھے۔ نہ وہ بول پا رہی تھی، نہ دیکھ پا رہی تھی۔

نکاح میں اجمل بھیا شامل نہیں ہو سکے تھے، مگر انہوں نے فون کر کے عائشہ باجی کو مبارک باد دی تھی۔ سلمیٰ آپا ہواؤں میں اڑی پھرتی تھیں۔ سب جگہ خوشی ہی خوشی تھی، مگر نورالعین بھابھی کا منہ بنا ہوا تھا۔

"آپ کو کیا ہوا؟" میں نے چاہا میں انہیں صفیہ بھابھی کے سحر سے باہر نکالوں۔ وہ مجھ پر ہی الٹ گئیں۔

"تم سب کے سب نوٹنکی ہو۔ اپنے مطلب کے لیے کچھ بھی کر جاتے ہو۔ اماں اور بہنوں کی باتوں پر کلیجہ دھڑکتا ہے۔ ہم بہوویں کچھ کہیں تو مجرم، ظالم، مکار۔"

میں کان دبائے سنتا رہا۔ اجمل بھیا کے غصہ کی وجہ سے نورالعین بھابھی کو عائشہ باجی کے نکاح کی خریداری میں ہر طرح کا ساتھ دینا پڑا تھا اور وہ یہ غصہ مجھ پر نکال رہی تھیں کیونکہ صفیہ بھابھی روز فون کر کے ان کی غیرت اور حمیت کو جگاتی رہتی تھیں۔ ان کا خیال تھا، نورالعین بھابھی کو اس کام میں ہاتھ بٹانے کی قطعی ضرورت نہیں، مگر انہیں کرنا پڑ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

عائشہ باجی کا نکاح سادگی سے ہو گیا۔ چھ ماہ بعد سعید بھائی واپس آئے تو عائشہ باجی کی رخصتی ہو گئی۔ گھر خالی خالی ہو گیا۔

ولیمہ والے دن عائشہ باجی کی مسکراہٹ بہت کھلی کھلی تھی۔

"اس مسکراہٹ پر سو بار قربان۔" میں نے دل میں سوچا اور شفاعت بھیا میرے قریب آکر گنگنائے۔

"بہنیں مسکراتی ہوئی۔۔۔ اچھی لگتی ہیں ناں؟" میں نے "ہاں" میں سر ہلایا اور وہ دوبارہ بولے۔

"اسی لیے میں نے ان دونوں کو کبھی بھائی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ابا کی نظر سے ٹریٹ کیا ہے۔ بہنوں کو باپ کی نظر سے دیکھو تو کبھی کبھی ان کی ناجائز بات بھی جائز اور ان کا حق لگتی ہے۔ مجھے خوشی ہے میں نے امانت داری کا ثبوت دیا۔ کسی کا حق نہیں روکا۔"

"قدر کرو شفو بھیا کی۔ دنیا میں رہ کر وہ جنتی ہیں۔" اجمل بھیا کا جملہ آج میری سمجھ میں آگیا تھا۔ مگر میں نے نظر ہٹالی۔ اتنے برسوں کا "ایٹی ٹیوٹ" ایک دم سے کہاں ختم ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر سلمیٰ آپا کی شادی طے ہو گئی۔ میں بہت خوش ہوا تھا کہ سلمیٰ آپا کی شادی اور اجمل بھیا کے ہاں پہلی بیٹی کے بعد دوسرا بیٹا ساتھ ہی ہوا تھا۔ سب ہی خوشی سے پاگل تھے۔

مگر سلمیٰ آپا کو یہ خوشی راس نہ آئی۔ ان کے شوہر صفی بھیا شادی کے چند روز بعد ہی کراچی کے کسی ہنگامے کی نذر ہو گئے۔ یوں سلمیٰ آپا بیوگی کا آنچل اوڑھ کر ایک کمرے میں قید ہو گئیں۔ اماں کا دل غم سے پھٹا جا رہا تھا۔ عائشہ باجی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں اور انہیں کیا رسمیں ادا کرنی پڑ رہی تھیں۔ سلمیٰ آپا کے کمرے سے ہر وقت تلاوت کی آواز آتی رہتی۔

شفاعت بھیا رات رات بھر ٹہلتے رہتے۔ اماں بستر پر لیٹی جاگتی رہتیں۔

"اب کیا ہوگا، کون اپنائے گا میری بچی کو۔۔۔" ایک ہی غم کھائے جاتا تھا کہ سعید بھائی، محسن کی طرح اماں کے سامنے آن بیٹھے۔

"دوسرے ماں باپ نہیں ہیں۔ سو گرنہ اس رشتے کی بات وہ کرتے۔ اگر آپ کو مناسب لگے تو میرا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ یوکے میں رہتا ہے۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔ اس کے لیے سلمیٰ کا رشتہ قبول کر لیں تو"

میری خوشی سے چیخ نکل گئی۔ شفاعت بھیا کا مرجھایا چہرہ کھل اٹھا۔ یوں سلمیٰ آپا عدت کے فوراً بعد شیراز کی دلہن بن کر یوکے چلی گئیں۔ اماں اب شفاعت بھیا کی شادی کے درپے تھیں۔ لڑکیاں دیکھ رہی تھیں کہ ایک دم سے دھچکا لگا۔

ایک روز شفاعت بھیا گھر آئے تو ان کا چہرہ دیکھ کر اماں کی چیخیں نکل گئیں۔

"بتاؤ بھی شفو! سب خیریت تو ہے؟"

"اماں۔۔۔ اماں! اپنا اجمل شہید ہو گیا۔ کنٹرول لائن کے اس طرف سے بلا اشتعال فائرنگ کا جواب دیتے ہوئے، وہاں کے لوگوں کو محفوظ جگہ تک پہنچاتے پہنچاتے ایک انجانی گولی کا شکار ہو گیا ہمارا اجمل۔۔۔"

اماں کھڑے سے بیٹھ گئیں۔ مجھے لگا اماں مر گئیں، مگر شفاعت بھیا نے اماں کو پھر سے سنبھال لیا۔

نورالعین بھابھی عدت میں بیٹھ گئیں اور اماں کی ایک ہی ضد تھی۔

"میں نورالعین کو واپس گھر نہیں جانے دوں گی۔ میرے بچے کی نشانیاں ہیں اس کے پاس۔"

"ہم انہیں جانے کو نہیں کہہ رہے، مگر وہ کہتی ہیں، وہ یہاں کس رشتے سے رہیں؟"

"میں عنایت سے کہوں گی، وہ نورالعین سے عقد ثانی کر لے۔"

انہوں نے فون کیا اور پھر جو صفیہ بھابھی کی لن ترانی شروع ہوئی ہے۔

"شفاعت اور راحت ہیں ناں! کسی سے بھی کر دیں ان کی شادی۔۔۔ لیکن اگر کسی نے پھر عنایت کا نام لیا تو جان سے مار دوں گی۔"

اماں بے یارومددگار سی بیٹھی تھیں۔ ان کے آنسو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں تھمتے تھے۔ میں گھبرا کے اماں کے پاس سے اٹھتا بھی نہیں تھا۔ مجھے لگتا تھا' جہاں میں اٹھا' وہیں اماں مرجائیں گی۔ تب ہی اماں نے میرے ہاتھ تھام لیے۔

"راحت! تو کرلے ناں' نورالعین سے شادی۔ آج تک میں نے کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ مان جا ناں۔۔۔۔"

میں کرنٹ لگنے کی رفتار سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے صبوحی یاد آنے لگی جس نے شفاعت بھیا کی طرح ہر اچھے' برے میں مجھ برے کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔

"میں اسے کیا بتا کر چھوڑوں۔۔۔؟"

"میں اماں کے آگے ہار گیا۔"

"مجھ میں ہمت نہیں کہ میں اماں سے تمہاری بات کروں۔"

"سنو! مجھے تم سے محبت نہیں۔"

رات بھر میں سگریٹ پھونکتا رہا۔ جملے سوچتا رہا پھر زندگی میں پہلی بار فجر کی نماز پڑھ کر میں اپنے "ڈیتھ سرٹیفکیٹ" پر دستخط کرنے کے خیال سے اماں کے کمرے میں داخل ہونے والا تھا کہ میں نے شفاعت بھیا کی مدھم آواز سنی۔

"راحت کو کچھ مت کہیں۔ وہ کسی کو پسند کرتا ہے۔ اس کے راستے میں ہمیں اپنی خواہش کا اتنا بڑا پتھر نہیں رکھ دینا چاہیے کہ نہ وہ آگے جاسکے' نہ پیچھے۔ نہ اپنے ساتھ انصاف کرسکے' نہ نورالعین کے ساتھ۔ میرا دل صاف ہے۔ یہاں کوئی آباد نہیں۔ مجھے اجمل کی عزت کو عزت سے رکھنے کا ہنر آتا ہے۔"

اماں شفاعت بھیا کے دل کے سادہ اور بے آباد ہونے پر دھاڑیں مار مار کر روئی تھیں۔

"شفاعت جب بھی مجھ پر وقت پڑا ہے تو نے مجھے جس طرح سنبھالا ہے' سہارا دیا ہے' میری دعا ہے' میرا اللہ تجھے نہ دنیا میں ناکام کرے' نہ آخرت میں۔۔۔۔"

شفاعت بھیا نم آنکھوں سے مسکرا دیے۔

"دنیا کے لیے کون جیتا ہے۔ رہی آخرت تو آپ کی ممتا نے خود بخود سنوار دی ہے۔"

میں پیچھے رہ گیا۔ شفاعت بھیا پھر ہمیشہ کی طرح آگے نکل گئے۔



نورالعین اکلوتی بیٹی تھیں' مگر گھر میں بھابھیوں کا اتنا ٹیکا تھا کہ اپنے گھر میں تیسرے درجے کا شہری بننے سے بہتر انہیں شفاعت بھیا کی بیوی بننا ٹھیک لگا۔

ایک جمعہ کو ان کا نکاح سادگی سے ہوگیا۔ وہ اٹھ کر شفاعت بھیا کے کمرے میں آگئیں۔ بچوں کو اماں نے سنبھال لیا۔ اجمل بھیا غصے کے تیز تھے اس لیے نورالعین بھابھی کبھی اختلاف کرسکیں نہ اپنی من مانی' مگر شفاعت بھیا نرم دل اور ٹھنڈے مزاج کے تھے' اس لیے وہ روز کسی نہ کسی بات پر ہنگامہ اٹھائے رکھتیں۔ اماں صدمے میں رہتیں۔

"میں نے شفاعت کی زندگی تباہ کردی۔" ایک یہ غم تھا اور ایک یہ غم کہ "میرا اجمل کتنی اذیت بھری زندگی جی کر گیا۔ کچھ بھی تو اچھا اور من مرضی کا نہیں دیکھا۔"

انہیں یہ غم لگا اور پھر یہ غم بڑھتا گیا' کیونکہ نورالعین بھابھی' شفو بھیا سے اس بات پر لڑتی تھیں کہ وہ "ماماز بوائے" ہیں۔

انہیں ان کی تیاری سے لے کر سوچ تک پہ اپنی اجارہ داری چاہیے تھی' مگر یہ ایک واحد بات تھی جس پر شفاعت بھیا کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے۔

"مان لے' وہ بیوی ہے تیری' حق بنتا ہے اس کا۔" اماں نے سمجھایا۔ پھر وہ ڈریسنگ ان کی مرضی سے کرنے لگے' مگر جوتوں کے تسمے اب بھی اماں سے بندھواتے۔ ناشتا' کھانا اماں کے ساتھ کھاتے۔ نورالعین بھابھی چڑچڑی ہوگئیں۔ جتنا وہ مانتے' وہ اتنا "اور اور" کی گردان لگاتیں۔

یہاں تک کہ ایک صبح اماں کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ فجر کا وقت تھا۔ شفاعت بھیا نماز کے لیے وضو کررہے تھے کہ اماں کے "شفو" کہنے پر بھاگے گئے تھے اور پھر ذرا کی ذرا دیر میں وہ اماں کو اسپتال لے کر بھاگے تھے۔ وہ آئی سی یو میں تھیں۔ ڈاکٹر وجاہت میرا کندھا تھام کے بولے۔

"شفاعت بہت باہمت اور جینوئن ہے۔ میں نے اس سے پندرہ سال پہلے کہہ دیا تھا کہ اس کی ماں کے پاس چھ' سات ماہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اس لڑکے نے مجھے جھٹلا دیا۔ کہتا تھا "میری ماں بہت جیے گی میرا دل کہتا ہے اور میرا دل بہت کم غلط کہتا ہے۔" اس نے رپورٹس ٹیبل پر پھینک دی تھیں اور کہا تھا "نہیں مانتا میں ان رپورٹس کو۔۔۔۔ میرا اللہ سب سے بڑا معالج ہے۔ آپ دوائیں لکھ دیں پرہیز بتادیں۔ پھر دیکھیے گا کبھی آپ کی مسیحائی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

نورالعین بھابھی صوفے پر بیٹھی روئے جارہی تھیں۔

"ان کو تو زندگی کی خبر نہیں۔ اماں کی آنکھوں سے دیکھتے' اماں کے کانوں سے سنتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی' ان کے پہننے اوڑھنے اور دیگر معمولات اپنے ہاتھ میں لے لوں گی تو وہ بھی میرے ہاتھ میں آجائیں گے' مگر مجھے تو پرسوں پتا چلا' میرے استری کرنے سے پہلے وہ اماں سے پسند کروا کے آتے تھے۔۔۔۔ میں چوز کیے ہوئے کپڑے استری کرنے بیٹھتی تو وہ میری چوائس میں کوئی نہ کوئی خامی نکال دیتے۔ کبھی کسی شرٹ کا بٹن توڑ کر' کبھی کوئی دھبہ لگا کر اور خود اماں کی منتخب کی ہوئی شرٹ اور پینٹ پیش کردیتے اور میں سر جھکا کر بے وقوف بن جاتی۔ راحت! انہیں تو اپنے جوتے کے تسمے بھی باندھنے نہیں آتے۔ اگر اماں کو کچھ ہوگیا تو ان کا کیا ہوگا۔ میرے شفاعت کا کیا ہوگا۔"

میں حیران نظروں سے انہیں دیکھنے لگا۔ تین سال میں اجمل بھائی ان کی زندگی سے غائب ہوگئے تھے۔

اماں پرائیوٹ روم میں شفٹ کردی گئی تھیں۔ وہ ساری زمینوں کا حساب کتاب کرنے بیٹھ گئیں۔ اس

دن مجھے پتا چلا شفاعت بھیا نے اپنے نام کبھی کچھ لکھا نہیں تھا۔ سب ہم بہن بھائیوں میں برابر برابر تقسیم تھا۔ اماں نے نحیف آواز میں کہا۔

"یہ اس کی خواہش تھی۔ کہتا تھا' اماں! مجھے آپ کی محبت مل گئی۔ سمجھوں گا' دنیا اور آخرت دونوں مٹھیوں میں قید ہو گئے۔" میں رونے لگا اور اماں نے میرا ہاتھ تھام کے کہا۔

"تم ساری زندگی سمجھتے رہے' مجھے حکمرانی اور شفاعت کو دولت کی طلب ہے تو تم نا سمجھ تھے۔ تمہارے ابا کے دن رات کے شاہانہ فیصلوں کی وجہ سے میں نے تم سب پر اتنی سختی روا رکھی۔ اگر میں بھی نرم اور بے عمل ہو جاتی تو تم میں سے کوئی بھی آگے نہ پڑھ سکتا۔ باقی خاندان کے بچوں کی طرح ڈنڈے بجاتے' جوتیاں' چٹخاتے پھرتے۔ شفاعت میرا بیٹا تھا مگر اس نے ایک دوست' ایک بیٹی کی طرح میرا خیال رکھا۔ وہ یہی کہتا تھا' اگر کسی مرض کے لیے کڑوی دوا دینی پڑے تو اماں! دینی چاہیے۔ میں آپ کی پشت پر ہوں۔ آپ جو چاہو کرو' میں دیکھ لوں گا' میں سنبھال لوں گا۔" اور جب وہ یہ کہتا' میں دیکھ لوں گا' میں سنبھال لوں گا تو مجھے لگتا' میں کسی گھنے سائبان کے نیچے کھڑی ہوں۔ نیک اور فرماں بردار اولاد سائبان کی طرح ہی تو ہوتی ہے۔"

میں روئے گیا' پھر جب میں کمرے سے باہر نکلا تو ربیعہ خالہ' اماں کی واحد سگی بہن باہر بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی روکھے انداز میں مدھم بولیں۔

"تمہاری ماں ایک بہادر عورت ہے۔ اس نے دنیا سے لڑ کر' رسم و رواج سے بغاوت کر کے' تمہارے لیے بہتر مستقبل کی امید باندھی۔ لوگوں نے کہا' شادی کر لو۔ معاشرے میں چلنے کے لیے مرد کا آسرا بہت ضروری ہے تو وہ ہر ایک سے لڑ پڑی تھی۔ اس نے کہا' مجھے میرے اللہ کا آسرا اور میرے بچوں کی محبت کافی ہے۔"

"بچوں کی محبت؟" میرے آنسو اور روانی سے گرنے لگے۔ عنایت بھیا اور میں کہاں کھڑے تھے؟

میرے سینے سے چیخیں نکلنے کو بے قرار تھیں۔ وہ مزید بولیں۔

"حسن اکبر بڑے من موجی اور پیسے خرچ کرنے میں ہر فن مولا تھے۔ جتنا کماتے تھے' اس کو لٹانے کے لیے بھی راستے ڈھونڈ لیتے تھے۔ پورے خاندان میں ان کی عاشق مزاجی مشہور تھی' مگر یہ تھا' وہ کسی پر جتنی جلدی پاگل ہوتے' اتنی ہی جلدی ان کا بھوت اترتا اور لوٹ کر نجمہ کے پاس ہی آتے۔ نجمہ نے بھی کبھی انہیں نہیں دھتکارا۔ ہمیشہ اپنے سینے سے لگا لیا۔ کبھی کبھی میں اس کے صبر پر چیخ پڑتی اور وہ یہ ہی کہتی "معاف نہ کروں تو اور کیا کروں۔ واسطہ اتنا بڑا دیتے ہیں' ایسے روتے ہیں' گڑگڑاتے ہیں کہ میرا دل پسیج جاتا ہے۔" جب وہ بستر مرگ پر پڑے تو دو تین عورتوں نے ان کی بیوی ہونے کا دعوا کیا تھا۔ وہ بول سکتے تھے۔ نہ سن سکتے تھے' یہ ہی وجہ تھی' میں نے نجمہ کو مشورہ دیا سب کچھ اپنے نام لکھوالو تاکہ بعد میں مشکل نہ ہو۔"

"وہ عورتیں۔۔۔؟" مجھے اپنے لفظوں کی تلخی انی کی طرح اپنے کلیجے میں چبھتی محسوس ہوئی۔ وہ نفرت سے بولیں۔

"جھوٹی تھیں بے غیرتیں۔۔۔ تمہارے ابا کی رنگین طبیعت کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھیں' مگر تمہاری اماں کے چند سوالوں کے آگے ہی نہ ٹک سکیں۔ بھانڈا پھوٹ گیا ان کا تو چلتی بنیں۔" میں اماں کے پاس پھر سے جانا چاہتا تھا' مگر نہیں جا سکا۔

اور شفاعت بھیا نے سلمیٰ آپا اور عائشہ کو بلا بھیجا۔ میرا دل ٹھٹکا۔ میں سمجھ گیا کہ اب شفو بھائی کا دل کیا کہتا ہے۔۔۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور رونے لگا۔

اور واقعی تیسرے دن اماں کو ایک اور اٹیک ہوا۔ وہ ہم سے جدا ہو گئیں۔ شفاعت بھیا خاموش بت بن گئے۔ اماں کے سرہانے سے ایک بار بھی نہیں اٹھے۔ سعید بھائی' شیراز بھائی نے رلانے کی کوشش کی' مگر' نہ روتے تھے' نہ سوتے تھے۔

اماں کا چالیسواں ہو گیا۔ چالیسویں کے بعد اماں کے

کمرے کو چھیڑا گیا تو ایک بکس پر سب کی آنکھیں ٹک کر رہ گئیں۔ عنایت بھائی نے صفیہ بھابھی کے کہنے پر بکسے کا تالا توڑا اور صفیہ بھابھی کا منہ بن گیا۔

"یہ بھی کوئی بات ہوئی۔۔۔ اتنا بڑا دھوکا۔" میں نے تیز نظروں سے انہیں گھورا اور نور العین بھابھی' شفاعت بھائی کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئیں۔ شفاعت بھائی چیزیں نکالتے جاتے اور روئے جاتے۔

میرے کھلونے' عنایت بھائی کا ریپ کا بہترین نمبروں سے پاس ہونے کا رزلٹ کارڈ' اجمل بھیا کے اسکول میں ایوارڈ لینے کی تصویر' سلمیٰ آپا کی ننھی سی فراک' عائشہ باجی کی چھوٹی سی جوتی' جسے پہن کر وہ پہلا قدم اٹھانے کے قابل ہوئیں اور سب سے آخر میں سلمیٰ آپا کا تازہ دکھ' ان کی بیوگی کا سفید دوپٹا۔

بکس خالی ہو گیا اور شفاعت بھیا کے مجسمے میں پہلی بار تحریک ہوئی۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ بس روئے جا رہے تھے۔

"میرے لیے کچھ نہیں' میرا کچھ بھی نہیں۔" مجھے وہ سائیکو لگنے لگے تھے۔ تب ہی میں نے انہیں سینے سے لگا لیا۔

"نشانیاں ان کی رکھتے ہیں' جو آپ سے دور ہوں۔۔۔ جو دل کے قریب ہوں' سانس کی طرح ہر وقت دھڑکن میں شامل ہوں' ان کی نشانی رکھنے کا فائدہ۔۔۔"

یوں لگا' اس جملے نے ان کے اس لہجے کے احساس محرومی کو چھو لیا تھا۔ وہ چپ ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

اور رات گئے نور العین بھابھی میرے سامنے بیٹھ کر روئے جا رہی تھیں۔

"اماں نے اتنی عادتیں خراب کر دی ہیں ان کی کیا کریں گے وہ؟ کیسے جئیں گے ان کے بغیر؟ انہیں تو اپنے جوتوں کے تسمے تک باندھنے نہیں آتے۔"

میں صبح اٹھا۔ آج چالیسویں کے بعد وہ پہلی بار آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ بھابھی ناشتا بنا رہی تھیں۔ تب ہی انہوں نے سلمیٰ آپا کو کہا۔

"ذرا چائے دیکھنا۔ میں ان کے جوتوں کے تسمے باندھ آؤں۔" سلمیٰ آپا چولہے کے پاس گئیں۔ نور العین بھابھی دروازے سے باہر بھی نہیں نکلی تھیں کہ وہ ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھ گئے۔ ان کے تسمے بندھے ہوئے تھے۔

"وہ بہت ماہر سائیکاٹرسٹ ہے۔ اس نے اپنی ماں کو ہر کام میں' گھر کے چھوٹے سے چھوٹے کام میں اتنا انوالو رکھا کہ وہ اپنی بیماری کی طرف توجہ دے سکیں' نہ اس غم کو دل سے لگایا کہ وہ بچوں کے جوان ہونے پر عضو معطل ہو گئی ہیں۔ بہت کم بچے اس طرف توجہ دیتے ہیں۔ خاص طور پر بیٹے تو اور کم۔" میرے دماغ میں ڈاکٹر انکل کے جملے گونج رہے تھے۔ میں بھاگ کر اٹھا اور ان کے سینے سے لگ گیا۔

"آج میری ہر نفرت آپ کی محبت کے آگے باطل ہے۔ اگر آج کوئی کہتا ہے کہ اماں صرف شفو کی تھیں تو میں کہوں گا' یہ ان کا حق ہے' کیونکہ شفو بھی تو صرف اماں کا تھا۔ وہ جتنا اماں کا تھا' شاید خود اپنا بھی اتنا نہیں تھا۔"

شفو بھیا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ نور العین بھابھی نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر محبت سے کہا۔

"اماں نہیں ہیں تو کیا' میں اماں کی چوائس کے مطابق آپ کی ڈریسنگ کا خیال رکھوں گی۔ شاید وہ مجھ سے خوش ہو جائیں۔" شفاعت بھیا نے محبت سے انہیں دیکھا اور نرمی سے بولے۔

"وہ تم سے ناراض نہیں تھیں۔ کبھی ماں اپنی بیٹیوں سے ناراض ہوتی ہیں' اگر ہوں بھی تو ان کا غصہ یوں رفع ہوتا ہے۔۔۔ یوں۔" انہوں نے انگلیوں سے چٹکی بجائی۔ نور العین بھابھی مسکرانے لگیں اور میں نے دعا کی تھی کہ یہ مسکراہٹ سدا اماں کی دعا بن کر شفو بھیا کی زندگی کو سنوارتی رہے۔



قانتہ رابعہ

زندگی ایک اوٹ ہے

سونے جاگنے کی کیفیت میں بہت دیر تک تو عمیمہ یہی سوچتی رہی کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے؟ بالآخر آنکھیں کھلیں ذہن جاگا تو سرہانے پڑا سیل فون گنگناتا پایا۔

"نمرہ کالنگ۔" نمرہ اس کی جیٹھانی تھی۔ عمیمہ سے اچھی خاصی گپ شپ تھی۔ کال اٹینڈ کرنے بھی نہ پائی تھی کہ باہر دروازہ پر گھنٹی بجی۔ لگتا تھا کوئی ہاتھ رکھ کے بھول گیا ہے۔

"نمرہ! ایک منٹ میں دروازہ کھول آؤں۔ پیکج ہے نا تمہارا۔" کہہ کر اس نے موبائل بیڈ پر پھینکا اور تیزی سے دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھی۔ گیٹ پر صفائی والی ماسی تھی۔

"سلام بی بی جی۔" عمیمہ کو دیکھتے ہی اس نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔" عمیمہ واپس پلٹی۔ "دروازہ بند کردو بلکہ چٹخنی لگادو۔" بغیر دیکھے اس نے کام والی ماسی کو مخاطب کیا۔ دوسرا قدم اٹھایا بھی نہ تھا کہ لینڈ لائن پورے زور شور سے چیخ اٹھا۔ عمیمہ کے بڑھتے قدم رک گئے۔ لاؤنج والا سیٹ خراب تھا۔ اس نے کارڈلیس اٹھایا اور سامنے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔

"ہیلو! السلام علیکم! کون؟"

عمیمہ سیل فون اور اس پر ہولڈ کروائی گئی نمرہ کی کال کو بھول گئی۔ اس نے ٹانگیں پساریں اور کارڈلیس کان سے لگایا۔

"وعلیکم السلام! حبیبہ بات کررہی ہوں۔ سو تو نہیں رہی تھیں۔ گھنٹہ بھر بیل ہوتی رہی ہے۔" حبیبہ نے خفگی سے کہا۔

حبیبہ کی آواز سنتے ہی اس کے اندر سکون کی لہر دوڑ گئی۔ اس کی فرسٹ کزن کلاس فیلو، دوست، پڑوسن کون سا رشتہ اور کون سی یاد اس سے وابستہ نہیں تھی۔ اب حبیبہ کا نمرہ کے بھائی سے دو ماہ پہلے نکاح ہوچکا تھا۔

"جی جناب! کیا حال ہے۔ پورے سولہ دن کے بعد فون کیا ہے۔" عمیمہ نے خوش دلی سے کہا۔

"کیا پوچھتی ہو۔ مصروفیت ہی مصروفیت۔ کام کام اور بس کام۔ شادیاں خانہ آبادیاں اور ہمارے لیے نری بربادیاں۔"

"کیا ہوا؟ کس کی خانہ آبادی اور کس کی خانہ بربادی ہوگئی؟" عمیمہ نے پوچھا۔

"کچھ ہماری سسرال میں اور کچھ تمہاری سسرال میں۔" حبیبہ نے دل جلے انداز میں کہا۔ عمیمہ بے اختیار ہنس پڑی۔ پچھلے دنوں واقعی ریکارڈ توڑ شادیاں ہوئی تھیں۔

"رہی بات خانہ بربادی کی تو۔ خاتون محترم "مرے تھے جن کے لیے وہ رہے وضو کرتے" اتنا دل لگا کے اپنے آپ کو بنا سنوار کے پارلر سے تیار ہو کے جب اس امید پر شادی ہال میں پہنچے کہ صاحب بہادر بھی آئے ہیں ملاقات کے چانسز سو فیصد ہوں گے تو پتا چلا ان کے ہاں بھی ایک عدد "حکومت آپا" پائی جاتی ہیں ہنستے ہوؤں کو رلانے والی نمرہ بیگم۔ ایسے مجھے اپنے بچو نگڑوں میں مصروف رکھا کہ کچھ پتا نہ چلا کب دلہن آئی اور کب گئی۔ بس یہی رٹے رٹائے فقرے۔ حبیبہ جانی! ذرا اسدید کو تو پکڑنا۔ گود میں لے کر فیڈر پلانا۔ فیڈر زیادہ اوپر نہ کرنا۔ ایک دم اچھو لگ جائے گا۔

حبیبہ جی! یہ آفت کی پڑیا سلونی کی فراک تو چینج کردو۔ خراب ہوگئی ہے۔ ذرا دھیان سے اس کی زپ بہت چبھتی ہے۔" حبیبہ ساری داستان سناتے سناتے رونے والی تھی۔ آواز دکھی ہوگئی۔ عمیمہ ہنس پڑی۔

"کوئی بات نہیں۔ اکلوتی بھابھی ہو۔ اتنا تو حق ہے نا۔"

"خاک حق ہے۔ ابھی تو ان کے گھر نہیں گئی۔ پھر تو شاید امجد کی شکل بھی نہ دیکھنے دیں۔ تمہیں کیا پتا کتنی آرزوئیں امنگیں اور شادی ہال سے سیدھے کسی پارک میں جانے کا خواب لے کر گئی تھی۔ تم بتاؤ! نمرہ تمہارے ساتھ بھی ایسی ہی ہے۔ تمہاری بھی تو سسرالی رشتہ دار ہے۔ تمہاری جیٹھانی صاحبہ۔" حبیبہ نے "جیٹھانی" لفظ خوب چبا کر ادا کیا۔

"اونچ نیچ تو سسرالی رشتوں میں چلتی ہے۔ اصل میں نمرہ خود بہت اچھی ہے۔ ہمارے یہاں بھی "حکومت آپا" پائی جاتی ہیں نا۔ زہرہ آپا۔" عمیمہ نے اپنی بڑی بیوہ نند کا نام لیا۔ "وہ میرا تو چھوٹی بھابھی ہونے کے ناطے کچھ لحاظ کرتی ہیں کہ نئی ہے لیکن نمرہ کے ساتھ خوب تو تکرار ہوتی ہے۔ نمرہ کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے میاں یعنی اظہر بھائی دبئی ہوتے ہیں سارے مسائل کا اسی کو سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا یہاں بھی اکثر معاملہ خراب ہوجاتا ہے۔" عمیمہ نے وضاحت کی۔

"لیکن زہرہ آپا تو بڑی خوش اخلاق اور باوقار لگ رہی تھیں۔ شادی میں کتنا اچھا استقبال کررہی تھیں سب کا۔" حبیبہ شاید اس کی وضاحت سے مطمئن نہ ہوسکی تھی۔

"ظاہر ہے! باوقار تو وہ ہیں۔ جو عورت جوانی میں بیوہ ہوجائے اور وہ اپنی عزت و عصمت کو بچا بچا کر رکھے اس میں ایک غیر محسوس رعب دبدبہ تو خود بخود آجاتا ہے۔ خیر! چھوڑو تم بتاؤ تم نے اپنی شادی والا ڈریس بننے کے لیے دے دیا۔" عمیمہ نے گفتگو کا موضوع بدلا۔

"اپنی طرف کا تو میں نے فراک ہی بنوایا ہے۔ میرا خیال تھا کہ ادھر سے لہنگا ہوجائے گا۔ ابھی آرڈر آئے ہیں کہ لہنگا تو بعد میں استعمال کے قابل نہیں رہتا... حق حلال کی کمائی کا پیسہ ایک ہی فنکشن میں برباد کردینا کہاں کی عقل مندی ہے لہٰذا ولیمہ میں بھی ادھر کا فراک ہی ہوگا۔ بس کلر اور ڈیزائن میں فرق ہوگا۔" حبیبہ نے دکھ سے کہا۔ یہ تو عمیمہ جانتی تھی کہ اسے ہر فن فیر پر دلہن بننے اور لہنگا پہننے کا کس قدر شوق تھا۔ وہ اس کے دل کی کیفیت بخوبی جانتی تھی۔ پھر بھی اس کا غم ہلکا کرنے کو پوچھا۔

"کس نے منع کیا لہنگا بنانے سے؟"

"آپ کی جیٹھانی، نمرہ بیگم نے۔" حبیبہ نے جل کر کہا۔

"نمرہ نے؟ وہ ایسے کیوں کہے گی؟" عمیمہ نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ بھی آپ اپنی زہرہ آپا سے پوچھیں۔ شاید انہوں نے اسے اپنی شادی پر اس کی پسند کے لباس سے روکا ہوگا۔ اس لیے یہ مجھ سے بدلہ لے رہی ہے۔"

عمیمہ نے اپنے بیڈ روم سے باہر نظر دوڑائی۔



شاید کام والی ماسی سے کوئی چیز ٹوٹی تھی۔ اس کی کسی سے بات کرنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے حبیبہ سے پوچھا۔

"حبیبہ! آپ پیکج ہے نا فون پر؟ ایک منٹ... باہر کوئی آیا ہے شاید... میں دیکھوں..." اور یہ کہتے ہی عمیمہ کے چودہ طبق روشن ہوگئے... دروازے میں زہرہ آپا کھڑی تھیں... بے اختیار اس نے ہاتھ بڑھا کے کارڈلیس کا بٹن آف کرنا چاہا۔

"ا... ف..." فوراً یاد آیا کہ وہ نمرہ کو ہولڈ کروا کر دروازہ کھولنے گئی تھی۔ اس نے بے تابی سے سیل فون اٹھایا۔

"ہیلو... وہ نمرہ میں..." عمیمہ ہچکچائی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا' نمرہ نے کال آف نہیں کی تھی۔ ابھی تو وہ آسمان سے بھی نہیں گری تھی۔ کھجور میں اٹکنے کا مرحلہ تو بہت دور تھا۔ اس کی ہیلو کی آواز سن کر نمرہ نے کال منقطع کردی۔ کارڈلیس بھی دوسری طرف سے آف ہوچکا تھا یا شاید بجلی چلی گئی تھی۔

"زہرہ آپا! آپ کب آئیں؟" اس نے اٹکتے اٹکتے پوچھا۔

"تم نے شاید دیکھا نہیں۔ میں کام والی ماسی کے پیچھے ہی اندر داخل ہوئی تھی اور لاؤنج میں تھی اس وقت سے۔" عمیمہ بری طرح سے گڑبڑا گئی... کیا کہے اور کیا نہ کہے کہیں نمرہ بات سن نہ لی ہو۔

عمیمہ کا دل چاہ رہا تھا' چیخ چیخ کر روئے۔ آج حبیبہ بی بی نے نمرہ کو اور اس نے زہرہ آپا کو رگڑا دیا۔ دونوں کے کانوں میں اس کے فقرے پہنچ گئے۔

وہ نظریں جھکائے بیٹھ گئی۔ کام والی ماسی چائے کی ٹرالی رکھ گئی تھی۔

"زہرہ آپا! چینی کتنی لیں گی؟" اس نے چائے کے کپ کی طرف اشارہ کیا۔

"ایک منٹ... عمیمہ! ابھی نہیں۔" انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

"آج تمہاری حبیبہ سے پچیس منٹ کی گفتگو ہوئی ہے۔ جو نہ چاہتے ہوئے بھی تمہاری غلطی سے مجھے سننا پڑ گئی۔ تم نے سوچا اس گفتگو سے کتنے دل خراب ہوں گے؟ اس گفتگو میں سے کتنے الفاظ اوپر والے کی بارگاہ میں مقبول اور کتنے مردود ہوئے ہوں گے۔؟ بالفرض نمرہ نے تمہاری پوری گفتگو نہ بھی سنی ہو مگر تمہاری گفتگو میں اس کے نام کی تکرار نے اسے کتنی بدگمانیوں کا شکار کیا ہوگا؟"

عمیمہ کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ زہرہ آپا نے اسے پاس بٹھایا اور نرمی سے بولیں۔

"جس طرح تمہارے پاس پانچ ہزار یا ایک ہزار روپے کا نوٹ ہو۔ اس کا چینج کہیں سے بھی مل سکتا ہے۔ ایک ایک روپے کا سکہ الگ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح میری' تمہاری بلکہ سب کی زندگی خدا کے ہاں ایک نوٹ ہی کی طرح ہے... روز حشر میرا سچا منصف مسند پر بیٹھا اس زندگی کا ایک ایک سانس' چینج کی شکل میں الگ کرتا جائے گا... سانسوں کی گنتی کرنا اس قادر مطلق کے لیے کیا مشکل کام ہے؟ یہ غیبتوں کے سانس ہیں... یہ چغلیوں کے... یہ ذکر الٰہی کے یہ... یہ..." زہرہ آپا کی آنکھوں میں پانی جھلمل کرنے لگا۔

"اس نوٹ میں سے آج کے سانس الگ کرلو... کیا اس فون پر کوئی سانس کارآمد ثابت ہوا؟ خلق خدا کو کتنا نفع پہنچا؟ اگر اس ایک کال میں ایک سانس رب کی رضا کا نہیں تو زندگی بھر کے سانسوں کا حساب لگاؤ۔ میری بیٹی... میری بچی! زندگی کے اس نوٹ کی قدر کرو... اللہ کے لیے اسے ضائع مت کرو... ابھی بھی کچھ نہیں ہوا... نمرہ سے کھلے دل سے معافی مانگو... وہ دل کی بہت اچھی ہے... دلوں میں بال آجائے تو محبت میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔ بلند بوس عمارتیں شکستہ ہوجاتی ہیں اور آئندہ کے لیے پیکج کا نہیں... دل کا سوچنا... وہ تو خراب نہیں ہوا۔"

عمیمہ بس آنسو پونچھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ زندگی بھی ایک پیکج ہے...!!!



آسیہ رزاقی

صبحِ فیصلہ

چھن چھن چھناک۔

کچن سے ٹوٹے برتنوں کی فریاد نے لاؤنج میں بیٹھے مہمانوں اور میزبانوں کو چونکا دیا۔ کسی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اوف۔ آئے ہائے کے نعرے لگائے مگر ماں نے اٹھک بیٹھک کے ذریعے ناگواری کا اظہار کیا۔ گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ پھر بیٹھ گئیں۔ کھڑی ہوئیں۔ پھر معذرتی مسکراہٹ کے ساتھ بیٹھیں۔ دل میں غبار اٹھ رہا تھا۔ پھر کچھ بڑبڑاتی باہر آگئیں مگر کچن میں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ نہ جانے کون سا دل شکن منظر سامنے آجائے۔

سب سے پہلے شہری ہی کچن میں داخل ہوا تھا۔

"کیا توڑا؟" حسب معمول طنز کا پیرایہ۔

"تمہارا سر نہیں، کم از کم۔" ادھر ڈھٹائی انتہا کی تھی۔

"اوہو۔ اچھا۔ اچھا۔ گلاس۔" وہ سنک میں جھکا ہوا تھا۔ "چار گلاس، یعنی یک شد نہ دو شد، اکٹھے چار شد، خس کم جہاں پاک۔"

حساب کا ماہر تھا۔ کرچیاں تک گن کر تعداد معلوم کر لی۔ پیچھے سے "اوہو" کی آواز کے ساتھ اسما نے اپنی آمد کا اعلان فرمایا۔

"امی نے پوچھا ہے، کیا پورا سیٹ شہید ہو گیا؟ انہیں غصہ آرہا ہے۔"

"انہیں اس کے سوا اور آتا بھی کیا ہے؟" سنک سے گلاسوں کی کرچیاں چنتی ہوئی صاعقہ نے تنگ کر

مکمل ناول





جواب دیا۔
"اور تمہیں۔۔۔ برتن توڑنے کے علاوہ اور بھی کچھ آتا ہے؟" شہری سوچتے ہوئے اندازہ لگانے لگا۔ "چار گلاس۔۔۔ بھلا کتنے کا نقصان ہوا؟"

ہونٹوں پر انگلی مارتا، پلکیں پٹپٹاتا ہوا زہر لگ رہا تھا۔ دل میں ایک تھپڑ رسید کرنے کی انتہائی کوشش کو دل میں دباتی ہوئی وہ شیشے کے ٹکڑے اور کرچیاں بڑی مہارت سے چن کر ڈسٹ بن میں ڈال رہی تھی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔

اسما ہونٹوں کو دائرہ کی شکل بنائے کتنی دیر تک یوں ہی کھڑی رہی۔ سکتے کے عالم میں۔۔۔ ایکٹنگ سراسر۔۔۔ اس گھر کا ہر فرد اچھا خاصا اداکار تھا۔

نغمہ بھلا پیچھے کیوں رہتی۔ سہیلیوں کا منڈپ چھوڑ کر صاعقہ کی بے عزتی کا منظر دیکھنے آگئی۔

شہریار اور اسما دونوں کسی کی بھی عزت اچھال کر ہتھیلی پر رکھ دینے کے ماہر تھے۔ خصوصاً "صاعقہ پر تو یہ وقت روز بلکہ دونوں وقت آتا تھا۔ وہ روٹی جلا دے۔ سالن میں نمک کم زیادہ ہو۔ چاول کچے رہ جائیں یا زیادہ گل جائیں۔ صاعقہ کی شامت آئی ہی رہتی۔ نکمے پن کی فہرست سن کر صاعقہ سر پر ہاتھ رکھ کر بچاؤ کے لیے سمٹ جاتی۔ گو کہ ابھی تک تو کسی نے بھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ ہاں! زبان کے تیروں کے جوہر خوب دکھائے گئے۔

جواب میں صاعقہ کا چہرہ دیکھنے کے لائق ہوتا۔ نغمہ کو یہ منظر پسند تھا مگر اس وقت۔۔۔ مہمانوں کی مروت، لحاظ میں اسما تو صرف حیرت اور دکھ کا اظہار ہی کر سکی۔ شہری نے بھی شرافت دکھائی۔ نغمہ مایوس ہو کر لوٹ آئی۔

گھر میں کافی افراد تھے۔ ماموں، مامی، ان کی تین بیٹیاں اور لاڈلا بیٹا شہریار۔ سب تعلیم یافتہ تھے مگر لگتے نہ تھے۔ جاہلانہ طور طریقے، بدزبانی، بے رخی، خودغرضی انتہا کو۔ صاعقہ نے بھلا یہ انداز کب دیکھے تھے۔ اسے افسوس تھا۔ ماموں کے گھر کے چلن اس قدر اذیت ناک ہوں گے معلوم ہوتا تو کیوں ضد کر کے آتی۔

اس سے پہلے وہ خالہ کے گھر گئی تھی۔ واہ! خالہ تو واقعی خالہ تھیں۔ ماں سی۔ وہاں کے عیش و آرام، خالہ کے گھر کا رکھ رکھاؤ، محبت، ان کے وجود میں امی جیسی خوشبو تھی۔ ان کی اولاد بھی انہی جیسی تھی۔ محبت اور خیال کرنے والی۔ مگر خالو جان بہت اکھڑ، مغرور اور ہٹ دھرم تھے۔ وہ کسی جاگیردار جیسے شان و شوکت والے نظر آتے تھے۔ ان کا سامنا کرنا شامت کو آواز دینا تھا۔

"اے لڑکی! ادھر کیا کر رہی ہو۔ بہت نازک اور قیمتی چیزیں ہیں۔ یہ چھونے کے لیے نہیں ہیں۔ ٹوٹ سکتی ہیں، ہٹ جاؤ۔" وہ تو ان قیمتی اشیا کی صفائی کر رہی تھی خالہ جان سے اجازت لے کر۔

"اے لڑکی! ادھر آؤ۔ لان میں تمہارا کیا کام ہے۔" دوڑیں لگا رہی تھیں۔ گھاس کا ناس کر دیا۔ پیرس سے منگائی ہے یہ گھاس۔ تمہارے باپ، دادا نے بھی نہیں دیکھی ہوگی، اتنی قیمتی ہے۔"

اگر صرف رعونت کا لہجہ ہوتا تو برداشت کر لیتی مگر انہوں نے تو اس کا کان اس زور سے کھینچا کہ اس کی سسکی نکل گئی۔ غصہ غالب آگیا۔ کان چھڑا کر دور ہوئی اور چیخ کر بولی۔

"کھانے کے لیے لگائی ہے، پھر کھاتے کیوں نہیں؟"

انہیں لال پیلا ہوتا دیکھا تو اندر بھاگی اور زینہ پھلانگتی اوپر پہنچ گئی۔ یہ جگہ پرامن تھی۔ خالو جان گھٹنوں کے درد کی وجہ سے اوپر نہیں آسکتے تھے مگر جانتی نہ تھی۔ ان کی یادداشت گھٹنوں کی طرح کمزور نہ تھی۔

خالہ جان کے بلانے پر جوں ہی کھانے کی میز کے قریب آئی۔ خالو جان ایک جھٹکے سے کرسی سے کھڑے ہو گئے اور چلائے۔

"یہ لڑکی یہاں کیوں آئی ہے۔ بدزبان، بدتمیز!"

خالہ جان ہکابکا ہو گئیں۔ وہ خود بھی ہونق بنی کھڑی تھی۔

"صبیحہ!" وہ پھر چیخے۔ "اسے کچن میں کھانا دیا کرو۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"

خالہ جان نے سہولت سے کہا۔ "اچھا، اچھا، یہ کچن میں ہی کھا لے گی۔ آپ تو بیٹھیں۔" وہ خالو جان کو اسی طرح بہلاتی تھیں۔ جیسے وہ بچہ ہوں۔ اسے پھر غصہ آگیا۔

"کچن میں ہی کھا لوں گی۔ وہاں بھی یہی کھانا ہوگا۔ گھاس نہیں۔"

اور بھاگی۔ وہ جانتی تھی خالو جان کا اشارہ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ آئندہ وہ روز کچن میں ہی کھائے گی ملازمہ نصرت کے ساتھ۔ کچن کافی کشادہ تھا اور بہت سجا سنورا، میز، کرسیاں بھی تھیں۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ اسے میز پر کھانا ملے گا یا نیچے فرش پر۔ پلاسٹک کی ٹوٹے کناروں والی پلیٹ میں خانساماں اپنا کھانا لے کر کوارٹر جا چکا تھا۔ نصرت، صاحب لوگوں کے کھانا ختم ہونے کے انتظار میں گیلری میں کھڑی تھی۔ اب اسے نصرت کے ساتھ کھانا ملے گا۔ اف اتنی ذلت! خالو جان کہیں کے بادشاہ ہیں یا راجہ مہاراجہ۔

خالہ جان کچن میں داخل ہو رہی تھیں۔ ہاہ! بے چاری خالہ جان کو میری وجہ سے نکال دیا گیا تھا۔ خالہ جان چولہے کی طرف متوجہ تھیں۔ پھر پیالوں میں سالن، دال وغیرہ نکال کر میز پر رکھا۔ روٹی اور چاول۔

"آؤ صاعقہ! پلیٹیں اٹھا لو، کھاتے ہیں۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"خالہ جان۔۔۔ آ۔۔۔ آپ۔"

"بھئی۔۔۔ بھوک برداشت نہیں ہوتی مجھے۔ آؤ بیٹھو! ہاں اوون سے کباب بھی نکال لو۔"

"آپ سب کے ساتھ کھا لیتیں۔"

"کیوں بھئی، تمہیں میرے ساتھ کھانا اچھا نہیں لگتا۔ آؤ!" اصرار کیا۔

کھانے میں اس قدر لطف آیا کہ حد نہیں۔ خالہ جان نے کچھ لطیفے بھی سنائے۔ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ "خالہ جان! خالو جان کو پتا ہے کہ آپ یہاں۔۔۔"

"ہاں بھئی، کہہ کر آئی ہوں کہ میں اپنی بھانجی کے ساتھ کھانا کھانے جا رہی ہوں۔"

"خالہ جان! آپ بہت بہادر ہیں کیا؟"

"تم سے کم۔۔۔ جو مرزا رعونت بیگ کو منہ توڑ جواب دے۔ بہادر تو وہ ہے۔"

"لیکن۔۔۔ وہ ناراض ہوں گے۔ آپ کیوں کچن میں کھائیں۔" اسے خالہ جان کا انہیں دیا ہوا نام مزے کا لگا۔

"میں کہہ دوں گی جہاں میری بھانجی کھانا کھا سکتی ہے، میں وہیں کھاؤں گی اور یہ کوئی ذلت کی بات

نہیں۔ یہ میرا گھر ہے۔ جہاں چاہوں بیٹھ کر کھالوں خواہ وہ سرونٹ کوارٹر ہی کیوں نہ ہو۔ نوکر بھی انسان ہوتے ہیں' ہم جیسے مجھے تو ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا منظور ہے۔"

اس دن کے بعد سے وہ کچن میں ہی کھانا کھاتی۔ کبھی نصرت کو بھی بٹھا لیتی اور کبھی اقصیٰ' اقرا بھی اس کے ساتھ شریک ہو جاتیں مگر اقصیٰ کو رکھ رکھاؤ اور ڈسپلن کا زیادہ خیال تھا۔ وہ کھانا ٹرالی میں رکھ کر اپنے کمرے میں لے آتی۔ صاعقہ کو اشارے سے بلا لیتی۔

ان لوگوں میں خالو جان جیسا غرور نہ تھا۔ اقرا جاب کرتی تھی۔ اقصیٰ کالج میں پڑھتی تھی۔ سب سے بڑے بھائی علی حسن بے حد سنجیدہ اور خاموش طبع تھے۔ صاعقہ سلام کرتی۔ جواب دے کر خاموشی یا اخبار میں گم ہو جاتے یا پھر اپنے کمرے میں میوزک سے دل بہلاتے۔ بہنوں کو بھائی پر فخر تھا۔ ان کی سنجیدگی' خاموشی' فضول گوئی سے پرہیز۔ انہیں تو وہ ہیرو لگتے۔ علی حسن بہترین لباس پہنتے۔ اپنا بہت خیال رکھتے۔ جاگنگ کی پابندی۔ گولف کھیلنا۔ کافی امیرانہ شوق تھے۔ ان کا حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ جو دوست احباب تھے۔ وہ بھی اعلا تعلیم یافتہ' صاعقہ پر ان کا بہت رعب تھا۔

"بھئی واہ... بندہ ہو تو علی حسن بھائی جیسا۔" کسی آئل کمپنی میں جاب کرتے تھے۔ اس نے خالہ جان سے پوچھ لیا۔

"بھائی کبھی آپ سے بھی باتیں کرتے ہیں؟"

"ہاں بھئی! میں اس کے کمرے میں جاؤں' تو خوب چہکتا ہے' بس سب کے سامنے خاموش۔"

صاعقہ کا خیال تھا' ان پر اپنے ابا کا رعب ہے یا کسی جن کا سایہ۔

اقرا' اقصیٰ کے جانے کے بعد وہ اکیلی ادھر ادھر گھوما کرتی۔ خالہ جان یا تو فون پر مصروف ہوتیں' یا ان کے پاس خواتین آجاتیں۔ خالو جان بھی ڈرائنگ روم میں ملاقاتیں کر رہے ہوتے' لان میں جانے پر تو پابندی تھی۔ چیزوں کو چھونے کی ممانعت' کیا کرے' ٹی وی بھی کب تک دیکھے۔ اس دن اس نے کھڑکی سے جھانکا۔

جہاں جہاں اس کے قدموں نے گھاس کو روندا تھا۔ وہ ہیرے' جواہرات نگی گھاس۔ اب وہاں نئی گھاس لگائی جا رہی تھی۔ حالانکہ پرانی گھاس جوں کی توں تھی۔ مگر خالو جان کا وہم' اتنا بڑا لان' خوب صورت سرسبز' پھولوں کی کیاریوں سے سجا ہوا مگر... بے کار۔ کوئی وہاں جاتا نہ تھا۔ بیٹھتا نہ تھا۔ عجیب خشک لوگ ہیں۔ خالی دیکھنے کے لیے اتنا خرچہ۔ اُف!

اس نے اب اپنی بے کاری کا مشغلہ تلاش کر لیا۔ کچن میں جا کر نصرت کی مدد کر دیتی' برتن اٹھانے رکھنے میں' یا خالہ جان اقرا کے کمروں میں چیزیں سمیٹتیں تو ہاتھ بٹا دیتی۔ خالو جان کا کمرا الگ تھا۔ پتا نہیں' کیسے میاں' بیوی تھے۔ خالہ جان نے ان کے ساتھ کس طرح گزارا کیا ہوگا۔

اس نے خالہ جان سے کہا۔ "آپ مجھے کوئی اچھی سی ڈش بنانا سکھادیں۔"

خالہ جان مسکرائیں۔ "مجھے کب کچھ بنانا آتا ہے۔"

"تو نصرت سے کہیں۔ وہ مزے دار سی ڈش سکھا دے گی۔"

"نصرت ہی کھائے گی پھر۔" اقصیٰ ٹی وی میں منہمک تھی۔ مگر کان ادھر ہی تھے۔ "ہم تو نہیں کھا سکتے۔ عجیب سی ملغوبہ شے بنائی تھی ایک بار۔"

"تو خانساماں... وہ تو اچھا کھانا بناتا ہے۔"

"تمہیں کچھ بھی سیکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ تمہاری ماں تو ہر کام میں طاق تھی۔ اس نے پھر زندگی بھر کھانے پکائے۔ کپڑے سیے' میں نے کچھ سیکھا ہی نہیں۔ اماں ناراض ہوتی تھیں مگر میں شروع سے آرام طلب تھی۔ نصیبوں کی بات ہے۔ اب بھی عیش ہی کرتی ہوں۔ تم بھی... ان شاء اللہ عیش کرو گی۔ آگے پیچھے نوکر اور آرام ہی آرام۔" وہ حیران ہو گئی۔

"واہ... خالہ جان نے تو نئی کہانی سنائی۔ یعنی کام سیکھنے اور کرنے والے ہمیشہ محنت کرتے ہیں۔ آرام کرنے والے آرام۔"

"امی خوش قسمت تھیں۔ اس لیے اچھا رشتہ آیا اور... ایک وجہ امی کی خوب صورتی بھی تھی۔ دادی نے بس یہی دیکھا۔" اقرا ترچھی نظروں سے صاعقہ کو دیکھنے لگی۔

"تو ایسی بھی کیا بات ہے۔" وہ فخریہ بولی۔ "میں بھی اپنی امی کی ہو بہو تصویر ہوں۔ کیوں خالہ جان! امی بھی خوب صورت تھیں نا؟"

"ہاں... مگر حسین ہونے کے ساتھ کچھ خوبیاں بھی ہونی چاہئیں۔ **مثلاً**" امی کی طرح نیک نفس' صابر شاکر' منکسر' ہیں نا امی؟" اقصیٰ نے پھر دخل دیا۔

"ارے بیٹا! خوش نصیبی نہ صورت دیکھتی ہے' نہ عادات۔ اللہ جس کو چاہے نواز دے۔"

"میری امی خوب صورت تھیں۔ ان کی قسمت آپ جیسی کیوں نہ ہوئی۔"

"کیونکہ ان کی منگنی بچپن میں چچا زاد سے ہو گئی۔ ابا کو اپنے بھائی' بھتیجوں سے بہت محبت تھی۔ ان لوگوں کی تعلیم کم اور گھر کے افراد بہت زیادہ۔ حالات بہتر ہوئے ہی نہیں۔ افتخار بھائی مسلسل کمائی کی مشین بنے رہے۔ اب جا کے انہیں کچھ سکون ملا ہے۔"

خالہ جان سرد آہ بھر کر رو لیں۔ انہیں اپنی معصوم' پیاری' چھوٹی بہن یاد آگئی تھی۔ وہ بھی حالات کی چکی میں پستی رہی آخر... جان سے گزر گئی۔ صابر شاکر اور نیک نفس۔



ماموں کے گھر آکر' خالہ جان کے قول کی نفی ہو گئی۔ جب چند دن کی میزبانی کے بعد مامی نے اسے بظاہر سرسری سا کام میں لگا دیا۔

"خالی بیٹھے بیٹھے بچی گھبرا گئی ہے۔ کسی شغل میں لگ جائے۔ کچھ سیکھ بھی لے گی۔" کپڑے دھونے کی ٹریننگ مامی نے خود کھڑے ہو کر دی۔ پھر برتن بھی اس کے ذمے لگے۔ اس کے بعد تو سلسلہ چل پڑا۔ کھانا پکانے والی روٹھ کر چلی گئی تو مامی نے اسے روٹی پکانا سکھا دیا۔ اس کے بعد دال' چاول' سبزی' گوشت مگر اس کے ذہن میں خالہ جان کا قول چسپاں تھا۔ اس نے کچھ سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

اور بے دلی سے' جو کام کیا جائے۔ وہ ایسا ہی نکما ہوتا ہے۔ برتن ہاتھ سے پھسل جاتے' کھانا واجبی ہی بنتا۔ کبھی سالن جل گیا' کبھی چاول لگدی ہو جاتے۔ دال کچی رہ جاتی ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ اسے بہت کچھ سننے اور سہنے کا گر آگیا۔ وہ جس طرح بھی کھانا پکائے۔ سب کو صبر کے ساتھ کھانا ہی پڑتا' کیونکہ ان کے گھر کی لڑکیوں کو کام کرنے کی عادت نہ تھی۔ ایک دن شہری چلا اٹھا۔

"نہیں کھا سکتا میں اتنا بدمزا کھانا۔"

"نہ کھاؤ۔ اچھا ہے' بچت ہو گی' کیوں مامی؟" معصومیت لہجے میں سمو کر اس نے کہا۔

"نہیں... اگر کل بھی اتنا خراب کھانا بنایا تو میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

"میں تمہاری تنخواہ دار ملازمہ نہیں ہوں۔" وہ چلائی۔ "اور اگر یہ الفاظ تم نے ملازمہ سے کہے ہوتے تو وہ کب کا سب کچھ چھوڑ کر چلی جاتی۔ تمہارا سر توڑ کر۔ آیا سمجھ میں۔"

وہ غصے میں کھڑا ہو گیا۔ مامی نے کسی طرح اسے ٹھنڈا کیا۔ اس کے بعد وہ خود کھڑے ہو کر اسے ہدایتیں دیا کرتیں۔ اب کھانا بہتر بننے لگا۔

"جب آپ کو کچن میں ہی کھڑا رہنا ہے تو خود ہی پکا لیا کریں۔" ان کی ہدایتوں سے تنگ آگئی تھی۔ چمچہ سلیب پر پٹخ کر باہر نکل گئی۔

مامی الجھ گئیں۔ بیٹیوں کو بتایا۔ "بہت پر پرزے نکال لیے ہیں اس نے۔ مجھے بھی جواب دینے لگی ہے۔ بھلا بتاؤ' نہ جانے کتنے دن تک رہنا ہے۔ ہم کب تک اس کو مفت میں کھلائیں گے۔"

"تو پر کاٹ دیں۔" بڑی بیٹی راحمہ نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ پھر ماں' بیٹیوں کے درمیان میٹنگ ہوئی۔ آخر میں شہریار پر بھی دباؤ ڈالا اور پھر ماموں کے پاس مشورے کے لیے گئیں۔ وہ سوچنے لگے۔

"دیکھو جی! نہ جانے کیا ہوا ہے کہ افتخار نے تو پلٹ کر کچھ پوچھا تک نہیں۔ ہم تو اس کی بہتری کا سوچ رہے ہیں۔ آخر یہ ہماری ہی بچی ہے۔"

ماموں پر ان الفاظ کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ خود صاعقہ کے پاس گئے۔ مامی ساتھ تھیں۔ انہوں نے سب کی دلی خواہش اور اپنی بھی تمنا کا اظہار کیا کہ وہ ان کی مرحومہ بہن کی بیٹی ہے۔ وہ اسے بہت چاہتے ہیں۔

"تم اچھی طرح سوچ لو۔"

"سوچنے کی کیا بات ہے۔" مامی کا لہجہ شہد آگیں تھا۔ اس سے لپٹ گئیں۔ "میرے لیے تو یہ سب سے پیاری بیٹی ہے۔ میری اپنی بیٹیاں تو ہڈ حرام ہیں۔ یہی فرماں بردار ہے۔ بھئی باپ کے گھر سے نکل کر خالہ کے گھر گئی۔ وہاں بھی چار دن نہ رہ سکی سکون سے۔ میں تو اسے کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔ ہمارے سوا اس کا اور ہے بھی کون، بس فیصلہ ہو گیا۔"

ماموں نے اسے گومگو میں دیکھا تو کہنے لگے۔ "ہاں، ہاں، مگر صبیحہ سے مشورہ کرنا ہوگا۔ افتخار کی اجازت بھی لازمی ہے۔"

"کوئی صلاح مشورہ نہیں ہوگا۔" مامی چمک کر بولیں۔ "یہ ہماری ہے تو ہماری ہے۔ منگنی ابھی کر لیتے ہیں۔ افتخار کے آنے پر نکاح اور شہریار کی جاب مل جانے پر رخصتی، رہنا تو اسے اب یہیں ہے۔ ورنہ افتخار کبھی تو حال احوال پوچھتے۔"

وہ چپ بیٹھی پچھتاتی رہی۔ ابا کی طرف سے یہ لاپروائی، بے نیازی نئی نہ تھی مگر اب۔۔۔ یہ نیا شوشہ جو چھوڑا گیا ہے۔ اف ابا کے گھر کی وہ چیں پیں۔ بچوں کی ضدیں، شور شرابا، پھپھو کی نصیحتیں۔

"تمہیں کیا ضرورت ہے کچھ کرنے کی۔ تم کیوں ذمہ داری لوگی۔ کرنے دو فاخرہ کو۔ اپنے بچے خود پالے۔"

فاخرہ کا اصرار۔ "صاعقہ! بھائی کو بہلا لو ذرا۔ میں سکون سے کھانا تو بنا دوں۔ ارے احمر گر جائے گا سنبھالو اسے۔۔۔ اوہو! ذرا چھوٹی کے بال ہی بنا دیا کرو۔ افوہ۔۔۔ تم ذرا سی صفائی نہیں کر سکتیں۔ کتا بھی بیٹھتا ہے تو دم ہلا کر جگہ صاف کر لیتا ہے اور تم کچرے کے ڈھیر پر کس بے تکلفی سے بیٹھی ہو۔ جھاڑو لگا دو گی تو۔۔۔"

"نہیں لگا سکتی جھاڑو، نوکر نہیں ہوں آپ کی۔" وہ چلائی۔

پھپھو کی ہدایت تھی اسے کسی سے دبنے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھلا کیوں ڈرے۔ واہ جی یہ تو میری سگی اماں بن گئی ہیں۔ میں لاوارث نہیں ہوں۔ چلی جاؤں گی یہاں سے اور ابا۔۔۔ ان کو بھلا میری کیا پروا، چھوٹے بچوں کے لاڈ اٹھایا کرتے ہیں۔ میری اہمیت ہی نہیں۔

"ابا۔۔۔ میں پھپھو کے گھر جا رہی ہوں۔ وہیں رہوں گی اب آرام سے۔"

ابا پریشان ہو گئے۔ سمجھاتے رہے مگر وہ جو ارادہ کر لے اسی پر قائم رہتی تھی۔

"اتنا بدمزا کھانا بناتی ہیں آپ کی بیگم۔ شلجم، گاجر میں نہیں کھا سکتی۔"

"بیٹا! آج کل حالات ذرا۔۔۔ نوکری چلی گئی ہے۔ تلاش کر رہا ہوں۔ بس تکلیف کے دن تھوڑے ہیں۔ تم ذرا صبر سے کام لو، پھر۔۔۔"

"ابا! پھپھو کو فون کریں۔ وہ آکر مجھے لے جائیں گی۔"

ابا اس کی ضد کے سامنے مجبور تھے۔ فون اٹھایا۔ نمبر ملایا۔ وہ ان کے پاس گھس کر بیٹھ گئی۔ ابا نے بتایا۔ صاعقہ آپ کے پاس آنا چاہتی ہے۔ ادھر سے پھپھو کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"ہائیں! لڑکی کا دماغ خراب ہے کیا۔ یہاں کون سے بتاشے بٹ رہے ہیں۔ جو وہ لوٹنے آئے گی۔ لو اور سنو۔ میری نند کا تم کو پتا ہے۔ انہیں تمہاری بیٹی کے طور طریقے ذرا پسند نہیں۔ وہ تو مجھے کچا چبا جائیں گی۔ روکو اسے۔"

"آپا! کیسے روکوں۔ وہ بالکل تیار بیٹھی ہے۔"

"کیوں تیار بیٹھی ہے۔ ایک لڑکی تم سے نہیں سنبھالی جاتی۔ مرد بنو افتخار! نہ مانے تو اس کی پٹائی کرو۔ یہ کیا سینہ زوری ہے۔ جب جی چاہا گھر سے نکل پڑی۔

اسے بتاؤ۔ باپ کی چھت، باپ کا گھر لڑکی کی مضبوط پناہ گاہ ہوتی ہے۔ اس گھر سے نکل کر کہیں بھی سکون نہیں ملے گا۔ کون حفاظت کرے گا۔ بولو، آپے سے باہر نہ ہو تو اس کے لیے بہتر ہے۔"

ابا کے کندھے سے لگی وہ پھپھو کی ایک ایک بات سن رہی تھی اور ہکا بکا فون کو تک رہی تھی۔

پھپھو ہیں، اس کی ہمدرد، جو سوتیلی ماں کے ہتھکنڈوں سے بچانے کے لیے کیا، کیا تدبیریں بتاتی تھیں۔ کیسے کیسے مشورے دیا کرتی تھیں۔ ابا نے فون رکھ دیا۔ شرمندہ تھے۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

"ارے ہاں، بھول گئی، خالہ جان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ صبح مجھے بس میں بٹھا دیں۔ چار گھنٹے کا راستہ ہے۔ خالہ جان بس اسٹاپ پر آکر مجھے لے جائیں گی۔"

اس کے فوری فیصلوں سے افتخار بہت پریشان رہتے تھے۔ کسی کی سنتی نہ تھی۔ اگر زیادہ روک ٹوک کی جائے تو رونے لگتی تھی۔ اپنی قسمت کو برا بھلا کہتی۔ افتخار اس کی ہر خواہش پوری کر دیتے تھے۔ اس کی خواہش پر صبح اسے بس میں بٹھا کر انہوں نے صبیحہ بیگم کو فون کر دیا۔ انہوں نے تو تعجب کا اظہار کیا۔ نہ ہی کوئی اعتراض۔ بعد میں افتخار کی آپا نے اس کے خالہ کے گھر جانے کی خبر سنی تو خوب ابا کی خبر لی۔ جو اس فتنی کو قابو نہ کر سکے۔

"نہ جانے اپنی خالہ کے گھر جا کر کیا گل کھلائے۔ تمہیں بدنام کروے گی افتخار! میں تو اس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دیتی۔ اس کی مجال تھی گھر سے نکلنے کی۔"

زنجیریں تو ماموں نے اس کے پیروں میں ڈالی تھیں۔ ابا کے گھر سے نکل کر، پھپھو کا ٹکا سا جواب سن کر، خالہ کے گھر سے آکر، اب ماموں کے گھر کے سوا اس کا اور ٹھکانا ہی نہ تھا۔ اب۔۔۔ واپس ابا کے گھر جانے سے اس کی انا کو ٹھیس لگتی۔ اپنی ذلت وہ کیسے برداشت کرتی۔ ابا سے ماموں نے کیا بات کی۔ انہوں نے کیا جواب دیا۔ اسے خبر نہ ہوئی مگر۔۔۔ گھر میں خوشیاں منانے کی تیاری نے جواب ظاہر کر دیا۔

ہائے اللہ۔۔۔ یہ کیا ہو گیا۔ ابا مان گئے۔ پتا نہیں ماموں نے ان سے کیا کہا مگر منگنی کے دن سب بہنوں نے ڈانس کیا۔ شہریار کو خوب تنگ کیا اور ماموں نے اس کی انگلی میں پتلی سی سستی سی انگوٹھی پہنا دی۔

شہریار کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اسے یہ رشتہ منظور نہ تھا مگر آئندہ جو فائدے وہ حاصل کر سکتا تھا۔ منگنی میں مہمانوں کی خاصی کم تعداد تھی۔ چند پڑوسی اور مامی کے تین، چار رشتے دار۔ تصویریں بنائی گئیں اور چائے کے ساتھ نمکو، نمک پارے، سموسے اور تھوڑی سی گلاب جامن سے فنکشن نپٹا دیا۔ بعد میں وہ سبز و کاسنی چنری کا خوب صورت سوٹ جو منگنی کے دن اسے پہننے کو دیا گیا تھا۔ نغمہ لے کر چلتی بنی۔

"یہ میرا سوٹ تھا۔ اس میں تصویر اچھی آتی ہے۔ اس لیے تم کو پہنایا گیا۔ امی نے مانگا تو میں نے دے دیا۔ نئے سوٹ پر خرچا بھی بہت تھا۔"

"تم۔۔۔ اب میری اترن پہنو گی۔" وہ حیران تھی۔

"تم نے میری اترن پہنی تھی۔ نیا تھوڑی ہے۔ میں ذرا احتیاط سے استعمال کرتی ہوں۔"

وہ چلی گئی اور صاعقہ کتنی دیر تک افسوس کرتی رہی۔ سوٹ کے جانے کا نہیں، نغمہ کی اترن پہننے کا۔

اس دن کے بعد سے اس کے ہاتھوں سے برتن تواتر سے ٹوٹتے بکھرتے رہے۔ مامی پریشان تھیں۔ اختلاج قلب کا علاج کرانے کلینک چلی جاتیں۔ روز صبح اسے مامی کا محبت بھرا لیکچر سننا پڑتا۔ برتنوں کی احتیاط، ٹوٹنے کی صورت میں صاعقہ کے زخمی ہونے کا احتمال۔ ہاتھوں پر پٹیاں لگی ہوں تو کھانا بنانے میں دقت، کپڑے دھونے میں زخم بڑھنے کا خطرہ۔ وہ چپ چاپ سنتی برتن توڑتی رہتی۔

منگنی کے بعد اسے سوچنے کی عادت پڑ گئی۔ ابا کا نہ آنا۔ خالہ جان کی طرف سے بھی کوئی اشارہ نہ ملا۔ ان کی غیر موجودگی نے اسے بہت دکھ دیا تھا۔ شہریار ذرا بدمزاج تھا مگر شکل صورت کا بہت اچھا تھا۔

چلو۔۔۔ منگنی کا کیا ہے۔ جب دل بے زار ہوا، انگوٹھی شہریار کے منہ پر مار کر۔۔۔ وہ نکمی سڑیل

انگوٹھی پرانی فرسودہ اور منگنی کے نام پر جو لڈو اس کے منہ میں ٹھونسا گیا تھا۔ باسی، سخت اور کھٹا بھی تھا۔ متلی ہونے لگی تھی۔ مگر تھوکنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ مجبوراً "سانس روک کر حلق سے اتارا۔ جیسے بچپن میں اسے دوا پلاتے ہوئے ابا کہتے تھے۔ سانس روک کر غٹ سے پی جاؤ۔ کڑوی نہیں لگے گی۔ اس نے غٹ سے وہ بے مزا کھٹا لڈو حلق سے اتار لیا۔



آج نغمہ کی سہیلیاں تو آئی ہی تھیں۔ اسما کے رشتے کے لیے بھی مہمان آئے ہوئے تھے۔ سب کے لیے چائے بنا کر سرو کرنا، پکوڑے، سموسے، کباب، گاجر کا حلوہ، سب کچھ اس نے بنایا اور اب.... برتن دھونے کا سلسلہ، کسی نے ذرا بھی ہاتھ نہیں بٹایا۔ سب کی سب مہمان بنی بیٹھی تھیں اور راحمہ وہ تو میک اپ میں لتھڑی ایسی ہی لگیں، جیسے ٹی وی پر لڑکیاں لپی پُتی بناوٹی شکل لیے بیٹھی رہتی ہیں۔

راحمہ کو امید بھی کہ آج آنے والیاں اسما کے بجائے انہیں پسند کرلیں گی۔ اسی لیے وہ میک اپ کی حفاظت کی خاطر سیرا اونچا کیے منہ اٹھائے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھیں۔ ہائے بے چاری! اسے غصہ آرہا تھا۔ تھکن اور بے زاری اور سب کی بے حسی، پھر برتن توڑنا اس کا حق تھا، غصہ کہاں نکالے۔

"تمہارا دل نہیں دکھتا اتنے پیارے برتن توڑتے ہوئے۔" شہریار ابھی ڈٹا بیٹھا تھا۔ اسما، نغمہ جا چکی تھیں۔

"نہیں دکھتا۔ انسان ہوں۔ مشین نہیں۔ تھک جاتی ہوں تو برتن ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔"

"افوہ.... اتنی موٹی تازی ہو۔ اتنا کھاتی ہو۔ تھکتا کیسا؟"

"اچھا.... اپنی بہنوں سے کہو۔ وہ صرف ایک گھنٹہ کچن میں کھڑی رہیں۔ صرف کھڑی رہیں۔ پھر ان کے بیان سننا اور بین بھی۔"

"توبہ، میرے باپ کی توبہ، میری اتنی مجال کہاں؟" کان پکڑ لیے تھے۔

"تو ٹھیک ہے پھر برتن ٹوٹنے دو۔"

"تم ابھی سے اتنا نقصان کر رہی ہو۔ مستقل یہیں آجاؤ گی تو کیا کیا توڑو گی؟"

"تمہارا سر تو لازمی۔" اس نے بے فکری اور نڈر پن کا مظاہرہ کیا۔

اس دن شہریار نے اپنی امی سے کہہ دیا۔ "میرے لیے یہ موٹی رہ گئی تھی۔ ابھی تو برتن توڑتی ہے شادی کے بعد...."

"شادی کے بعد بھی برتن ٹوٹیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس اور کچھ ہے ہی نہیں توڑنے کے لیے۔" نغمہ نے کہا اور مونگ پھلی کے چھلکے اچھال دیے۔

اگر شہریار بتا دیتا کہ ٹوٹنے کے لیے اس کا سر تو ہے۔ پھر جو اس کا مذاق بنے گا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا۔ امی اتنا نقصان برداشت کیسے کرلیتی ہیں؟"

"تم نہیں سمجھو گے۔"

"آپ کوئی ماسی رکھ لیں۔" مشورہ۔

"برتن ماسی بھی توڑے گی اور چھپا کر پھینک دے گی۔ اس کی تنخواہ۔ اس کا کھانا پینا اور چوریاں۔ چینی، چاول تو عام بات ہے۔ پکی ہوئی روٹیاں بھی چرا کر لے جاتی ہیں۔ فریج کا سالن آدھا اس کے پیٹ میں جاتا تھا اور پتا نہیں کس گندگی سے کھانا پکتا ہوگا۔ میں کہاں تک نگرانی کروں۔ مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔" امی بے زار تھیں۔

"تو بیٹیوں کو ذمہ داری سونپ دیں۔ آخر گھر ہی میں رہتی ہیں تینوں۔"

"ارے.... یہ کسی کام کی ہوتیں تو مجھے دوسروں کی مدد لینے کی کیا ضرورت۔"

"اچھا خیر امی! میں اس سے شادی نہیں کرسکتا۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس سے۔"

"پاگل ہو۔ ابھی اتنی کار آمد ہے۔ بعد میں تو اور بھی فائدے اٹھا سکتے ہیں ہم۔" امی نے اسے سمجھانا چاہا۔ وہ تن فن کرتا نکل گیا۔

"امی! بیٹے کو لگام دیں۔ نکما، کام چور، اسے کون سی حور پری ملنے کی امید ہے۔ جو اتنی اچھی لڑکی اسے موٹی لگتی ہے۔ بے زبان۔" راحمہ نے ماں کی توجہ دلائی۔

راحمہ سے سب ڈرتے تھے۔ خاصی ہتھ چھٹ تھیں محترمہ۔ اسما تو چالاکی سے بچ جاتی تھی، نغمہ اکثر پٹ جاتی۔

"اب تم ہی اسے سمجھاؤ۔ شاید مان جائے۔" امی بے چاری بیٹے کے رویے سے پریشان تھیں۔

☼ ☼ ☼

رات کھانے پر کھچڑی دیکھ کر شہریار نے اودھم مچایا۔ "یہ کیا ہے؟ یہ کھانا ہے؟ کس قسم کا کھانا پکنے لگا ہے۔ اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں ہم۔ سب کو معلوم ہے۔ مجھے یہ مریضوں والا کھانا پسند نہیں۔"

"تم کہاں کے نواب ہو۔ جو ہر وقت مرغن کھانا چاہیے۔" اسما نے چڑ کر کہا۔

"مرغن...؟" اس نے انتہائی تلخ لہجے میں کہہ کر کھچڑی کی طرف اشارہ کیا۔ "امی... یہ بجلی مجھ پر گرانے سے پہلے سوچ تو لیا ہوتا۔ اکلوتا فرزند ہوں۔"

"بجلی، کون سی بجلی بھائی؟" نغمہ معصوم بن گئی۔

"یہی صاعقہ، بجلی کو صاعقہ کہتے ہیں شاید فارسی میں اور سونے پہ سہاگہ ڈبل ڈیکر۔ میرے لیے اف..."

اور یہ اف اپنی بڑی بہن کے دو ہتڑ کے جواب میں بلند ہوا تھا۔ جو "آنا" "فانا" بے چارے کی پیٹھ پر برس پڑے تھے۔

"بکواس کم کیا کرو، سمجھے۔" وہ زبان سے لتاڑنے میں بھی یدِ طولیٰ رکھتی تھیں۔ "شرم تو آتی نہیں، اعتراض کرتے ہوئے، اپنے گریبان میں جھانک لیا کرو۔ تین سال سے بی اے میں سپلی ہی آتی رہی۔ کون دے گا تم کو بیٹی۔ یہ رشتہ ابا کی مرضی سے ان کی بھانجی سے طے ہوا ہے، ابا کی خواہش پر... اور جانتے ہو ابا کون ہیں؟"

بڑے بڑے دیدے باہر کو نکلے پڑ رہے تھے۔ انتہائی خوف ناک لگ رہی تھیں۔ شہریار نے دل میں اعتراف کیا۔ خاصی خوف ناک چیز ہیں۔

"ابا ہیں اور کون ہیں۔" وہ خیالوں سے چھٹکارا حاصل کر کے ان کے سوال کا جواب جھلاہٹ سے دے کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"صرف خالی خولی ابا ہی نہیں، سربراہ ہیں۔ کمانے والے۔ ان کے ٹکڑوں پر پل رہے ہو تم اور نہ جانے کب تک اسی طرح پلو گے۔ اس رشتے سے انکار کے بعد اس گھر سے تمہارا دانہ پانی اٹھ جائے گا اور تمہارا ٹھکانہ ہو گا اس شہر کی سڑکیں۔ ناپتے رہنا، روتے رہنا۔"

دیدے باہر کو ابلے جا رہے تھے۔ شہریار نے ادھر ادھر دیکھا۔ واحد اولاد نرینہ کی یہ عزت؟

"تم کون سا خود کماتی ہو۔ اپنے گریبان میں جھانکو، ہل کر پانی نہیں پی سکتیں۔ صاعقہ ہی کو پکارتی ہو۔ صاعقہ! پلیز ایک گلاس پانی تو دینا۔"

اس نے اچھی نقل کی تھی راحمہ کے بناوٹی لہجے کی۔ اپنی ذلت کا بدلہ لینے کی کوشش۔ اسما منہ چھپائے ہنس رہی تھی۔ نغمہ کو اس تکلف کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ بدلے میں راحمہ کے زوردار دو ہتڑ کھائے۔ چیخ نکل گئی۔

ابا داخل ہو رہے تھے۔ گھر کے واحد کمانے والے سربراہ۔ سب چپ ہو گئے۔ وہ سنجیدہ تھے۔ بلکہ کچھ افسردہ۔

"تم لوگ کس طرح اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ کچھ ہوش کرو، باتوں سے زندگی نہیں گزرتی، عمل مانگتی ہے۔ اسما! تم کل سے کھانا پکاؤ گی۔ راحمہ! تم روٹی پکایا کرو۔"

صحیح معنوں میں ان پر بجلی گری۔ یہ ابا کو ہوا کیا ہے آخر؟

"ابا! مگر مجھے روٹی بنانا نہیں آتی۔" راحمہ کے غیظ و غضب پر برف پڑ چکی تھی۔ مسکین سا لہجہ تھا۔

"اپنی ماں سے سیکھ لو۔ ناشتا نغمہ کے ذمے ہے۔"

"مگر ابا، میرا کالج۔"

"اچھا! چھٹی کے دن تم ناشتا بناؤ گی۔ کل چھٹی ہے۔ باقی دن کا ناشتا صاعقہ کے ذمے۔"

اف ابا کا انصاف۔

"لیکن ابا... ایسا ہے تو... آخر..." راحمہ کے منہ سے آواز ہی نہیں نکلی۔

"آج میں نے سارا دن ایک بات نوٹ کی۔ صاعقہ انسان ہے۔ مشین نہیں۔ وہ پورا وقت کچن سے نکلی نہیں۔ میں جا جا کر چیک کرتا رہا۔ اس نے صبح ناشتے کے بعد کھانا پکایا۔ پھر شام کے لیے مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے کبھی سموسے، کباب، کبھی حلوہ، دہی بڑے، پکوڑے، نہ جانے کیا کیا بناتی رہی۔ تم سب مہمانوں کی طرح ڈرائنگ روم میں جمی بیٹھی تھیں۔ کسی نے کچن میں جھانکا تک نہیں۔"

"ابا! ہم... ایک ماسی تو رکھ سکتے ہیں، صاعقہ کی مدد..."

"خبردار۔" ابا گرج کر بولے۔ "آئندہ کوئی ماسی کا نام نہ لے۔ جب ایک صاعقہ پورے گھر کا کام کر سکتی ہے تو تم تینوں مل کر کیوں نہیں کرتیں۔ نواب زادی نہیں ہو تم اور نغمہ! آئندہ تمہاری کوئی سہیلی نہیں آئے گی۔ اگر آئی تو اس کے لیے تم ہی کو چائے پانی کا انتظام کرنا ہو گا۔ صاعقہ تمہاری نوکر نہیں ہے۔ آئندہ میں تمہیں سہیلیوں کے ساتھ ہو ہو، ہاہا کرتے نہ دیکھوں۔ سارا دن وہ کھپی ہے تم لوگوں کی خاطر۔ طبیعت اس کی خراب ہو گئی ہے۔ میں نے اسے کچن سے نکالا ہے۔"

اللہ توبہ! آج ابا کے اندر بھانجی کی محبت ابل رہی ہے اور بیٹیوں کے لیے تو یہ سزا سے کم نہیں۔

"ابا! میری انگلی۔ سیب کاٹتے ہوئے چھری سے کٹ گئی ہے۔" اسما نے منمنا کر بمشکل بہانہ تلاش کیا۔

"تو... ذرا سی انگلی کٹی ہے۔ کٹ کر گری تو نہیں۔" قہر و غضب کا دیوتا ایسا ہی ہوتا ہو گا۔ "صاعقہ کی انگلی دن میں کئی بار کٹی۔ اس نے تو واویلا نہیں کیا۔ اسی انگلی سے برتن دھو رہی تھی۔ میں نے اسے زبردستی کمرے میں بھیجا ہے۔ اب باقی کے برتن اسما اور نغمہ دھوئیں گی۔"

ابا نے سب کی اتری ہوئی شکلیں دیکھیں۔

"دیکھو بیٹا! صاعقہ زیادہ بیمار ہو گئی تو میں افتخار کو کیا جواب دوں گا۔ ابھی اسے مہمان ہی سمجھو اور مہمانوں سے کوئی گھر کے کام نہیں کراتا۔"

ابا احکام صادر کر چکے تھے اور وہ تینوں اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچنے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھی تھیں۔ شہریار ٹھنڈی کھچڑی اور کباب رائتہ ڈال کر مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

صاعقہ کو بخار ہو گیا تھا۔ شاید تھکن سے۔ صبح سے شام تک وہ اس قدر مصروف رہی کہ اپنا ہوش نہ رہا۔ صبح کا ناشتا۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا اور اس کے فوراً بعد شام کی تیاری۔ جس نے واقعی اس کے ہوش گم کر دیے۔ کباب، دہی بڑے، گاجر کا حلوہ، اسما کے رشتے کے سلسلے میں خواتین کی آمد اور نغمہ کی چھ عدد سہیلیاں۔ اوپر سے مامی کی بار بار کچن میں آ کر ہدایات۔

"سیب عین وقت پر چھیلنا، کالے پڑ جاتے ہیں۔"

"چائے اسٹرانگ ہو۔"

"پکوڑیاں ابھی کچی ہیں۔"

"دل لگا کر کام کرنا سیکھو بیٹا! اسما کے رشتے کے سلسلے میں لوگ آ رہے ہیں۔ کیا کہیں گے۔"

"آپ ان سے کہہ دیں۔ ایک پھوہڑ لڑکی نے بنایا ہے سب کچھ، اسما نے نہیں۔"

مامی اس کی شکل دیکھ کر رہ گئیں۔

دوسرے چکر میں۔ مہمانوں کی آمد کے بعد پھر۔

"کباب تیز گھی میں تلو، سرخ ہو جائیں۔"

"گلاب جامن بڑی ڈش میں۔ حلوہ چھوٹے پیالے میں نکالو۔ اس پر پستے، بادام باریک کاٹ کر پھیلا کر سجانا۔"

اس سے اگلے چکر میں۔ "اوفوہ۔ اتنی دیر، سموسے جلدی تلو، ٹھنڈے ہونے سے پہلے لے آنا۔ دہی

بنوں پر چاٹ مسالا' اچھا میں نے تمہیں دھوئیں کی جو ترکیب بتائی تھی' وہی بنوں پر بیسن والا پیپر رکھو' انگارہ اس پر ڈالو' ذرا سا تیل ٹپکاؤ۔ ڈھکن بند کردو۔ ہاں' بس' اب ٹرالی میں رکھو۔ اُفوہ! انگارہ تو نکال لو۔ دھوئیں کا مزا آگیا ہوگا۔ میں چلتی ہوں' ٹرالی لے آؤ۔"

وہ کچن سے ڈرائنگ روم' لاؤنج کے چکر لگاتی رہی۔ کسی نے یہ نہ کہا۔

"ایک سموسہ تم بھی کھالو یا ہمارے ساتھ چائے پی لو۔" اسما مہمانوں کے درمیان شرمائی بیٹھی رہی۔ راحمہ میک اپ میں غرق ایک رُخ سے منہ اٹھائے ڈٹی رہیں۔ لاؤنج میں نغمہ سہیلیوں کے جھرمٹ میں قہقہے لگاتی رہی۔ سب کے سامنے سے برتن اٹھا کر لانا بھی اسی کی ذمہ داری تھی۔ ٹرالی میں یہاں وہاں سے برتن اٹھا کر رکھنا بھی۔

اور ابھی وہ کچن سمیٹ رہی تھی۔ کچھ برتن دھل گئے تھے۔ کچھ باقی تھے۔ آج تو برتنوں کا انبار دھونا تھا۔ وہ بھوک اور تھکن سے بے نیاز آج کا کام آج ہی مکمل کرنے کا ارادہ کیے برتن دھو رہی تھی۔ چار گلاس ٹوٹ چکے تھے مگر ابھی بہت کچھ باقی تھا۔ رات کا کھانا۔ برتن چھوڑ کر وہ اپنی آسانی کے لیے کھچڑی پکانے لگی۔ کباب تھے ہی۔ دہی بڑے ختم ہوچکے تھے مگر دہی باقی بچا ہوا تھا۔ وہی دہی بطور رائتہ کام آگیا۔

کھچڑی دم پر رکھ کر وہ زینہ چڑھ کر اوپر گئی۔ اوپر کمرے میں اس نے فوم کے کچھ پیس دیکھے تھے۔ غالباً" یہاں صوفوں کی مرمت ہوئی تھی۔ بچی کھچی چیزیں پڑی تھیں۔ مامی نے کہا تھا۔ کسی دن اوپر کے کمرے کی صفائی بھی کردینا۔ مگر اس وقت وہ فوم کے پیس لینے آئی تھی۔ باتوں کی آواز پر اس نے دروازے سے باہر جھانکا۔ ٹیرس پر دیوار سے کہنیاں ٹکائے شہریار کھڑا کسی سے باتیں کررہا تھا۔ ذرا آگے آکر دیکھا۔ شہریار کا مخاطب۔۔۔ پڑوس کی سوکھی سڑی پیلے رنگت والی نورین تھی۔ لگتا تھا کافی دیر سے گفتگو ہورہی ہے۔ رات کے اندھیرے کی انہیں پروا نہ تھی۔ شہریار نے اسے دیکھ لیا تھا مگر اسے جلدی تھی۔

وہ فوم لے کر نیچے آگئی۔

کھانا تیار تھا۔ میز پر رکھ کر وہ پھر اپنے ذاتی محل یعنی کچن میں پہنچ گئی۔ ابھی چند منٹ ہوئے تھے کہ شہریار دھڑ دھڑ کرتا اندر آیا۔ وہ سنک کے سامنے کھڑی برتن دھونے لگی تھی۔ شہریار نے آتے ہی اس کا بازو اس قدر زور سے پکڑا' بلکہ دبوچا کہ اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کو بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے لاکر غرا کر بولا۔

"سنو۔۔۔ تم موٹی' فضول لڑکی! سمجھتی کیا ہو خود کو۔ میں۔۔۔ بھلا تم سے شادی کروں گا؟ تم سے؟ تم ہو کیا؟ زبردستی۔۔۔ قبضہ گروپ' ارے منگنی تو ایک ڈراما ہے۔ بہت جلد دی اینڈ ہونے والا ہے' سمجھیں! اگر تمہارے منہ سے میرے اور نورین کے بارے میں ایک لفظ بھی نکلا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

اور جس آندھی کے ساتھ آیا تھا۔ طوفان کے ساتھ واپس چلا گیا۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ صاعقہ کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ کسی سے بھی کچھ کہنے کا مگر۔۔۔ نہ جانے اس پر کیسی نقاہت طاری ہوئی۔ گو کہ تھکن' کمر تختہ' پیر اکڑے ہوئے' پھر بھی کام ختم کرنے کے لیے اپنی طاقت استعمال کررہی تھی۔

شہریار نے نہ جانے کیا جادو کیا۔ طاقت نقاہت میں بدل گئی۔ دیوار کا سہارا لے کر وہ کہیں بھی ٹک کر سانس بحال کرنے آگے بڑھی کہ ماموں آگئے۔ دن میں کئی بار آکر جائزہ لے کر گئے تھے کہ کام درست طریقے پر ہورہا ہے کہ نہیں۔ (اس کا اپنا خیال تھا۔) ماموں نے اس کو کانپتے دیکھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

"تمہیں بخار ہورہا ہے۔ بتایا نہیں اور لگی ہوئی ہو کام سے۔ چلو اندر چلو اور یہ کیا۔ انگلی میں زخم ہے۔ اندر چلو کمرے میں۔"

"وہ میں برتن۔۔۔" وہ بمشکل بولی۔ اس کا بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ خاموشی' بس خاموشی چاہیے تھی۔

ماموں نے اس کے ہاتھ سے فوم لے کر سنک میں پھینکا۔ ہاتھ دھلانے سنک تک لائے۔ پھر اسے سہارا

دے کر کمرے میں پہنچایا۔ ماموں کے لمس نے طاقت دی اور ان کے محبت بھرے الفاظ نے توانائی۔

"بیٹا! طاقت سے زیادہ کام کرنے سے یہی ہوتا ہے۔ تم کسی کو تو بتاتیں۔ طبیعت خراب ہے تو اتنی تھکن نہ ہوتی۔ کوئی تو مدد کردیتا۔" اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔

وہ لجاجت سے بولی۔ "ماموں! ابا سے میری بات کرادیں۔"

ماموں سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پھر بولے۔ "وہ میرے پاس ان کا نیا نمبر نہیں ہے۔"

"نیا نمبر؟"

"ہاں! وہ تو سعودی عرب چلے گئے ہیں۔ انہوں نے فون کیا ہوگا مگر ہمارا فون خراب تھا۔"

"سعودی عرب؟" اس پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

"ہاں۔۔۔ دو مہینے ہوگئے۔ اچھی جاب ملی تو چلے گئے۔ حالانکہ بیوی' بچوں کو اکیلا چھوڑنا۔۔۔ بچے ابھی چھوٹے ہیں نا اور بیوی بھی سنا ہے کہ کچھ بیمار ہے۔ مگر۔۔۔ حالات ایسے تھے کہ اس نوکری کو ٹھکرا نہ سکے۔ ساری زندگی اپنے بہن' بھائیوں' ماں' باپ پر خرچ کیا۔ بچت کی نہیں۔ اب۔۔۔"

"نہیں۔" ماموں کیا کہہ رہے تھے۔ اس پر تو محرومی کا حملہ ہوا تھا۔ سعودی عرب چلے گئے اور مجھ سے بات بھی نہیں کی۔ میں اتنی بُری ہوں۔ ان کی نظر سے گر چکی ہوں۔ ان کے ذہن سے نکل گئی ہوں۔ ماموں سے ان کی کب بات ہوئی۔ ہوئی تو تھی۔ مجھ سے بات کرنے کی ان کو ضرورت نہ محسوس ہوئی۔ کیوں۔۔۔ اتنا بڑا جرم تھا میرا؟"

سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں تلے اندھیرا تھا۔ بخار تیز ہورہا تھا۔ ماموں دوا لے آئے تھے۔

"کچھ کھایا بھی ہے تم نے' یا سارا دن مشقّت ہی کرتی رہیں۔"

دن بھر میں یہ پہلا فقرہ تھا۔ جو ماموں سے ہی سنا۔ بھوک سے مجبور ہوکر اس نے پتیلی سے کھچڑی نکال کر چند لقمے کھالیے تھے۔ ماموں نے جیب سے بسکٹ کا پیکٹ نکال کر زبردستی کھلایا اور دوا بھی پلائی۔ کچھ پیار بھری نصیحتیں کرکے وہ چلے گئے اور اسے سوچنے کا موقع مل گیا۔

دن بھر کام کا بوجھ۔ وقت پر چیزیں تیار کرنے کی فکر۔ پھر بکھرے ہوئے کچن کو سمیٹنا۔ کبھی کبھی مامی کو ماموں پر احسان کرنے کا خیال آتا تو آکر چائے بنا کرلے جاتیں۔ صاعقہ کی کلاس لینا بھی لازمی۔

"یہ چیز ادھر کیوں ہے اور یہ ڈبا یہاں کیا کررہا ہے۔ ہر چیز کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ اسے اپنی جگہ پر رکھنا سیکھو۔ تمہیں آسانی ہوگی۔ جہاں سے اٹھاؤ۔ وہیں رکھو۔"

مامی کے ارشادات جاری رہتے۔ ایک دن اس نے کہہ بھی دیا۔

"میں خود جگہ پر نہیں ہوں۔ جب میں ہی بے جگہ ہوچکی ہوں تو چیزوں کو جگہ پر کیسے رکھوں گی۔"

"میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ۔۔۔ تم کو تلاش کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔" مامی کو اس کی بدزبانی پر غصہ آتا تھا مگر برداشت۔

"جب سب کچھ مجھے کرنا ہے۔ میں تلاش بھی کرلوں گی۔" وہ تنک کر بولی۔

جگہ' بے جگہ' ٹھکانا' بے ٹھکانا' آخر اس کا ٹھکانا کون سا ہے؟ یہ تو طے ہے کہ یہ گھر اس کا ٹھکانا نہیں۔ یہ جگہ اس کے لیے مناسب نہیں' پھر۔۔۔ وہ فالتو شے کی طرح یہاں کیوں ہے؟

ماموں منع کرگئے تھے کہ صبح وہ نہ اٹھے۔ آرام کرے۔ ناشتا بن جائے گا۔

ماموں کی محبت نے اس پر رقّت طاری کردی۔

"ہائے ابا! نے مجھے فالتو شے سمجھ کر پھینک دیا۔ خبر تک نہ لی۔ جب اس کی نام نہاد منگنی ہوئی۔ ابا جاچکے تھے۔ کسی نے بتایا تک نہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ بات کرنا گوارا نہ کیا۔ یہ کیسی محبت ہے ابا! کیا ماں کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کو یوں نظرانداز کردینا جائز ہے۔ بغیر بتائے' بغیر ملے چلے گئے۔ ابا کو شاید اس کی

ضرورت نہ رہی ہو۔ محبت بھی نہ ہو مگر بیٹی کو باپ کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ بیٹی بھی باپ کی محبت کو دل سے نہیں نکالتی۔ میں ابا کے لیے فالتو شے تھی۔ اسے خواہ کہیں بھی پھینک دیا جائے۔

اپنی بے قدری پر زور کا رونا آرہا تھا۔ خوب روئی۔ مرنے کو دل چاہا۔ مگر افسوس اسے مرنا نہیں آیا۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ باپ جیسی ہستی جو سر کا سائبان ہے۔ منگیتر جیسا شخص۔ کسی کو اس کی ضرورت نہ لگاؤ، نہ محبت، پھر تو مر ہی جانا چاہیے۔ وہ روتی رہی بے بسی سے۔ نہ کوئی چپ کرانے آیا نہ تسلی دینے۔ اس کا ہمدرد تھا ہی کون۔ ایک ماموں جو اپنا فرض ادا کر کے چار لفظ محبت بھرے کہہ کر جاچکے تھے۔ اس دنیا میں میرا رول ایک ماسی جتنا ہوگا۔ کام کرو اور پیٹ بھرو۔ ایسا کون سا گناہ کیا ہے۔ جس کی سزا اتنی سخت مل رہی ہے۔

شاید ابا کا دل دکھایا ہو۔ ہاں انہیں میرا یہاں آکر رہنا اچھا نہیں لگا ہوگا۔ خالہ جان سے تو وہ خوش تھے۔ مگر ان کو بتائے بغیر یہاں آجانا۔ اپنی ضد میں، انا کی خاطر، ابا کا دل دکھایا اور ناراض کردیا اور وہ بھی محض فاخرہ اور ان کے بچوں کے کام سے بچنے کے لیے۔ ہیں تو وہ بھی ابا کی اولاد، میری طرح ہی۔ ابا کو مجھ سے کچھ توقعات ہوں گی۔ محبت بھی ہوگی۔ جسے میں ٹھوکر مار کر چلی آئی۔ ہائے اپنی غلطی کا ازالہ کیسے کروں؟

رو، رو کر نیند غائب ہوچکی تھی اور وہ اب اپنا محاسبہ کررہی تھی۔

گھر کے کاموں سے بچ کر، پھوپھو کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے فاخرہ سے نفرت، بدگمانی کو دعوت دی۔ پھر خالہ جان کے گھر پناہ لی۔ سب محبت کرنے والے لوگ ملے۔ خالہ تو تھیں ہی اپنی۔ بلکہ اپنی سے بڑھ کر، صرف خالو جان ہی خود پسند نخرے باز تھے۔ کئی دفعہ اس کی بری طرح ذلت کی۔ مگر خالہ جان سب کچھ سنبھال لیتی تھیں۔

چھ ماہ وہ ان کے گھر رہی۔ خالو جان کی بدفطرتی سے تو وہ واقف ہوچکی تھی۔ لیکن اس کے بعد کے واقعات۔

جب رات کو اس کا حلق سوکھ گیا تھا۔ نیند سے بیدار ہو کر اس نے دیکھا۔ آج نصرت تھرماس رکھنا بھول گئی تھی۔ پیاس زیادہ تھی۔ گیلری میں ایک کونے میں پانی کا کولر رکھا رہتا تھا۔ وہ اٹھ کر گیلری میں آگئی۔ سامنے دیوار گیر کلاک میں ڈھائی بجے تھے۔ برآمدے کی لائٹ گیلری میں بھی آرہی تھی۔ کولر کے پاس گلاس موجود نہ تھا۔ وہ ریک پر، تپائی پر نظریں دوڑا رہی تھی۔ آخر گلاس نظر آگیا۔ جو قدرے نیم تاریک گوشے میں ایک تپائی پر رکھا تھا، ادھر لپکی۔

تب ہی خالو جان کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اندر سے نصرت کو نکلتے دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔ ڈھائی بجے رات کے نصرت یہاں کیا کررہی تھی۔ شاید خالہ جان نے اسے بلایا ہو۔ ان کی طبیعت خراب ہوئی ہوگی ورنہ نصرت چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھتی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ صاعقہ بھی پانی پی کر اندر آکر لیٹ گئی۔ خالو جان کے ڈر سے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا نہیں۔ صبح ہی خیریت معلوم ہوگی۔ سوچ کر سوگئی۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ اقرا، اقصی جاچکی تھیں۔ خالو جان ناشتا تناول فرما کر تشریف لے جاچکے تھے۔ حسن بھائی کرسی پر اخبار میں گم تھے۔ خالہ جان بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر کہنے لگیں۔

"آؤ بیٹا! تم بھی ناشتا کرلو۔"

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے خالہ جان!" اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں.... بس تھکن ہے۔ ارے بھئی کتنا بھی آرام دہ کمرا ہو، اسپتال کا نام ہی تھکانے والا ہے۔"

"اسپتال، مطلب آپ کی طبیعت...." وہ گھبرائی۔

"نہیں بھئی.... رات کو ساتھ والی حمیرا آگئی مجھے بلانے۔ رضیہ آپا کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ ان کا بیٹا کہیں دورے پر گیا ہوا تھا۔ بہو کا ننھا سا بیٹا ہے۔ تو میں اور حمیرا، رضیہ آپا کو اسپتال لے گئے۔ ان کا بلڈ پریشر بہت ہائی ہوگیا تھا۔ اب بہتر ہیں۔ صبح ان کی بہو ناشتا لے کر اسپتال آئی تو میں اس کے ساتھ آگئی۔ رضیہ آپا بھی شام تک آجائیں گی۔"

"اچھا.... میں سمجھی آپ کی طبیعت خراب ہے۔ نصرت کو اسی لیے بلایا ہے۔ اصل میں رات سخت پیاس لگی، گیلری کے کولر سے پانی پینے آئی تو آپ کے کمرے سے نصرت کو نکلتے دیکھا۔ وہ فوراً ہی باہر چلی گئی۔ میں پوچھ بھی نہیں سکی کہ کیا بات ہے۔"

اس نے علی حسن کو اخبار میز پر پٹخنے کے انداز میں رکھتے اور خالہ جان کو گھور کر دیکھتے کرسی کو ٹھوکر مار کر جاتے دیکھا تو ڈر گئی۔

"ان کو کیا ہوا ہے؟" وہ سوالیہ نظروں سے خالہ جان کو دیکھنے لگی۔

وہ بھی پیالی میز پر رکھ کر۔ "اب نیند پوری کرلوں۔ مجھے جگانا نہیں۔" کہہ کر چلی گئیں اور اگلے دن نئی ملازمہ آگئی۔ نصرت کو نکال دیا گیا تھا۔ کوارٹر خالی کرکے وہ جاچکی تھی اور علی حسن جو گھر کے معاملات سے یکسر بے نیاز تھے۔ ملازموں کے معاملے میں خاصے حساس نظر آئے۔ انہوں نے خود انٹرویو لیا سختی سے۔ کوارٹر کا مطالبہ بھی رد کردیا۔ حالانکہ نصرت کا کمرا خالی تھا۔

یہ نئی ملازمہ نصرت کے مقابلے میں زیادہ عمر کی تھی۔ اس کا شوہر بوڑھا تھا۔ اولاد پتا نہیں تھی کہ نہیں مگر بے چاری خاصی مجبور لگی۔ صبح آکر گھر کے سارے کام کرکے شام تک واپس چلی جاتی تھی محنتی۔ اس لیے کسی کو اس سے شکایت نہ ہوئی۔

اور پھر اقرا کی ایک کولیگ کی شادی کا بلبلا اٹھا۔ اقرا، اقصی اس قدر پرجوش تھیں۔ جیسے ان ہی کے گھر کی شادی ہے۔ دونوں مایوں کی رسم کے بعد آئیں تو صاعقہ کو مہندی میں ساتھ چلنے پر اصرار کیا۔ خالہ جان بھی جانے پر تیار تھیں۔ وہ بھی راضی ہوگئی۔

مہندی کے دن دوپہر میں دونوں نے مہندی لگائی اور بیوٹی پارلر چلی گئیں۔ صاعقہ نے انکار کردیا۔ وہ بڑی محنت سے اپنے ہاتھوں میں مہندی لگانے لگی۔

"آہا!" واقعی کمال کے گل بوٹے بنائے تھے۔ کسی کو دکھا کر تعریف وصول کرنے کی خواہش تھی مگر.... کوئی تھا ہی نہیں۔ خود ہی تعریف کرتی اور داد دیتی رہی۔ پھر ہتھیلیاں سکھانے کے لیے گیلری میں نکل آئی۔ یہ سوکھ جائے تو ہاتھ دھو کر کپڑے استری کرے۔ ایک ہاتھ کی ہتھیلی اور دوسرے کی پشت پر کس وقت سے بیلیں سجائی تھیں۔

اقصی، اقرا تو ایک دوسرے کے لگا کر مزے سے چلی گئیں۔ وہ پھونکیں مارتی ادھر سے ادھر گھومتی رہی۔ دیکھا ہی نہیں۔ کب خالو جان کمرے سے برآمد ہوئے اور گربہ پا چلتے ہوئے اس کی پشت پر آگئے۔ مڑی تو ان کو دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئی۔ اب آئی شامت مگر.... حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ وہ اس کے ہاتھوں کی مہندی کو بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے۔

"آہا.... بہت خوب، مہندی.... کتنی حسین لگائی ہے۔"

انہوں نے اس کے دونوں ہاتھوں کی کلائیاں تھام لی تھیں۔ وہ یک لخت چونک گئی۔ یہ کیسا رویّہ ہے۔ وہ ابھی تک مہندی کو سراہتے ہوئے کچھ بول رہے تھے۔ پھر ان کے ہاتھ اس کی کلائیوں سے اوپر آئے۔ اس کے احساسات عجیب سے ہوگئے۔ وہ چوکنا ہوگئی۔ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی تو پتا چلا۔ وہ کتنی کمزور ہے۔ خالو جان کا شکنجہ کچھ اور کہانی سنا رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے اس کا الٹا ہاتھ جکڑے ہوئے دوسرے سیدھے ہاتھ کو سہلاتے ہوئے آستین اونچی کررہے تھے۔

ان کی وہ پرشوق نظریں اب مہندی سے سجے ہاتھ سے ہٹ کر کلائی سے اوپر پہنچی ہوئی تھیں۔

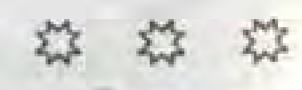
"واہ...." ان کے لبوں سے تعریفی لفظ ادا ہوا۔ اسے اب اندازہ ہوا۔ یہ کسی بزرگ کا شفقت آمیز لمس نہیں۔ ایک حریص مرد کا لمس ہے۔ وہ سٹپٹا کر زور سے بول پڑی۔

"چھوڑیں خالو جان! مہندی خراب ہوجائے گی۔" حلق میں کچھ اٹک گیا۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"بہت خوب صورت ہاتھ ہیں تمہارے اور یہ مہندی، واہ.... واہ.... چلو کمرے میں چل کر تمہاری اس محنت کی داد دوں۔"

ناقابل برداشت اذیّت نے اس کا چہرہ بھی نیلا کردیا۔

چیخ پڑی۔ "خالو جان!"
"کچھ نہیں ہوتا میری گڑیا! آؤ ذرا۔"
اب وہ اسے اپنے کمرے کی طرف کھینچ رہے تھے۔ طاقت سے۔ وہ زور سے چیخی۔
"اللہ!" اب وہ بد طینت انسان شیطان کا روپ دھار چکا تھا۔ اس کی طاقت زیادہ تھی مگر صاعقہ خطرے کے سامنے چٹان بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہاتھ بہ زور کھینچے۔ اس نے انہیں زور کا دھکا دیا مگر بس اتنا ہوا کہ ہتھیلی کی ساری مہندی خالو جان کی قمیص پر لگ گئی۔ زور آزمائی کے دوران اچانک ان کی گرفت کمزور ہوئی۔
"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" علی حسن تیوری چڑھائے نہ جانے کدھر سے برآمد ہوئے تھے۔
وہ زور لگا رہی تھی۔ جھٹکے سے زمین پر جا گری۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے پردے چھا گئے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ گھر میں اکیلی ہے اور یہی گمان اس شیطان کو بھی تھا۔ تب ہی علی حسن کی آواز پر وہ گھبرا گئے۔ زمین نے مہربان ماں کی طرح اسے سمیٹ لیا تھا۔ اس کی سماعت میں خالو جان کی آواز پہنچی۔
"یہ لڑکی پاگل ہے۔ مجھے مہندی دکھانے کے لیے بلایا میں تو۔"
صاعقہ کی آنکھیں کھلیں۔ علی حسن انتہائی طنز سے بولے۔
"اچھا۔ مہندی دکھانے یا آپ کے مہندی تھوپنے کے لیے۔" ان کی نظروں کا مرکز خالو جان کی قمیص تھی۔ پھر صاعقہ سے کہا۔
"اٹھیے محترمہ! مہندی تو آپ نے بہت خوب لگائی ہے ابا جان کو۔" وہ اٹھی اور کانپتے ہوئے بولی۔
"مہندی پاکیزہ ہوتی ہے اور گندے لوگوں کے لیے داغ۔"
اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کیا کر ڈالے۔ اگر آج علی حسن نہ ہوتے۔ کون مددگار تھا۔ مگر یہ وہ سمجھ چکی تھی کہ اللہ کی مدد کے سوا۔ کوئی مددگار نہیں۔
اقرا، اقصیٰ کے ساتھ خالہ جان آئیں تو وہ اپنا سامان سمیٹ کر کہیں بھی جانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج چکی تھیں۔
"خالہ جان! مجھے آج ہی جانا ہے ماموں کے گھر۔"
خالہ جان شاید علی حسن سے مل کر ہی آئی تھیں۔ جو لاؤنج میں اخبار پڑھتے ہوئے اس کی نگہبانی بھی کر رہے تھے۔
"بیٹا! میں صبح ہی تمہیں لے کر چلوں گی خود۔"
"نہیں۔ ابھی۔ کسی بھی بس میں۔ میں نہیں رک سکتی۔"
"میں خود تمہارے پاس سوؤں گی۔" ان کو شاید اطمینان تھا۔ صاعقہ کو نہیں۔
"خالہ جان! اسی وقت کی کسی بھی بس سے چلی جاؤں گی۔ رات تک پہنچ جاؤں گی۔ ماموں کو فون کر کے بتا دیں۔" آنسو امڈ رہے تھے۔ انہوں نے افسردگی سے اسے دیکھا۔ پیار کیا۔
"اچھا بیٹا! پھر۔ تم علی حسن کے ساتھ چلی جاؤ گاڑی پر۔"
مگر اب کسی مرد کا اعتبار۔ نہیں۔ وہ گردن انکار میں ہلاتی رہی۔
"آج مہندی کا فنکشن ہے۔ پوری رات وہیں گزر جائے گی۔"
"وہاں کیا سب فرشتے ہیں؟" اس نے انہیں لاجواب کر دیا تھا۔
وہ اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ علی حسن فوراً کھڑے ہو گئے۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر رہے تھے۔ خالہ جان اسے لے کر آئیں۔ علی حسن طیش کے عالم میں تھے مگر بغیر کسی حادثے کے وہ بس اسٹاپ پہنچ گئے۔
خالہ جان خود جانا چاہ رہی تھیں۔ صاعقہ نے منع کیا۔ علی حسن نے بھی کہا۔
"امی! یہ بہادر لڑکی ہے۔ حالات کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ جانے دیں۔"
رات گیارہ بجے بس رکی۔ ماموں اور شہریار اسے لینے آ چکے تھے۔ مامی دیکھتے ہی لپکیں۔
"ارے واہ۔ آ گئی میری شہزادی۔ اب یہاں تو ٹک کر رہنا کچھ۔ اچھا۔"
وہ مامی سے لپٹ گئی۔ "بس مامی! میں گھبرا گئی تھی۔ آج تو اقرا کی دوست کی مہندی تھی۔ مجھے جانا تھا مگر بس گھبراہٹ ہوئی۔ سب روک رہے تھے۔ خالہ جان ساتھ آنا چاہتی تھیں، میں نے کہا۔ میں کوئی بچہ ہوں جو کھو جاؤں گی۔ زبردستی کر کے آ گئی۔ میرا کمرا کدھر ہے۔ بڑی نیند آ رہی ہے۔ سچی۔ کچھ کھانے کو ہے تو منگا دیں۔"
وہ مامی سے اس طرح چمٹی ہوئی تھی جیسے کوئی پردیسن بیٹی میکے آ کر ماں سے لپٹتی ہے مگر چند روز میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ مامی کا گھر ہے۔ خالہ کا نہیں۔ سب کے چہروں سے ملمع اتر چکا تھا۔ اصلیت ظاہر ہو گئی تھی۔ اخلاقاً بھی کوئی پوچھنے کا روادار نہ تھا کہ تم کیسی ہو۔ تم نے کھانا کھایا ہے یا نہیں یا یہ کہ کبھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیا کرو۔ مگر۔ کوئی کیوں پوچھتا۔ بن بلائے مہمان کی قدر اسی طرح ہوتی ہے۔
خالہ جان کے گھر میں۔ اس نے کبھی تنہا کھانا نہیں کھایا۔ اقرا، اقصیٰ یا خالہ جان شریک رہتی تھیں۔ بہت آرام سے رہی۔ اس آخری واقعے کے سوا کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کی محنت سے لگائی مہندی خالو جان کے کپڑوں کو داغ دار کر چکی تھی۔ وہ خود داغ سے بچ گئی۔ یہ کم تھا کیا؟
بہت دن تک اسے ہاتھوں سے کلائیوں سے گھن آتی رہی۔ کیڑے سے بازوؤں پر رینگتے۔ جنہیں وہ انگلیوں سے مسلتی۔ ہاتھوں پر لگی مہندی کے گل بوٹے تو کب کے رگڑ کھا کر شکل کھو بیٹھے تھے مگر رنگ عرصے تک قائم رہا۔ کس کی مہندی، کیسی شادی، سب کچھ چھوڑ کر ایک مضبوط پناہ گاہ میں آ گئی تھی۔ ضد نے سب کام کرائے تھے۔
اب۔ یہ طے تھا کہ وہ ابا کے بلائے بغیر ان کے گھر نہیں جائے گی۔
پچھلے واقعات ذہن میں دہراتے دہراتے آخر نیند آ گئی۔ بخار کم ہو گیا۔



حسب معمول صبح سویرے آنکھ کھلی۔ سر بھاری تھا۔ جسم میں درد بھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے مامی کو سامنے کھڑا دیکھا۔
"ابھی تک اٹھیں نہیں تم۔ رات نیند نہیں آئی کیا؟ تھک گئی ہوگی۔ کل مہمان بھی زیادہ آ گئے تھے۔ سب تھکی پڑی سو رہی ہیں۔ تمہارے ماموں کو چائے دے آئی ہوں۔ تمہارے ہاتھ کے ناشتے کی ایسی عادت ہو گئی ہے کہ میری بنائی چائے میں سو کیڑے نکالے۔ ناشتا بناؤں گی تو شاید پھینک دیں۔"
وہ ڈھٹائی کی چادر اوڑھے پڑی رہی۔ ماموں خود کہہ گئے تھے "تم آرام کرنا۔ ویسے بھی بخار کم تھا مگر بخار نے جوڑ جوڑ میں درد چھوڑ دیا تھا۔
پتا نہیں وہ سب کیوں تھک گئی تھیں۔ صرف بیٹھ کر باتیں کرنے اور ہنسنے کے سوا کون سا کام کیا تھا۔
"اچھا بیٹا! پھر میں چلتی ہوں۔ تم آ جانا ماموں کے لیے ناشتا۔"
وہ بڑبڑاتی چلی گئیں۔ وہ سوچنے لگی "میں ہی کیوں۔ اسما، نغمہ کیوں نہیں۔ گھر کی خواتین مہمان بنی رہتی ہیں۔ میں فالتو ہوں۔" باہر سے ایک بار پھر آہٹ سنائی دی۔ اس نے دم سادھ لیا۔ منہ تکیے میں گھسا لیا۔ ہولے ہولے کراہنے لگی۔ آہٹ اندر آ گئی۔
"کیا بات ہے صاعقہ! ابھی تک لیٹی ہو۔"
انہیں شاید اس کی کراہیں سنائی نہیں دی تھیں یا انہوں نے پروا نہ کی۔ راحمہ تھی۔ فل میک اپ کے ساتھ کہیں جانے کو تیار۔
"بڑا درد ہے۔ بخار ہو گیا تھا۔ سردی بھی لگ رہی ہے۔ اٹھا نہیں جا رہا۔" وہ نقاہت زدہ آواز میں اپنی تکلیف کا احساس دلانے لگی۔
"اوہ۔ ہاں۔ بخار تو ابھی ہے۔" انہوں نے اس کے بازو چھو کر اقرار کیا۔ "مگر پسینہ بھی آنے والا ہے۔ اتر جائے گا بخار۔ ہاں، وہ کل جو مہمان اسما کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے اسما کو ریجیکٹ کر دیا۔ وہ غم میں بے سدھ ہے۔ اصل میں ان لوگوں نے تم کو پسند کیا ہے۔ رشتہ بھی دے دیا۔ اب۔ بخار اتر جائے تو

کچن میں آجانا۔"

حکم دے کر وہ ٹھک ٹھک کرتی باہر نکل گئیں۔

صاعقہ کا بخار تو اب اتر گیا تھا۔ بھوک بھی لگی تھی۔ وہ جانتی تھی اپنے لیے اسے خود ہی چائے بنانی ہوگی۔ اس کے لیے کوئی زحمت نہیں کرے گا۔ یہ خالہ جان کا گھر نہ تھا۔ جہاں نوکر ناشتا کھانا تیار کر کے بلانے آتا۔"

نوکروں کا خیال آیا تو نصرت یاد آگئی۔ پتا نہیں اس کی کیا مجبوری تھی۔ تنخواہ تو جہاں بھی کام ملے مل جاتی ہے لیکن کوارٹر کا حصول آسان نہیں۔ کوارٹر کے عوض... عزت کا سودا... یہ نسوانیت کی توہین نہیں تو اور کیا ہے۔ آہ... مجبوریاں... خالہ جان نے ساری عمر خالو جان کو کیسے برداشت کیا۔ بدکردار اور بدنیت انسان۔ خالہ جان کی مجبوری۔ عیش آرام کے عوض...

"پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان" پھپھو مثال دیتی تھیں۔

وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ نغمہ نے ناشتے کی فرمائش کر دی بلکہ مامی نے بھی۔ حتیٰ کہ ماموں نے بھی اچھی سی چائے کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ نہ جانے کیسی چائے ملی تھی انہیں۔ وہ بہت زیادہ چائے کے عادی نہ تھے۔ سب کی چائے ناشتا لے کر ٹرے میں رکھ کر وہ لے جا رہی تھی تو اوپر ٹیرس پر کھڑے شہریار نے پکارا۔

"سنو... مجھے بھی چائے اور ناشتا یہیں اوپر دے جانا۔"

بہت فرصت کے عالم میں کھڑا تھا نورین کے انتظار میں۔ وہ ٹرے اندر دے آئی۔ شہریار اسی جگہ کھڑا تھا۔ اس نے ماموں کی آواز سنی۔

"کل سے بخار تھا اسے۔ آج آرام کرنے دیتیں۔ کبھی اپنی لاڈلیوں کو بھی حرکت کرنے کا کہہ دیا کرو۔"

"سنو... ڈبل پراٹھا بنانا۔ دو انڈوں کا آملیٹ... اور دودھ پتی کی مزے دار چائے۔"

"نوکر نہیں ہوں تمہاری۔ نیچے آکر ٹھونس لو۔" وہ بھنا کر بولی۔

"توبہ... میں نے کب کہا کہ نوکر ہو۔ منگیتر تو ہو۔ ایسا لہجہ منگیتر کے ساتھ کون لڑکی اختیار کرتی ہے بھلا۔" ڈھیٹ... رات کی فضولیات بھول چکا تھا۔ مطلب پرست۔

"میں..." کون سی لڑکی کے جواب میں اس نے کہا اور چھپاک سے کچن میں گھس گئی۔

"بھوک لگی ہے یار! کچھ خیال کرو۔ اوپر ہی لے آنا اچھا۔" اوپر سے ہی حکم نامہ جاری تھا۔

"نہ تم نواب زادے ہو۔ نہ میں تمہاری کنیز۔ منگنی کا ڈراما ختم ہونے والا ہے۔"

وہ دروازے پر سے چلائی اور اپنے لیے ناشتا بنا کر کھانے بیٹھ گئی۔ ابلا ہوا انڈا اور آملیٹ، دودھ پتی چائے۔ پھر خیال آیا تو ٹرے میں سب چیزیں رکھ کر کمرے میں آگئی، معلوم تھا کہ آئے گا بھنایا ہوا اور خالی میز، بند چولہا دیکھ کر جھنجھنائے گا۔ ماں کو پکارے گا مجھے کیا۔ مزے سے لذیذ ناشتا کرنے لگی۔ آملیٹ بھی کس قدر مزے دار تھا۔ مکھن میں فرائی کیا تھا۔ ابھی آدھا پراٹھا کھایا تھا کہ فوں فاں کرتا منگیتر آگیا۔

"میرے لیے کیوں نہیں بنایا؟" شدید غصہ تھا۔ غالباً "نورین ملنے نہیں آئی۔

"مجھے بخار ہے، کمزوری ہو رہی ہے، نغمہ سے بنوا لو۔" اس نے مکھی اڑائی۔

"بنا رہا ہوں، بعد میں تو تم کو میرے سارے کام کرنے ہی ہوں گے تو ابھی کیوں نہیں۔"

"بعد میں تو ڈراما دی اینڈ ہو جائے گا۔" معصومیت سے بولی۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نظر نہ آنے والی شے کو ٹھوکر مارتا، جھلاتا ہوا ناکام منگیتر چلا گیا۔ ماں سے شکایت کرنے۔

وہ مسکراتی رہی۔ اب سب کے ساتھ ایسا ہی رویہ رکھنا ہوگا۔ خوامخواہ سب کی ملازمہ بنی رہی۔

پھپھو کہتی تھیں، دبنے والے کو سب دباتے ہیں۔ زور آور سے کوئی جیت نہیں سکتا۔ گو کہ یہ نصیحت فاخرہ سے مقابلے کے لیے کرتی تھیں۔ مگر اب وہ بھی زور آور بن کر دکھا دے گی۔ یوں بھی بقول اس

منگیتر کے منگنی کا ڈراما تو ختم ہونے والا ہے۔

اپنی ٹرے 'خالی برتن کچن میں لائی تو دیکھا خاصی افراتفری اس نے تیزی سے ناشتا بنانے کے چکر میں پھیلادی تھی۔ بس آج صرف کچن ہی سمیٹوں گی۔ باقی سارا کام شہزادیاں کریں گی۔ کمرے سے خالی برتن اٹھانے وہ وہاں پہنچی۔ دروازہ بند تھا۔ دہلیز پر ہی تھی کہ اپنا نام سُن کر رک گئی۔ اندر کی آواز بخوبی سنی جارہی تھی۔

"تم صاعقہ کو غصہ کیوں دلاتے ہو آخر؟" مامی شہریار کو ڈانٹ رہی تھیں۔ "کتنی دفعہ کہا ہے تحمل سے کام لو' مفت کی کام والی ملی ہوئی ہے۔ اسے بددل نہ کرو کہ بعد میں وہ ضد پکڑ لے۔ اس کا باپ سعودی عرب میں ہے۔ تگڑا جہیز منہ مانگا ملے گا۔ بہت فائدے اٹھانے ہیں بابا۔ تم جیسے کو ایسا رشتہ ملنا خوش نصیبی ہے۔"

"ہاں جی۔۔۔ پڑھے نہ لکھے۔ کام کے نہ کاج کے۔ پڑوسن کہہ رہی تھیں۔ کون پاگل باپ ہے جس نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ ہیرا جیسی بیٹی حوالے کردی۔" نغمہ نہ جانے کس کے بارے میں بتارہی تھی۔

"اور ابا۔۔۔ کس مشکل سے راضی ہوئے کہ ان کی پیاری بھانجی اور نکما بدتمیز بیٹا۔"

"مگر۔۔۔ مجھے وہ پسند نہیں ہے۔" شہریار پیر پٹخ کر بولا تھا۔ "کتنی دفعہ کہوں۔۔۔ مجھے نورین پسند ہے۔ اس کے ماں 'باپ راضی ہیں۔"

"ہاں تو ہمیں کب انکار ہے۔ اس سے بھی کرلینا۔ دونوں مل کر گھر سنبھال لیں گی۔"

ماں 'بیٹی کے مشترکہ قہقہے نے اسے لرزادیا۔ اندر مامی بتارہی تھیں۔

"اب کل دیکھو۔ کیسے اس نے سارے مہمانوں کو نپٹایا۔ بھلا ہم چار مل کر بھی کرسکتی تھیں۔ اسما کی شادی تک تو اسے بہلا پھسلا کر'پیار جتا کر روکنا ہی ہے۔"

"میں پیار جتاؤں؟ ہرگز نہیں۔"

"اپنے فائدے کے لیے تو انسان کچھ بھی کرلیتا ہے اور اب بھی افتخار بھائی نے چھ لاکھ کی گاڑی دلانے کا وعدہ کیا ہے۔ ہم جو بھی مطالبہ کریں گے۔ انھیں دینا ہوگا۔"

"تنی رقم مانگیں کہ ہم تینوں کے جہیز بن جائیں۔" تینوں بہنوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ "اور بھائی! انکل ابا کو دیکھنے جو آئی تھیں۔ صاعقہ کو پسند کرکے رشتہ بھی دے گئیں۔"

"اچھا۔۔۔ پھر میں اسے طلاق دے دوں گا۔ ان سے کہنا۔ سیٹ خالی ہوگئی ہے۔"

شہریار کا قہقہہ خاصا بلند تھا۔ اب برداشت مشکل ہوگئی۔ لات مار کر سلطان راہی کے انداز میں دروازہ کھولا۔ طوفان کی طرح اندر گھسی۔ انگلی سے وہ نازک پتلی سی انگوٹھی اتار کر شہریار کے منہ پر ماری۔ وہ بوکھلا کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا بدتمیزی ہے! بے ہودہ لڑکی!" وہ غرا کر بولا۔

"بدتمیزی نہیں۔ عقل مندی' بے ہودگی کا خاتمہ۔" وہ بھی غیظ و غضب کا مظاہرہ کررہی تھی۔ "بہت مشکور ہوں آپ سب کی کہ سارا منصوبہ میرے علم میں آگیا مگر اس منصوبے کو اب ختم سمجھو تم نے خود کہا تھا منگنی کا ڈراما ہے۔ جلد ختم ہوجائے گا۔ تو ہوگیا ختم۔ اب تم نورین کے لیے آزاد ہو۔"

وہ بول رہی تھی تو مامی برابر "میرا بچہ 'میری بیٹی' ہو کیا ہے۔" قسم کے لفظ بول رہی تھیں معاملہ رفت گذشت کرنے کے لیے مگر وہ طوفان میل بنی آپے سے باہر تھی۔

"کیا بکواس ہے؟" وہ چلایا۔ خالی برتنوں کی ٹرے صاعقہ نے اٹھالی تھی۔ شہری کی چنگھاڑ پر اس نے ٹرے پوری طاقت سے زمین پر پٹخی۔ مگ اور پلیٹیں اِدھر اُدھر لڑھکتی ہوئی ٹکڑوں میں بٹ گئی تھیں اور اسے خبر نہ ہوئی کب شہری اٹھ کر یک لخت جھپٹ پڑا۔ تھپڑوں کی بارش نے منہ سُجادیا۔

"سمجھتی کیا ہے تو خود کو۔ حور پری ہے۔ ملکہ عالم ہے اور ہم تیرے غلام۔ پتا نہیں کہاں سے آکر اور نہ جانے کیا گل کھلا کر آئی ہے۔ ہیں؟ پھوپھا بھی ایک بار کے کہنے سے بخوشی راضی۔ بول کیا کیا تھا تو نے؟ جو اِدھر سے اُدھر ماری ماری پھر رہی ہے۔"

شہریار کے یک دم چولا بدل کر چنگھاڑنے اور تھپڑوں کی بارش نے صاعقہ کو حواس باختہ کردیا تھا مگر اس کے الفاظ نے اس کے جسم میں شعلے بھڑکا دیے۔ بولنا چاہا' بولا نہ گیا کہ تھپڑ نے جبڑا سجادیا۔ منہ خون سے بھر گیا اور خون کی کلی اس نے شہریار کے سینے پر کردی۔ وہ اپنا غصہ بھلا کر اپنے سینے کو دیکھ رہا تھا بھونچکا سا۔ خاصی قیمتی قمیص تھی سفید براق' آن واحد میں سرخ رنگ سے رنگ گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر صاعقہ کی چوٹی مٹھی میں جکڑلی اور اس نے شہریار کا گلا۔ مامی تیزی سے آگے بڑھیں۔ بیٹے کو اس بپھری ہوئی بھتنی سے بچانے مگر اس میں کسی جن کی طاقت حلول کرچکی تھی۔ وہ اسے بُری طرح نوچ کھسوٹ رہی تھی۔ بالوں کے کھنچاؤ کی تکلیف کے باعث۔ شہریار اس کے حملوں سے گھبرا گیا تھا مگر بال اس نے چھوڑے نہیں۔ اسی وقت باہر سے آواز آئی۔

"ارے سب کہاں ہیں بھئی؟" ابھی کوئی بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرسکا تھا کہ خالہ جان اور ماموں نے اندر قدم رکھے۔

خالہ جان کے لیے یہ خوف ناک سین تھا۔ ماموں کے لیے ناقابل برداشت۔ مامی ہکلا رہی تھیں اور شہریار نے ابھی اس کے بال نہیں چھوڑے تھے۔ نہ صاعقہ نے اس کا گلا۔ مامی نے بیٹے کو دھکا دیا۔ اس نے حالات کا اندازہ کرتے ہی پیچھے ہٹنا بہتر سمجھا۔ خالہ جان آگے بڑھ کر صاعقہ کو لپٹا کر چوم رہی تھیں اور ماموں نے اپنا جوتا ہاتھ میں لے کر اکلوتے بیٹے کی دُھنائی شروع کردی۔ بہنیں وہاں سے رفوچکر ہوچکی تھیں۔

ماموں نے ایسی تواضع کی۔ جوتے نے منہ دیکھا نہ آنکھ۔ وہ پھٹے ہوئے ہونٹوں' ہلتے دانتوں سے خون ٹپکا رہا تھا۔ ماموں کے غیظ و غضب میں کمی نہیں ہورہی تھی۔ مامی بیٹے کو بچانے آگے آئیں۔ ان کے بازو پر بھی ایک جوتا پڑا تو ہائے کرکے کرسی پر جاگریں۔ کسی فلمی ہیروئن کی طرح جو ایسے موقع پر صوفے پر ہی گرتی ہے۔ خالہ جان صاعقہ کو بانہوں میں لیے شاکی نظروں سے مامی کو دیکھ رہی تھیں اور اسی حالت میں بھتیجے کو پٹتا چھوڑ کر صاعقہ کو پکڑ کر باہر آگئیں۔ دروازے پر علی حسن دم بخود کھڑے اندر کا نظارہ کررہے تھے۔ خالہ جان کے اشارے پر وہ ان کے پیچھے چل پڑے۔ خالہ جان کا رخ باہر کے دروازے کی جانب تھا۔

"یہ حال بنادیا ہے آپ لوگوں نے بچی کا منگنی کا بہانہ کرکے۔ ارے میں تو مبارک باد دینے آئی تھی۔"

خالہ جان مامی کی التجاؤں کے جواب میں بے نقط سنا رہی تھیں۔ مامی لپکتی آرہی تھیں پیچھے پیچھے پکارتی ہوئی۔

"ارے! ماں مری ہے اس کی۔ باپ اور خالہ زندہ ہیں۔ کیا سمجھ رہی تھیں آپ اسے لونڈی بنا کر رکھیں گی۔ منگنی کرتے ہوئے مجھ سے رائے لینا درکنار۔ خبر تک نہ کی۔ یہ سلوک' یہ ظلم' الٰہی! ہاتھ کیوں نہ ٹوٹ گئے اس بچی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے۔"

اسے خود میں سموئے فریاد کناں تھیں بھتیجے کی درگت کا خیال کیے بغیر جو بری طرح زخمی ہوچکا تھا۔ بازو چھل گئے تھے۔ گردن سوج چکی تھی۔ جبڑا ٹیڑھا' ایک دانت غائب' ہونٹ اور منہ سے خون' ماتھے پر خراش' کسی نے اس ہارے ہوئے بہادر کو تسلی نہ دی۔ کچھ پوچھا تک نہیں۔ بہنیں غائب تھیں۔ خالہ جان باہر آکر گاڑی میں صاعقہ کے ساتھ بیٹھ چکی تھیں۔ مامی حق دق گیٹ پر کھڑی رہ گئیں۔ علی حسن نے گاڑی آگے بڑھادی۔ صاعقہ روبوٹ کی طرح خالہ جان کا ساتھ دیتی رہی۔ گاڑی میں خالہ جان اس کا سُوجا ہوا سرخ منہ ہاتھوں میں لے کر چوم رہی تھیں۔ ان کے آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ صاعقہ نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔ آنکھوں سے لگائے۔

"خالہ جان! آپ روئیں تو نہیں۔ یقین کریں میں نے بھی کسر نہیں چھوڑی' خوب پٹائی کی ہے۔ چند روزہ منگیتر کی۔" خالہ جان کچھ ٹھنڈی پڑیں۔

"میں تو صبح سویرے اسی لیے چل پڑی کہ گھنٹہ دو گھنٹہ ٹھہر کر بھائی' بھابھی کو مبارک باد دے کر تمہیں

ساتھ لے آؤں گی۔ رات افتخار بھائی کا فون آیا۔ ان سے مجھے تمہاری منگنی کی خبر ملی۔ وہ بہت فکر مند تھے کہ نہ جانے تم خوش ہو بھی کہ نہیں۔ وہ تمہیں فون کرتے ہیں تو کوئی تم سے بات نہیں کراتا۔ اسی لیے پریشان ہیں۔ ادھر فاخرہ بیمار ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ نہ جانے کس طرح۔"

وہ چپ ہو گئیں۔ صاعقہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آپ مجھے ابا کے گھر پہنچادیں۔"

صبیحہ نے خوش ہو کر کہا۔ "بہت درست فیصلہ کیا ہے تم نے۔ چلو پھر... میں بھی فاخرہ کو دیکھ لوں گی۔ اسے تمہاری وجہ سے ڈھارس رہے گی۔ تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا مار ہی کھاتی رہیں؟"

وہ ہنس پڑی۔ ہائے خالہ کا خیال۔ وہ انہیں شروع سے اپنی بپتا سناتی رہی۔ خالہ جان سے برش لے کر بال بنائے۔ کچھ حلیہ درست ہوا مگر چہرے پر سوجن تھی۔ اس لیے درمیان میں رک کر ہوٹل کے اندر جانے کے بجائے علی حسن نے ان کا کھانا گاڑی میں منگالیا۔ خود ہوٹل کے اندر چلے گئے۔

کھانا کھا کر اور اس گھٹن زدہ ماحول سے نکل کر خالہ جان کی محبت بھری آغوش اور تسلیوں نے اس کا اعتماد بحال کردیا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "خالہ جان! پتا ہے میں گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ کھانا، ناشتا بناتی تھی مگر... کوئی کام دل لگا کر نہیں کیا۔ اس لیے کسی کو پسند نہ آتا، سب خفا ہی رہتے۔"

"تم نے بے دلی سے سیکھا۔ بے دلی سے پکایا۔ میری جان! اگر تم وہاں خوش ہوتیں تو خوشی سے سب کچھ کرتیں۔ بے دلی سے کیا ہوا کام کسی کو پسند نہیں آتا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ "میں نے کپڑے دھوئے وہ بھی خراب۔ برتن دھوئے تو ٹوٹتے رہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے چائے کے سارے برتن توڑ کر آئی ہوں۔ اسی پر شہریار کو غصہ آیا۔"

خالہ جان نے علی حسن سے کہا۔ "تم نے دیکھا۔ کتنی سچی ہے میری بچی۔ اس کی قدر نہ کی کسی نے۔ بھائی بھی بیوی بچوں سے ڈر گئے اور شہریار جنگلی جاہل۔"

"امی! یہ زمانہ مفاد پرست ہے۔ وہ ڈرتے تو بیٹے کو مار مار کر لہولہان نہ کرتے لیکن... شاید وہ منظر نا قابل برداشت تھا یا آپ کی وجہ سے... بظاہر..."

صاعقہ نے جلدی سے کہا۔ "نہیں اصل میں... میں نے ہی گڑبڑ پھیلادی۔ مامی کی باتیں سن لی تھیں۔ ان کا منصوبہ تھا کہ جہیز کے نام پر ابا سے چھ لاکھ کی گاڑی اور منہ مانگا جہیز لیں گی۔ بس پھر میں نے انگوٹھی اتار کر شہریار پر دے ماری۔ اس طرح لڑائی شروع ہو گئی۔ اب سب انگوٹھی کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ بھی منی باریک سی تھی۔ میں تو برداشت نہیں کر سکی۔ پھر جو تھپڑ پڑے۔"

"اور تم نے بے چارے منگیتر پر خون کی کلی کردی۔ یہ... قمیصوں کو داغ دار کرنا تمہاری عادت ہے یا کوئی مجبوری؟"

علی حسن مسکرا رہے تھے۔ مضحکہ اڑا رہے تھے اس کا۔ وہ چپ ہو گئی اور چپ ہی رہی۔

"تمہیں تو لگتا ہے بخار ہے۔" خالہ جان اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔

"کل تھا، آج اتر گیا۔"

"پٹائی سے پہلے یا پٹائی کے بعد۔" علی حسن نے پھر جملہ کسا۔ وہ پھر چپ کی چپ رہ گئی۔

"کل بخار کیوں ہوا کوئی خاص وجہ؟" خالہ کے پوچھنے پر اس نے گزری ہوئی کل کی مصروفیات اور اپنی کارگزاری، کسی کی مدد نہ ملنا اور تھکن، آخر میں ابا کا ریجیکٹ ہونا اور خود کا رشتہ... سب سنایا مزے لے لے کر۔ علی حسن ہنس رہے تھے۔ وہ حیران۔ گفتگو میں ان کا دخل دینا۔ مذاق اڑانا اور ہنسنا۔ یہ سب علی حسن کی عادات سے میل نہیں کھاتا تھا۔ گھر کے علی حسن اور سفر کے علی حسن میں بہت فرق لگا۔ وہ آنکھیں بند کرکے آرام کرنے لگی۔ پھر...

☆ ☆ ☆

ابا کا گھر آگیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ دندناتی اندر گھس

مگر وہاں بھی منظر خاصا دلچسپ تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی، بہن ہاتھوں میں پلیٹیں لیے کھڑے تھے۔ اس کے اندر آتے ہی پلیٹوں میں رکھی گلاب کی پنکھڑیاں انہوں نے صاعقہ پر اچھال دیں۔ وہ بھونچکا سی رہ گئی۔ اتنا شاندار استقبال؟ وہ جھک گئی۔ چاروں کو لپٹالیا۔ خالہ جان بولتی ہوئی اندر آرہی تھیں۔

"اے لڑکی۔ ایسی بھی کیا جلد بازی، مجھے چھوڑ کر بھاگی۔ واہ... بھئی یہاں تو پھولوں سے استقبال ہوا ہے۔" اور صاعقہ انہیں گلے سے لپٹائے رو رہی تھی۔ دل میں سب کچھ اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ گھر، اپنا گھر، اپنے بھائی بہن، ایسی نعمتوں کو ٹھکرا کر کس آرام و آسائش کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔ پلنگ پر لیٹی بیمار فاخرہ آبدیدہ تھیں۔ بچوں کا جوش و خروش اور صاعقہ کے ندامت کے آنسو۔ علی حسن اندر آئے تو پھولوں کی پنکھڑیاں قدموں سے لپٹ گئیں۔

"ارے... یہ گلابوں کی کس نے گت بنادی۔ بے حرمتی ہوتی ہے۔ پھول مقدس ہوتے ہیں۔"

پھر سب باتیں کرنے لگے۔ وہ کمرے سے نکلی۔ سب جگہ کا جائزہ لے کر کچن میں آئی۔ بھائی ساتھ ساتھ، کچن بہت صاف ستھرا تھا۔ جیسے کوئی سلیقہ شعار صفائی پسند عورت ابھی یہاں سے نکل کر گئی ہو۔

"کچن کون صاف کرتا ہے؟ کھانا کون بناتا ہے؟"

"ماموں!"

یہ کون ذات شریف ہیں۔ خیر پتا چل جائے گا۔ بہت دل لگا کر چائے بنائی۔ بسکٹ اور نمکو بھی مل گئے۔ ٹرے میں چائے لے کر اندر آئی۔ سب نے ساتھ چائے پی۔ پھر خالہ جان اور علی حسن واپسی کے لیے کھڑے ہو گئے۔ علی حسن نے ہی وہاں ہوٹل سے فاخرہ کو فون کرکے صاعقہ کی واپسی کی خبر دی تھی۔ انہیں ابھی پھر سفر کرنا تھا۔ کم از کم تین گھنٹے۔ علی حسن کا موڈ بہت اچھا تھا۔ انفر سے پوچھنے لگے۔

"ارے ہاں... جب ہم اندر آئے... تم لوگ کون سا گانا گا رہے تھے؟"

اور تینوں بھائی سُر ملا کر شروع ہو گئے۔

"گھر میں ہمارے آئی بہن۔
آؤ پھول برسائیں۔"

اور صاعقہ حیران ہو گئی۔ اس نے تو جوش میں کچھ سنا ہی نہ تھا۔ بس انہیں پھول برساتے دیکھ کر ہی محبت اور جذبے سے مغلوب ہو کر ان سے لپٹ گئی تھی اور علی حسن اس قدر چوکنا کہ انہوں نے سنا بھی، دیکھا بھی، پھولوں کی پتیوں کو فرش پر گرے ہوئے دیکھ کر اعتراض بھی کردیا۔

"ان لوگوں کی قدر کرنا سیکھو۔"

انہوں نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد صاعقہ سے کہا۔ گاڑی روانہ ہو گئی تو وہ بھائیوں کے ساتھ اندر آئی۔ چھوٹی اپنی ماں سے لپٹی سو رہی تھی۔ پھر تینوں اپنے اسکول بیگ لے آئے۔ وہیں فرش پر بیٹھ کر ہوم ورک کرنے لگے۔ فاخرہ نے صاعقہ کو دیکھا۔

"شعر کو... ہوم ورک کرادینا۔ اسے اسپیلنگ یاد نہیں رہتی۔"

وہ اس طرح مخاطب تھیں جیسے صاعقہ کہیں گئی ہی نہیں، یہیں رہتی تھی، وہ پیچھے بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگی۔ خاصے ذہین بچے تھے۔ پھر سب نے ہوم ورک ختم کرکے بیگ میں بکھری ہوئی چیزیں، کتاب، کاپی، پنسلیں وغیرہ رکھیں۔ بیگ اندر لے جاکر رکھے اور برآمدے میں نکل گئے۔

"بھئی واہ... یہ تو بہت قاعدے کے بچے ہیں۔" اس نے دل میں سراہا۔

کرسی پر بیٹھ کر وہ فاخرہ سے باتیں کرنے لگی۔ بے تکلفی سے۔ ادھر ادھر کا حال احوال، ابا کے فون کا، پھپھو کے گھر کا۔ آخر میں پوچھ لیا۔

"یہ ماموں کون ہیں؟"

"میرا بھائی ہے۔ اتفاق دیکھو۔" فاخرہ بھی سہولت سے بات کرنے لگیں۔ "ادھر تمہارے ابا کا سعودیہ جانے کا طے ہوا۔ میں بیمار ہو گئی اور تمہارے ابا پریشان اور ادھر انور کی جاب ادھر ہی ہو گئی۔ وہ آیا تو ہمیں کچھ اطمینان ہوا پھر تمہارے ابا چلے گئے۔ مجھے یہ بے فکری کہ بچوں کے اسکول کا ناغہ نہیں ہوگا۔ اسی کے

ساتھ جاتے ہیں۔ پھر دوپہر میں انہیں لے بھی آتا ہے۔ صبح ناشتا بناتا ہے۔ دوپہر کو آکر جیسا تیسا کھانا بھی تیار کرلیتا ہے۔ بہت بوجھ ہے اس پر۔"

"میں رات کے لیے کچھ بنالوں؟" وہ کچھ لاپروا سی لگی۔ "آپ کے لیے پرہیزی چاول 'کھچڑی؟"

"تم۔ بنالوگی؟" وہ خوف زدہ سی ہو گئیں۔ ظلم کررہی ہیں۔ اپنی پھپھو کو ایک کی دس لگادے۔

"ہاں۔ میں سب کچھ بنالیتی ہوں۔ مامی سے سیکھ لیا ہے۔ بہت اچھا نہ سہی 'مگر۔"

"آج تھکی ہوئی آئی ہو۔ کل کرلینا آج انور آکر بنالے گا کچھ۔"

"نہیں۔ ٹھیک ہے۔ میں کچھ بنالوں گی۔ کچن میں کچھ نہ کچھ مل جائے گا 'گوشت' سبزی۔"

وہ جانے لگی 'پھر رک کر پوچھا۔ "آپ پرہیزی کھانا کھائیں گی یا۔"

"جو تم بناؤگی وہی کھاؤں گی۔ پرہیز بہت کرلیا۔" وہ کچھ شوخ ہوئیں۔ صاعقہ بھی مسکرائی۔

"تو پھر۔ دال چاول بنالوں 'پھر کل سے باقاعدہ۔" کہتی ہوئی کچن میں جاگھسی۔

حیرت۔ فاخرہ کو یقین کیسے آتا۔ یہ وہی تو ہے۔ ان کی ہر بات رد کرنے والی۔ ذرا' ذرا سی بات پر بسورنے والی۔ یہ ڈراما کررہی ہے یا واقعی بدل گئی ہے۔

صاعقہ نے کمال کردکھایا۔ دال' چاول بھی اچھے بنائے اور ساتھ ہی ٹماٹر' پیاز' ہرا لہسن' ہرا دھنیا ڈال کر لذیذ چٹنی بھی بنادی۔ ہری مرچ ملی نہیں 'کالی مرچ پسی ہوئی اوپر سے چھڑک کر لیموں نچوڑ دیا۔

☆ ☆ ☆

رات کو ابا کا فون آگیا۔ بیٹی کی آمد نے انہیں بے حد خوش کردیا۔

صاعقہ نے بہت تمیز سے اور بے حد یگانگت سے باپ سے بات کی۔ کوئی شکوہ نہ شکایت۔ اپنی خوشی کا اظہار بھی کیا اور ہمیشہ یہیں اس گھر میں رہنے اور کہیں نہ جانے کا وعدہ بھی کرلیا۔ پھر فاخرہ کو کھانا لا کردیا۔

"آپ بیمار ہیں۔ آپ کو وقت پر کھالینا چاہیے۔ پھر دوا بھی تو کھانی ہوگی۔"

کتنی سمجھ دار۔ کس قدر ذمے دار ہو گئی تھی یہ۔

فاخرہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیسے اپنی حیرت اور خوشی کا اظہار کریں۔ اس نے انہیں دوا بھی کھلائی۔ پھر ان ہی کے پاس آکر لیٹ گئی۔

فاخرہ کو اس پر پیار آگیا۔

"تھک گئیں؟" انہوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پرو کر کچھ جھک کر پوچھا۔ صاعقہ کے اوپر ان دو لفظوں نے جادو اثر کیفیت طاری کردی۔ وہ اس کیفیت سے نا آشنا تھی۔

مامی کے گھر یہ لفظ کسی سے سُنے نہ تھے۔ چاہے سارا دن وہ کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہے۔ سب کو اپنی خواہش' اپنی فرمائشوں کی فہرست اس کی سماعت میں انڈیل کر بے فکر ہوجانے کا گُر معلوم تھا۔ بعد میں شکریہ۔ یا ہمدردی کے یہ دو لفظ کبھی کسی کی زبان سے نہ نکلتے۔ صاعقہ کی سسکی سن کر فاخرہ ڈر گئیں۔

"کیا ہوا صاعقہ! درد تو نہیں ہے؟"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "ماں! میں بہت بُری ہوں کیا؟"

تعجب سے فاخرہ کا منہ کھل گیا۔ "سب کو پریشان کردیا۔ یہاں سے چلی گئی۔ ابا کا دل دُکھایا۔" لمبی فہرست تھی۔

فاخرہ مسکرائیں۔ "نہیں وہ خفا تو نہیں ہیں۔ نہ ہی انہیں تم سے شکوہ ہے۔ تم ان کی سب سے پیاری بیٹی ہو۔ بس ایک بات کی فکر تھی انہیں۔ جب فون کرتے تم سے بات نہ ہوتی۔ سعودی عرب جاکر بھی تم سے بات نہ کرسکے۔"

"اب میں کبھی کہیں نہیں جاؤں گی۔" وہ لاڈ سے منمنا کر بولی۔ فاخرہ کو ہنسی آگئی۔

"سسرال تو جانا پڑے گا۔" انہوں نے اپنائیت کے لہجے میں کہا۔

"کبھی نہیں۔ مجھے کہیں جانا ہی نہیں ہے۔ مگر ہاں کل پھپھو کے پاس ضرور جانا ہے۔ ان کا شکریہ ادا کرنے۔"

صاعقہ تو حیرانیوں کے ریکارڈ قائم کررہی تھی۔ خالہ کے گھر جاتے ہوئے اس کا اعلان انہوں نے سنا تھا کہ وہ اب کبھی پھپھو کے گھر نہیں جائے گی۔ بہت ناراض ہو کر گئی تھی اور اب۔

"اچھا۔ چلی جانا۔ انور صبح بچوں کو اسکول لے جاتا ہے۔ آپا کا گھر اسکول کے راستے میں تو ہے۔ وہ تمہیں اتار کر پھر اسکول چلا جائے گا۔ لو۔ ماشاء اللہ بڑی عمر ہے۔"

باہر بچوں کے شور نے اعلان کردیا تھا۔ ماموں آگئے اور پھر بھانجے' بھانجی کو بازوؤں میں لٹکائے اندر آگئے۔ اسے دیکھ کر ٹھٹکے۔

فاخرہ نے تعارف کرایا۔ "میری بیٹی آگئی ہے۔"

"سوری آپا! دیر ہو گئی۔ میں سوچ رہا تھا بچے اور آپ بھوکے بیٹھے ہوں گے۔ مگر یہاں تو خوشبوئیں کھانا پک جانے کا اعلان کررہی ہیں۔"

"خوش مزاج لگ رہے ہیں محترم۔" وہ تنقیدی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"بھئی۔ بھوکے کیوں ہوتے۔ ان کی آپا نے چائے تو بنائی ہی' چپس بھی بنادیے۔ مزے ہوگئے ان کے۔ چلو تم نہالو۔ پھر کھانا سب ساتھ کھائیں گے۔"

فاخرہ نے صاعقہ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ کیوں اچانک آگئی۔ منگنی کیسے "فانا" ہوئی اور اس کے مزاج کی تبدیلی کیسے ممکن ہوئی۔ اسے فاخرہ کی یہ احتیاط اچھی لگی۔

وہ وہیں صوفے پر لیٹ کر سو گئی۔ فاخرہ چاروں بچوں کے ساتھ اپنے بیڈ پر اس طرح سوتی تھیں۔ جیسے مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں چھپا کرپالتی ہے۔ صبح سویرے صاعقہ اٹھ گئی۔ اسے پھپھو کے گھر جانا ہی تھا۔ سب کے لیے ناشتا بنا کر اپنے کمرے میں گئی۔ اپنے کپڑے ماموں کے گھر چھوڑ آئی تھی۔ یہاں چند ہی جوڑے اچھے رہ گئے تھے۔ جتنی دیر میں ماموں نے بھانجوں کو اسکول کے لیے تیار کیا۔ وہ بھی تیار ہو گئی۔ باہر نکلی تو فاخرہ نے پوچھ لیا۔

"اب تم واپس کیسے آؤگی؟"

اسے فاخرہ کا اپنے لیے فکر مند ہونا اچھا لگا۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ کسی بھی دل میں جگہ بنانے کے لیے صرف خلوص ہی کافی نہیں۔ ایثار کی بھی اہمیت ہوتی ہے اور اب وہ خود بہت سی حقیقتوں سے آگاہ ہونے کے بعد اصل فطرت کی طرف لوٹ آئی ہے۔ اس کی فطرت' محبت اور ایثار کے رنگوں سے رنگی ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس کے ذہن کو پراگندہ کرنا چاہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماموں کی گاڑی چھوٹی تھی۔ مگر چلتی خوب تھی۔ وہ پھپھو کے گھر اتر گئی۔ پھپھو اسے دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ اتنی صبح اس کا تیار ہو کر آنا اور انہیں اس کے واپس آنے کی ہی خبر نہ تھی۔ بھتیجی کے ڈھنگ کچھ بدلے ہوئے تھے۔ لیٹ کر ان کا شکریہ ادا کررہی تھی۔

"کون سا شکریہ 'کس بات کا شکریہ۔"

"پھپھو! آپ نے کہا تھا۔ لڑکی کے لیے باپ کی چھت سے زیادہ محفوظ کوئی جگہ نہیں ہوتی 'بس اس کا مطلب اب سمجھ میں آیا ہے۔"

"اللہ خیر 'ہوا کیا؟"

"ہوا کچھ نہیں 'مگر میرا دل لگا ہی نہیں کہیں۔ یہاں آکر اتنا سکون ملا۔ ابا گھر پر نہیں۔ مگر ان کی خوشبو ہر جگہ ہے۔" وہ سنجیدہ تھی۔

پھپھو نے کہا۔ "بیٹا! اپنا گھر' خواہ جھونپڑی ہو' دوسروں کے محل سے زیادہ آرام دہ اور محفوظ ہوتا ہے۔ اچھا کیا تم آگئیں۔ فاخرہ نگوڑی بیمار' چھوٹے بچے 'تم سے کچھ تسلی ہوگی۔"

پھپھو کے سب گھر والوں سے مل کر اس نے واپسی کی ٹھانی۔ سب روکنے لگے 'مگر اس نے کہا۔

"پھپھو! گھر میں کوئی ہے نہیں۔ وہ تو بیمار ہیں اور ان سے اٹھا بھی نہیں جاتا۔ میں اب جاکر کھانا وغیرہ بنادوں گی۔"

"کھانا وغیرہ!" سب نے آنکھیں نکالیں۔ جو لڑکی ہل کر پانی نہ پیتی ہو۔ وہ کھانا بنائے گی۔ سب

نے اسے سراہا۔ وہ بتا نہ سکی کہ اس کے سدھرنے میں، ان خود غرض، مفاد پرست عناصر کا ہاتھ ہے۔ جو اس کے اپنے تھے، سگے تھے، سوتیلے نہیں۔

صاعقہ کے پھپھو کے گھر جانے کے بعد فاخرہ نے فون کر کے افتخار صاحب کو بتایا۔ وہ بہت بدل گئی ہے۔ وہ اور انور مل کر پورا گھر سنبھال رہے ہیں اور اس کی یہ تبدیلی بچوں کی خوشی کا باعث ہے۔ تو خود ان کے لیے اطمینان کا سبب۔ افتخار بے حد خوش ہوئے۔ چلو صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔

صاعقہ نے بڑی ذمہ داری سے گھر سنبھالا ہوا تھا۔ بھائیوں کے ساتھ کھیلتی بھی تھی۔ ان کا ہوم ورک، ان کا خیال، بہن تو اس کے گلے کا ہار بن گئی تھی۔

زندگی میں حادثے بھی پیش آتے ہیں۔ نت نئے واقعات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ان سے نپٹنے کے لیے مضبوط قوت ارادی اور سچ جھوٹ میں فرق کی پہچان کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

پھپھو اس سے محبت تو کرتی تھیں۔ اسی محبت کے مظاہرے کا ثبوت دینے کے لیے اسے ہمیشہ فاخرہ کے خلاف بھڑکاتیں۔ اپنی حمایت کا یقین دلا کر اس کو نافرمانی کے سبق دیے۔ انہیں اندازہ نہ ہوا۔ اس طرح وہ اس بچی کے ذہن میں نفرت کے جذبے کو ہوا دے رہی ہیں۔ فاخرہ اس کی ماں نہ تھیں۔ مگر اس کے ابا کی بیوی تھیں۔ اس کے بھائی، بہن کی ماں تھیں۔ فاخرہ کے خلاف کر کے ان کے بچوں سے بے زار کر دیا تھا۔ جو اس کے اپنے بھائی بہن تھے۔ مگر اب اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اچھے برے کے فرق کا بھی احساس ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

فاخرہ اب تیزی سے روبہ صحت ہو رہی تھیں۔ بے فکری، اطمینان اور بہتر حالات، سب عوامل مل کر انہیں طاقت پہنچا رہے تھے۔

اس دن صاعقہ نے صبح سب سے پہلے بھائیوں اور انور کو ناشتا لا کر دیا۔ پھر عنیقہ اور فاخرہ کے لیے کمرے میں لے آئی۔ گو کہ اب فاخرہ بچوں کے ساتھ ناشتا کر لیتی تھیں لیکن آج عنیقہ نے انہیں رات میں بہت تنگ کیا تھا۔ کافی جاگنا پڑا تھا۔ سستی کا غلبہ تھا۔

صاعقہ ناشتا لائی تو انہوں نے کہا۔

"تم بھی ہمارے ساتھ ناشتا کر لو۔ عنیقہ ضد کرتی ہے۔ وہ بھی تمہارے ہاتھ سے کچھ کھا لے گی۔"

"اچھا... میں اسے ناشتا کرا دیتی ہوں۔"

"ارے بابا! یہ اب بڑی ہو گئی ہے، خود کر لے گی۔ مگر تم تو بیٹھو۔ صبح سے پھرکی کی طرح پھرتی ہو۔ ابھی تک بھوکی پھر رہی ہو۔ آؤ... میں بس ایک سلائس لوں گی۔" "آجاؤ، کام بعد میں ہوتے رہیں گے۔"

صاعقہ کا دل ایک بار پھر کسی نے شکنجے میں کس لیا۔ حیرت... اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کاش ماں کے گھر میں کبھی کسی نے یہ لفظ اس سے کہے ہوتے۔ وہ جان نثار کر دیتی۔ لمبا سانس لے کر عنیقہ کے ساتھ ہو گئی۔

"آپ نے تو کچھ کھایا ہی نہیں۔ میں دودھ لے آؤں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں... سستی ہے... رات جاگنے کی وجہ سے۔ بھوک لگی تو کچھ لے لوں گی۔"

"ہاں... رات عنیقہ کئی بار بے چین ہوئی۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے۔"

"نہیں، کان میں درد تھا۔ سنکائی کر دی تو سو گئی۔ دراصل میں اور انور باتیں کرتے رہے دیر تک۔ تمہاری نیند نہ خراب ہو۔ اس لیے میں برآمدے میں بیٹھ گئی تھی۔"

"اچھا... میں تو لمبی تان کر سوتی ہوں، مجھے کچھ خبر نہیں۔"

"تم دن بھر کام کر کے تھک جاتی ہو، اس لیے نیند گہری ہوتی ہے۔" ان کا ہمدرد لہجہ، وہ متاثر ہو گئی۔

"آج ماموں بھی اسی لیے دیر سے جاگے ہیں۔"

"ہاں... وہ بہت جذباتی ہے۔ رات بہت اداس تھا۔ دراصل ہم اماں ابا کی باتیں کرتے رہے۔ اماں کی نصیحتیں، ان کی خواہشیں، ارمان، انور یاد کر کے

روتا رہا۔"

"ہائیں! مرد بھی روتے ہیں؟"

"ہاں، دل کا درد آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ جاتا ہے۔ دراصل آج اماں، ابا کی برسی ہے۔" فاخرہ افسردگی سے بتانے لگیں۔ "دونوں ایک ساتھ روڈ ایکسیڈنٹ میں ختم ہو گئے۔"

صاعقہ کے دل پر گھونسا لگا۔ "دونوں؟" وہ ان کے کندھے سے لگ کر رو پڑی۔ "اتنا بڑا حادثہ، آپ نے کبھی بتایا نہیں۔"

"اپنا غم، دوسروں کو بتا کر دکھ دینا، بس ہم دونوں ہی یاد کر لیتے ہیں۔"

"اماں! اپنے غموں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔"

"تم نے بھی تو کبھی مجھ سے اپنا کوئی دکھ شیئر نہیں کیا۔" وہ بے ساختہ بول پڑیں۔ "یہ تک نہ بتایا کہ ماموں کے بیٹے سے منگنی ہوئی تو ٹوٹ کیوں گئی۔"

صاعقہ نے برتنوں کی ٹرے اٹھائی اور کچن میں چلی گئی۔ اسٹول پر بیٹھ کر ہتھیلیاں کھول کر دیکھنے لگی۔ پتا نہیں ان لکیروں میں قسمت کی کون سی لکیر ہے۔ کہتے ہیں لکیریں بولتی ہیں۔ نہ جانے میری قسمت میں کیا ہے۔ کہیں سے کوئی خوشی بھی ملے گی؟ اس میں شک تھا۔ کہیں سے امید نہیں۔ سکھ کیا ہوتا ہے۔ دکھ کا بڑا بھائی یا چھوٹا۔ اب غموں کے شیئر کرنے سے کیا حاصل؟ ہر سمت دھوکا، جھوٹ، مکاری۔

"میں چائے لے سکتا ہوں؟" وہ خیالوں میں اس طرح گم تھی! آواز پر اچھل پڑی۔ انور کیتلی کا جائزہ لے رہے تھے۔

"جی... جی... یہ آپ کی ہی ہے۔ لائیے... میں گرم کر دوں۔ ناشتا وہیں رکھ دیا تھا۔ انفر، اشعر کے ساتھ۔"

"اوہ... آپ کو زحمت ہوئی۔ میں اپنا ناشتا خود بنا لیتا۔" وہ روز اپنے لیے خود ہی کچھ بنا لیتے تھے۔ اب کیتلی چولہے پر رکھے پیالی چمچہ نکال رہے تھے۔

"آپ آج دیر سے اٹھے۔"

"جی۔ بس سستی سی تھی۔" چائے پیالی میں ڈال کر دودھ، چینی ملا کر باہر نکلنے لگے تو چونک کر رک گئے۔ صاعقہ کہہ رہی تھی۔

"آپ بھی اپنے غم کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتے؟ میری طرح۔"

"کیا؟ غم... میں سمجھا نہیں۔" اچنبھے سے اسے دیکھنے لگے۔

"آج... آپ کے اماں، ابا کی برسی ہے نا؟"

"اوہ... آپ کو کس نے... اچھا آپا نے بتایا ہو گا؟ آپ نے کہا، غم شیئر نہیں کرتا۔ کیا غم بھی نقارے بجا کر اعلان کر کے منائے جائیں؟"

وہ ہتھیلیاں مسلنے لگی۔ "آپ کو لکیریں پڑھنی آتی ہیں قسمت کی؟" انور بغور اسے دیکھنے لگے۔ اداس حسین افسردہ چہرہ۔

"جی نہیں، میں ان لکیروں پر یقین نہیں رکھتا۔ آپ اپنا غم مجھے بتا سکتی ہیں۔"

"میری امی کی بھی آج برسی ہے۔"

"اوہو... سوری، معاف کیجیے، مجھے خبر نہ تھی۔"

وہ اٹھی اور باہر نکل گئی۔ باتھ روم میں جا کر آنسو بہائے۔ بال درست کیے، پھر باہر نکلی، بچے اسکول کے لیے گھر سے نکل گئے۔ ابا کا فون آیا۔ پھر خالہ جان کا، انہیں یاد تھا، پیار سے سمجھاتے رہے۔ ابا کا دوبارہ فون آیا۔ اس کی فرمائش پوچھ رہے تھے۔ اس نے فاخرہ کو ریسیور دے کر کہا۔ "بتا دیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بس ابا چاہئیں۔"

برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے سنا۔ وہ کچھ صفائیاں دے رہی تھیں۔

"نہیں بھئی، بہت اچھی بچی ہے۔ میں اگر اسے کچھ کہتی ہوں تو اس کی اصلاح کے لیے۔ وہ اسی طرح میری بڑی بیٹی ہے، جیسے عنیقہ چھوٹی۔ مجھے معلوم ہے آج صفیہ کی برسی ہے۔ اللہ انہیں جنت عطا کرے۔" "آمین۔"

فاخرہ عنیقہ کی فراک میں بٹن ٹانکنے لگیں۔ وہ کچن سنبھالنے لگی۔

☼ ☼ ☼

پھپھو کو اب اعتراض انور کے قیام پر تھا۔ آخر اب تک وہ خاموش رہی تھیں۔ یہ ان کا احسان تھا۔ صاعقہ کے آنے کے بعد انہوں نے اس سے پوچھنا شروع کیا۔

"کب جائے گا یہ۔ کب تک رہے گا۔ مفت میں رہتا ہے' کھاتا پیتا ہے۔ جب افتخار یہاں تھا۔ تب تو یہ نہ جانے کدھر تھا۔ وہ سب رشتے داروں سے دور مشقت کی زندگی گزار رہا ہے اور سالے صاحب یہاں عیش کر رہے ہیں۔ صاعقہ! بہانے سے پوچھو تو سہی۔ اے بھئی اب جوان بیٹی گھر میں ہے۔ یہ مناسب تو نہیں' شریعت میں بھی اس کی ممانعت ہے۔"

انہوں نے صاعقہ کو بہت سمجھایا۔ صاعقہ نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ "وہ رات کو اماں کے کمرے میں رہتی ہے۔ انور ماموں صبح ہی آفس جاتے ہیں۔ شام کو آتے ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں وقت گزارتے ہیں۔ فاخرہ خود انور کے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔ شریف آدمی ہیں۔"

مگر پھپھو کو سمجھانا آسان نہ تھا۔

انور گھر میں ہوتے تو کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے۔ کبھی کچن صاف کر دیا۔ برتن دھو دیے۔ اپنے کپڑوں کا دھونا' استری کرنا۔ کبھی کبھی بچوں کے کپڑے دھو دیتے۔ صبح ان کے یونیفارم تبدیل کرنا۔ بیگ درست کر کے انہیں لے جانا۔ خاصی ذمے داری سے کام کرتے تھے۔ صاعقہ نے پھپھو کے اکسانے پر ہمت کی۔ فاخرہ سے پوچھ لیا۔

"ماموں' عورتوں والے کام کیوں کرتے ہیں۔ مرد تو کچن میں جانا پسند نہیں کرتے۔"

"میرے بھائی نے بہت سخت زندگی گزاری ہے ابا' اماں کے بعد۔ مزدوری پر مجبور ہوا۔ رشتے داروں نے میری شادی کروا دی تو۔۔۔ گھر کا ہر کام خود کیا۔ اب تک اپنا کام کرنے کی عادت ہے۔ کسی کو زحمت دینا گوارا نہیں۔ پھر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لیے جدوجہد کی۔ تعلیم مکمل کی۔ تم کہتی ہو نا دل لگا کر جو کام کیا جائے اچھا ہوتا ہے۔ انور کا قول ہے کہ محنت کرو۔ جتنی محنت کرو گے۔ صلہ بھی اتنا ہی ملے گا۔ اس نے بہت محنت مشقت سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ اس نے فاقے بھی کیے' مگر ہمت نہ ہاری۔"

"آپ انہیں پہلے بلا لیتیں۔" صاعقہ متاثر ہو گئی تھی۔

"میری پوزیشن مضبوط نہ تھی۔" فاخرہ نے سچائی سے کہا۔ "دوسری بیوی کو لوگ تنقیدی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خصوصاً" جب پہلی بیوی کی اولاد بھی ہو۔"

وہ چپ ہو گئیں۔ صاعقہ کو ان کے دکھ کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ اصل بات پوچھ نہ سکی۔

"وہ تو کچھ اللہ نے ہی سبب بنا دیا۔ افتخار کی موجودگی میں ہی اسے یہاں جاب مل گئی۔ افتخار نے اسے یہیں رہنے پر مجبور کیا میری اور بچوں کی وجہ سے' وہ تو کوئی کمرا کرائے پر لینا چاہتا تھا مگر۔۔۔"

"لوگ تو۔۔۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے بہانہ کیا ہے انہیں یہاں رکھنے کا۔"

"تو کیا وہ جاب نہیں کرتا۔ تم خود دیکھ رہی ہو' روز آفس جاتا ہے۔"

اور ایک دن دونوں بہن بھائی میں کوئی بحث جاری تھی۔ وہ اپنی قمیص پر امبر ایڈری کی کتاب سے خاکہ اتار رہی تھی۔ فاخرہ کی آواز آئی۔

"پاگل ہو تم۔ اتنا خرچ کر چکے ہو۔ اب بس کرو۔"

"آپا! پہلے بچوں کے لیے کچھ لے آتا تھا۔ تب بھی آپ خفا ہوتی تھیں کہ بچوں کی عادت خراب ہو رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں' آپ افتخار بھائی کی کمائی محفوظ کر لیں۔ میں جمع کر کے کیا کروں گا۔ اکیلا آدمی ہوں۔ جو کچھ ہے انہی بچوں کا ہے۔ آپ کو تو ان کے بڑے ہونے پر تعلیم کے لیے خاصا خرچ کرنا ہو گا۔ پھر صاعقہ کی شادی کرنا ہے۔ وقت پر رقم نکل آئے تو بہت آسانی ہو جاتی ہے۔"

"جانتی ہوں۔ تمہارا وقت بھی آئے گا۔ اس کے لیے کہاں سے لاؤ گے۔ جب یہاں تمام خرچ کر دو گے۔"

"میں مرد ہوں آپا! کما لوں گا' افتخار بھائی تین سال کے کنٹریکٹ پر گئے ہیں۔ وہاں سے آ کر پھر۔۔۔ آپ کے لیے مشورہ ہے۔ کوئی پالیسی لے لیں بچوں کے لیے' کام آئے گی۔"

"غرض یہ کہ تم۔۔۔ اسی طرح یہاں کے اخراجات پورے کرتے رہو گے۔"

"آپا! آپ کے سوا میرا اور ہے کون۔ میں چاہتا ہوں ان بچوں کو مضبوط مستقبل کی ضمانت ملے۔ جب تک یہاں ہوں' اس گھر کی ذمہ داری میری۔ آپ چپ رہیں' میرا فرض ہے اور مجھ پر بچوں کا قرض۔"

فاخرہ گلوگیر آواز میں کہہ رہی تھیں۔ "انور! میں بھی چاہتی ہوں اپنا حق اور فرض ادا کروں۔ تم اپنے لیے بھی کچھ سوچو' اپنا گھر بناؤ' شادی کرو' گھر بساؤ۔"

"آپا! سب کچھ ہو جائے گا اللہ کی مدد سے' کما لوں گا۔ ذرا میرے بھانجوں کو بڑا تو ہونے دیں۔ وہ میرا گھر بھی بنا دیں گے اور بسا بھی دیں گے۔"

"اے ہئے۔ کیا بڑھاپے میں شادی کرو گے؟ تا بابا۔ تُو نے دو افتخار کو' کرتی ہوں انتظام۔"

صاعقہ کو یہ الگ قسم کا مرد نظر آیا۔ بھانجوں کی فکر میں مبتلا۔ میری شادی کی بھی فکر ہے۔ کتنا عجیب ہے' سچا کھرا' بے غرض' ایثار پسند۔

اب ان خوبیوں کا ذکر پھپھو سے کیا تو وہ الٹا ناراض ہوں گی۔

میں اب وہاں جاؤں گی ہی نہیں۔

☼ ☼ ☼

اب فاخرہ نے انور کا پیچھا لے لیا۔

"تمہارے بہنوئی آنے والے ہیں۔ ان کے سامنے تمہاری شادی کر کے فرصت پاؤں' اب تم لڑکی خود پسند کرو گے۔"

"اُفوہ۔۔۔ میں کہاں جا کر پسند کروں گا۔" گویا راضی تھے جناب۔

"بھئی۔۔۔ مجھے کیا علم۔۔۔ تم کیسی بیوی چاہتے ہو۔"

"آپا! جانتی تو ہیں آپ۔۔۔ بس صفائی پسند ہو' سامان سمیٹ سمیٹ کر تھک جاتا ہوں۔"

"یوں کہو کہ سامان بکھیر کر پھر سمیٹ کر تھک جاتا ہوں۔ بیوی کا یہی کام رہ گیا ہے کہ تم بکھراؤ' وہ سمیٹے۔ یہ تو اس پر ظلم ہوگا۔ میرا خیال ہے' تمہیں وہ لڑکی سوٹ کرے گی۔ جو خود آکر کہے۔ میں انور سے شادی کرلیتی ہوں۔"

"آپا۔۔۔" احتجاجاً" زور سے بولے۔ "کرلیتی ہوں سے کیا مراد ہے۔ کوئی مجبوری ہے؟"

"ہو سکتا ہے۔ اس کی ہی مجبوری ہو۔"

فاخرہ ہنس دیں۔ بچے ہوم ورک کر رہے تھے۔ وہ بھی ہنس پڑے۔ کچھ سمجھے بغیر۔

وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ گھر پر بچے ہوتے تو صاعقہ کا ہاتھ بٹادیتے۔ ماموں کو دیکھ کر وہ بھی اپنے کام کرنے لگے تھے۔ پھپھو آجاتیں۔ اس سے کہتیں۔

"لڑکی! تم تھکتی نہیں ہو۔ کوئی کام فاخرہ کو بھی کرنے دیا کرو۔"

فاخرہ سٹپٹا جاتیں۔ "آپا! میں تو چاہتی ہوں' مگر یہ روک دیتی ہے۔"

"پھپھو! اماں کو بہت کام ہیں۔ بچوں کی تربیت' ان کی دیکھ بھال۔" کہہ کر سامنے سے ٹل جاتی۔

ماموں ایک بار آئے تھے۔ اس کا سامان لے کر۔ رکے نہیں' کیونکہ انہیں خالہ جان کے پاس جانا تھا۔ اقرا' اقصیٰ کے رشتے آئے ہوئے تھے۔ ان کے مشورے کے لیے۔



ابا آگئے۔ گھر میں جشن کا سماں ہوگیا۔ خالہ جان بھی آئیں ابا سے ملنے' علی حسن کے ساتھ اقرا' اقصیٰ کی شادی کا بلاوا دے کر گئیں اور ساتھ ہی صاعقہ کو بہو بنانے کا عندیہ بھی دیا۔ ابا سوچ میں پڑ گئے۔

پھپھو نے سنا۔ وہ بھی آگئیں۔ خوب خفا ہوئیں۔ یہ سن کر کہ ابا کو علی حسن بطور داماد پسند آگئے تھے۔

"افتخار۔۔۔ واہ بھئی۔۔۔ تم بھی خوب ہو۔۔۔ سالی کا بیٹا پسند آگیا بھانجا نظر نہیں آیا۔"

ابا حیران۔۔۔ "آپا! آپ نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔"

"وہ تو ہمیشہ صاعقہ پر اعتراض ہی کرتی رہتی تھیں۔ ان سے شکایتیں کرتی تھیں اور ان کو منع کرتی تھیں کہ صاعقہ کی ہر ضد پوری نہ کیا کرو۔"

"تو اب کہہ رہی ہوں' دیکھو اپنے بھانجے پر بیوی کے بھانجے کو فوقیت نہ دینا۔ جلدی جواب دو' ہم کب آویں جواب لینے۔"

"میں ذرا۔۔۔" ابا کسمسائے۔ "صاعقہ سے بھی۔۔۔"

"الٹی کھوپڑی ہے تمہاری۔ ارے۔۔۔ اسے تو وہ خالہ کا بچہ ہی پسند آئے گا۔ مگر میں وہاں ہونے نہیں دوں گی۔ لو اور سنو' صبیحہ کے میاں کو جانتے نہیں ہو۔ دنیا بھر کا بدمعاش۔ کیا پتا بیٹے میں بھی اس خون کے اثرات ہوں۔ بلکہ ضرور ہوں گے۔"

"آپا پلیز۔۔۔ ہم کسی کے بارے میں اس طرح یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ آپ ذرا انتظار کریں۔"

"مگر کہے دیتی ہوں۔ اگر میرے ارشد کو انکار کیا تو وہاں بھی نہیں ہونے دوں گی۔ یاد رکھنا! بارات کے دن سب مہمانوں کے سامنے بڑے میاں کے پول کھول دوں گی۔"

پھپھو چلی گئیں۔ صاعقہ کو بلا کر فاخرہ نے بات کی۔ سوچنے کے لیے وقت بھی دیا۔ وہ اچھل پڑی۔

پھپھو؟ اور ان کا وہ چشماٹو' شکی مزاج' چھوٹے قد کا چھوٹا آدمی۔ جسے صاعقہ میں خرابیاں ہی نظر آتی ہیں۔

علی حسن بہترین انسان' خالہ جان محبت سے گندھی ہوئی' گھر۔۔۔ محل' جیسا' دولت کی ریل پیل' نوکروں کی قطار' عیش' آرام اور محبت ہی محبت مگر خالو جان؟

خالہ جان کو اس نے خود فون کیا۔ اطمینان دلا رہی تھیں۔

"علی حسن بہت شریف النفس نوجوان ہے۔ باپ سے اسی لیے ناراض رہتا ہے' تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

وہ جانتی تھی۔ اسے تکلیف ہوگی۔ خالو جان کا سامنا کرنا اذیت کا سبب بن سکتا تھا۔ اب اسے جواب دینا ہے۔ پھپھو کل جواب لینے آئیں گی۔

خالہ جان بھی کل فون پر بات کریں گی۔

شریف النفس انسان کے خون میں کبھی بھی باپ کے خونی اثرات جوش کھا سکتے ہیں۔

پھپھو صرف اس پر اعتراض' ان کا بیٹا عیب جوئی کا ماہر' خود پسند۔

علی حسن بہترین انسان' قدردان' اب خالو جان کیا کریں گے۔ ان سے کسی نے پوچھا بھی ہے یا نہیں۔۔۔ وہ اب کیا سوچتے ہوں گے۔ کیا کریں گے سب سن کر۔

"اوہ۔۔۔ اب جو کرنا ہے مجھے ہی کرنا ہے۔"

ابا فکرمند تھے۔ ایک طرف بہن' دوسری طرف محبت کرنے والی سالی' مقابلہ سخت تھا۔

صاعقہ دھلے ہوئے کپڑوں کی تہ لگا رہی تھی۔ عنیقہ کی جرسی ابھی گیلی تھی۔ اسے مزید دھوپ کی ضرورت تھی۔ گھبراہٹ میں اسے لیے وہ فاخرہ کے کمرے میں آگئی۔ غور نہیں کیا کہ وہاں اور کوئی بیٹھا ہے۔ دل دھڑ دھڑ کر کے نکلنے والا تھا۔

"ابا سے کہہ دیں اماں!" گلا اتنے میں ہی سوکھ چکا تھا۔ "نہ چشماٹو ارشد' نہ ہی علی حسن بھائی' میں انور ماموں سے شادی کرلوں گی۔"

فاخرہ کا قہقہہ اور ساتھ ہی پیٹھ موڑے بیٹھے ہوئے انور نے کھڑے ہو کر سر پر ہاتھ مارا۔ ساتھ ہی "آپا" کا احتجاجی نعرہ' وہ سٹپٹائی۔

"کیا میں بہت موٹی ہوں۔ سارے کام سیکھ لیے ہیں میں نے اب تو۔۔۔ باقی اماں سکھادیں گی۔ ان کے پاس رہوں گی تو۔" سراسیمگی طاری تھی۔

"آپا! خدا کا واسطہ۔" انور بھنچی ہوئی آواز میں بولا تھا۔ "اور کچھ نہیں' انہیں صرف شرم کرنا سکھا دیں۔"

بھیگی ہوئی عنیقہ کی جرسی انور کے منہ پر مار کر وہاں سے بھاگی تو اندر آتے ہوئے ابا سے ٹکرا گئی۔ شدید قسم کی مسکراہٹ سے چہرہ مزین تھا۔ یہاں سے وہاں تک باچھیں چری ہوئی۔ بیٹی کے کارنامے پر داد دیتی مسکراہٹ۔

"انور میاں! میری بیٹی کچھ سیکھے یا نہ سیکھے۔ اسے شرم آئے یا نہ آئے۔ صحیح فیصلہ کرنا آگیا ہے۔ پہلے وہ جس سے قطعی ناواقف تھی اور ہمیشہ کی طرح اس کے فیصلے پر عمل بھی کرلیتا ہوں' فوری عمل۔"

فاخرہ اور ابا کی کھلکھلاہٹ کے ساتھ انور کی شرمندہ ہنسی۔

صاعقہ دانتوں میں زبان دبا کر بھاگی تو کمرے میں جا کر منہ چھپا کر بیٹھ گئی۔

سائرہ رضا



"مجھے یقین ہے یار۔ یہ حسب معمول بہت عمدہ اور معیاری تحریر ہوگی مگر تم نے تو پہلے ہی ہولا دیا یہ کہہ کر ٹریجڈی ہے۔ ٹریجک اسٹوری پڑھ کر قارئین کے شکوے بھرے فون اور خطوط کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں اسے دیکھ لوں گی۔ لگا بھی دوں گی مگر تم یہ دیکھو صرف تنقید آئے گی۔ کہانی کی کردار نگاری، بنت، منظر نگاری، برجستگی، سب دھری کی دھری رہ جائے گی اور دیکھو نا، پہلے ہی اتنے دکھ ہیں

ناولٹ



ہماری زندگیوں میں۔ چند پل بے فکری کے گزارنے کے لیے ڈائجسٹ کھولیں تو وہاں بھی دکھ۔۔۔ نہیں، نہیں۔" مدیرہ نے بڑی وضاحت سے قارئین کا مزاج اسے بتایا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر دکھ زندگی کا بہت بڑا حصہ ہیں، حقیقت ہیں، اس سے انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ سکھ، دکھ ساتھ چلتے ہیں۔ بلکہ غم اور خوشی جڑواں بہن بھائی کی طرح ایک ساتھ جنم لیتے ہیں مگر ساری زندگی اکٹھے نہیں ہوتے، ایک دوسرے کا پیچھا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر وقتی طور پر حاوی تو ہو جاتے ہیں، مگر حاکمیت برقرار نہیں رکھ پاتے۔ ہم دکھ سے انکار نہیں کر سکتے۔" وہ شاید حقیقت سے آگاہ کر رہی تھی۔

"تو کون کر رہا ہے انکار، مگر تم یہ بھی تو دیکھو، ہماری اپنی زندگیوں میں اردگرد اتنے دکھ، اتنے آنسو ہیں، اتنی تلخ سچائیاں کہ حلق کڑوا ہو جائے۔ قارئین کہتے ہیں۔ خدارا آپ تو ایسی روتی کرلاتی کہانیاں مت چھاپا کریں۔ آپ بس ہنسایا کریں۔ خوش کیا کریں۔ ایسی کہانی دیا کریں کہ دنوں دل و دماغ خوشی کے احساس سے جھومتے رہیں۔ میرے پاس اتنی عجیب و غریب فرمائشیں آتی ہیں کہ تم کبھی فرصت سے آکر پڑھو تو دنگ رہ جاؤ۔ رائٹر پوری تفہیم کے ساتھ کہانی بڑھاتا ہے۔ ادھر قاری کو ذرا سا بھی خدشہ ہو تو رو رو کے بے حال ہو جاتی ہیں۔ خدا کے لیے فلاں کے ساتھ کچھ برا نہ کیجیے گا اور فلاں کی شادی فلاں ہی سے کروائیے۔ پلیز اس کو اس سے جدا مت کرنا۔ سالوں اس کے غم

میں بے حال رہتی ہیں۔" ایڈیٹر صاحبہ اپنے جملے کے اختتام پر ہنس دیں۔

رائٹر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی کرن چمکی۔

"آپ صحیح کہتی ہیں... مگر لکھنے والا تو زندگی کے ہر پہلو کو دکھاتا ہے' خوشی' غم' جھوٹ... دنیا میں یوں بھی ہوتا ہے' قاری کو معلوم ہونا چاہیے نا۔" ایڈیٹر کی حقیقت بیانی کے آگے اس کا ذخیرۂ الفاظ کم ہوگیا تھا۔

"جس "یوں" کا ذکر تم کررہی ہونا' اس کا انہیں بخوبی علم ہے۔ انہیں اسی سے تو فرار چاہیے۔ فینٹسی... یوٹوپیا... خوابوں کا شہزادہ' گھوڑے پر سوار مہاراجہ اور اچانک دن بدل جائیں۔ میں تمہیں بتاؤں..." ایڈیٹر کچھ یاد آنے پر کرسی کے اگلے پیروں پر جھک آئیں' کہنیاں میز سے ٹکا کر... وہ ہمہ تن گوش ہوگئی۔

"فرحت اشتیاق کا ہی ناول دیکھ لو۔ عالی کو مرنا ہی تھا۔ عالی نہ مرتا تو ہنیا کی بے غرض محبت اور خلوص ظاہر ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ کہانی کا تقاضا تھا۔ مجھے ماننا پڑا اور فرحت کا تو پتا نہیں' میرا حشر ہوگیا قارئین کے آنسو پونچھ پونچھ کر' وضاحتیں دے دے کر... اب تک خط آتے ہیں۔ قارئین باقاعدہ مشورہ دیتی ہیں۔ عالی کو زندہ کردیں۔ اصل زندگی میں چاہے کتنے ہی ظلم کے پہاڑ کسی بے بس غریب پر توڑ رہے ہوں۔ کہانی میں انصاف ہونا چاہیے۔ ہماری قارئین تو بہت شدید محبت کرتی ہیں ان خیالی پیکروں سے اور پھر تمہیں تو پتا ہے لڑکیوں کے دل کتنے نرم ہوتے ہیں۔" ایڈیٹر اب بول بول کر تھک گئی تھیں۔

"مگر آپ پڑھے بغیر ریجیکٹ مت کریں۔ ایک بار پڑھ لیں۔" وہ مایوس سی ہوئی۔

"کمرشل ازم کا زمانہ ہے یار... ہر چیز بکتی ہے۔ ٹی وی چینلز پر دیکھ رہی ہو' وہی ساس' بہو کی چپقلش' دو بہنوں کا حسد' وہی رومانس... اور قارئین دکھ بھی برداشت کرلیتی ہیں اگر آخر میں سکھ مل جائے' وہ سب ہیپی اینڈ چاہتی ہیں۔ بے شک سارے زمانے کے دکھ اور مشکلیں دے دیں' انجام اچھا رکھیں اور قاری پر سارا الزام کیا دھرنا ہم سب بھی تو خوشگوار ... کاملیت کو پسند کرتے ہیں۔"

"آپ پڑھ کر تو دیکھیں۔"

"تم دل چھوٹا نہ کرو' میں اسے ضرور دیکھوں گی' تمہارے قلم کے ہنر پر یقین پکا ہے مگر... میری مجبوری سمجھو۔ اچھا' اچھا! تم فکر نہ کرو' میں اسے پڑھ لوں گی۔"

اس کے اترے چہرے کو دیکھ ایڈیٹر نے تسلی دی' وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

* * *

نہ ساس کوسنے کو زندہ تھیں' نہ نندیں ٹوکنے پر کمربستہ۔ شوہر اللہ کی رضا میں راضی بہ رضا رہتے ہوئے خاموش رہے مگر دکھ دل میں انی کی طرح گڑ گیا تھا اور ہر جنبش پر ایسی ٹیسیں اٹھتی تھیں کہ الاماں۔

کسی اور نے آکر کیا سوال اٹھانا تھا۔ طعنے دینے تھے' دل جلانا تھا' ترحم جتانا تھا۔ جب وہ خود ہی بن پانی مچھلی کی طرح تڑپی جارہی تھی۔ اس کی حالت دگرگوں تھی۔ اسے کروٹ بدلنے کے لیے بھی سہارے کی ضرورت تھی مگر ایک جنون جسم میں بجلی بن کر دوڑتا تو اور وہ اچھل اچھل جاتی تھی۔

اس نے گال پیٹ پیٹ کر دہکا لیے تھے' وہ اپنے پیٹ پر گھونسے مارتی تھی اور رانوں پر دوہتڑ۔ اس نے پیٹ کے پاس سے اپنی قمیص پھاڑ ڈالی تھی۔

تمام دعاؤں' ٹونوں' ٹوٹکوں' تعویذوں اور فقیروں کے باوجود اس نے چھٹی بیٹی کو جنم دیا تھا۔

اس کی چار بیٹیاں سب سے بڑی بیٹی کے ساتھ باورچی خانے میں چھپی بیٹھی تھیں۔ وہ شور ہنگامہ سن کر کمرے کے دروازے تک آئیں تو ماں نے جو ہاتھ لگا ان کی جانب پھینک دیا تھا۔ جوتی' گلاس' ٹوکری' تکیہ... بڑی سمجھ دار تھی' وہ بہنوں کو پچکارتی لے گئی۔

اور وہ چھٹی نوزائیدہ بچی... دوسرے پلنگ پر کمبل میں لپٹی بے حس و حرکت پڑی۔

بڑی آپا جی صبح ہی سے سفر پر نکلی تھیں کہ وقت پر پہنچ جائیں مگر ریڑھے گڈے کی سواری... وہ ڈلیوری کے بعد اس وقت گھر میں داخل ہوئیں جب نفیسہ سیاپا ڈال کر بیٹھی تھی۔

وہ تاسف سے اسے دیکھتی رہیں۔ جس کے بین شدت سے ہونے لگے تھے۔ محلے پڑوس کی عورتیں بس نفیسہ کو تکتی تھیں۔

آپا جی نے کمبل میں لپٹے وجود کو اٹھا کر سینے سے لگایا تو بہت ضبط کے باوجود دو قطرے کمبل کے ریشوں میں گم ہوگئے۔

"آنے والی ننھی جان کا بھلا کیا قصور؟"

کمبل سرکا کر بہت اشتیاق سے دیکھا۔ حسب توقع ننھی پری خوب صورتی میں پچھلی پانچ سے بڑھ کر تھی۔ وہ سختی سے بھینچی آنکھیں... چھوٹی سی ناک تازہ دھنکی روئی کے ریشے جیسی' نرم بے وزن پھولی پھولی چاندی جیسی۔ اس کے لرزتے عنابی ہونٹ... انہوں نے اپنے ہونٹوں کی گرمائش اس کی پیشانی سے چپکا دی۔ وہ کانپ رہی تھی اور ٹھنڈی برف تھی۔ آپا جی نے اسے اپنے سینے میں سمولیا۔

"کیسے لاوارثوں کی طرح خود سے دور پھینک رکھا ہے۔ تیرے جگر کا ٹکڑا کملی... اور تو..."

"ہائے!" نفیسہ نے گردن ڈھلکا دی۔ "اتنی سی میری جان۔ (وہ دبلی پتلی تھی اور اس وقت ہڈیوں کا پنجر دکھائی دیتی تھی۔) اندر جگر بھی اتنا سا ہی ہوگا اور اس کے پورے چھ ٹکڑے... اب میرے اندر جگر کہاں رہا آپا جی! جل کے راکھ ہوگیا۔"

"ایسے نہیں کہتے نمانی... نبی کا سلام آیا... اللہ کی رحمت اور تو..."

"ہائے سارے مجھے ہی حدیثیں سنانے آتے ہیں۔" وہ سر دائیں' بائیں پٹخنے لگی۔ "مینہ رحمت ہے نا آپا جی! پر حد سے زیادہ پڑ جائے تو سیلاب بن جاتا ہے بنے (بند) ٹوٹ جاتے ہیں۔ درخت کی جڑیں مٹی چھوڑ دیتی ہیں۔ سب تہس نہس' سیلاب ہر شے کو بہا لے جاتا ہے۔ میں تو پھر کمزور ذات... پندرہ سالوں سے ڈوبے کھا رہی ہوں۔ مرتی بھی نہیں' ہائے اوربا!" وہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھی۔ بس شکوے کرتی' بین ڈالتی' کوسے جاتی اور خود کو پیٹتی۔ بچے بند کرنے کا سان و گمان بھی نہیں تھا' تو علاج کیسا۔ لہٰذا بچے ہر سال آتے اور آنے ہی تھے۔ بتیس برس کی نفیسہ کی جوانی کے ابھی کئی سال باقی تھے۔

"چل اللہ دے گا۔ آزماتا ہے بندے کو۔ اس کے ہاں دیر ہے' اندھیر نہیں تو دل بڑا رکھ لے۔ کاکی کو گود میں ڈال کر بسم اللہ..."

نفیسہ' آپا جی کو انکار نہیں کرسکتی تھی۔

"بسم اللہ نہ بولیں آپا جی۔ کہیں الحمد اللہ... تے بس... ہائے... اگر اگر فیر کڑی ہوگئی؟"

"اچھا... بس' بس۔" آپا جی بھی دہل گئی تھیں۔ "تو پکڑ اسے۔"



اور اسی نفیسہ کے گھر وہ ساتویں بیٹی بن کر اتری اور اس بار نفیسہ کو سکتہ ہوگیا تھا۔ پھر بے حسی کی چادر اوڑھ کر وہ سب سے منہ موڑ بیٹھی۔ سب سے بڑی سولہ برس کی سلمٰی توے پر روٹی ڈالنے کے قابل ہوچکی تھی۔ باقی پانچ بھی اپنی بساط برابر گھر سنبھالتیں مگر بے نام بچی کو صرف ماں کی طلب تھی اور اس کی ضروریات ماں ہی پوری کرسکتی تھی۔

"سارے گوڈے گئے ان جونکوں کو دودھ پلا پلا رہ گئے۔ میں تو ہل بھی نہیں پاتی' دودھ کہاں سے اترے۔"

نفیسہ جبلی تقاضوں سے مجبور اسے سینے سے چپکا ہی لیتی' تب بھی بچی کو سیری حاصل نہ ہوپاتی۔ وہ بھوک کے مارے بلک جاتی۔

بڑی بہنیں چمچے سے قطرے ٹپکاتیں۔

تین ماہ تک بے نام رہنے کے بعد آپا جی ہی نے اسے نام دیا۔ "رضیہ" اور ساتھ سخت تنبیہہ کی۔ "میں نہ دیکھوں اسے گندے سندے حالوں میں... آج تیری محتاجی سے ننگی گندی پڑی ہے۔ منہ پر مکھیاں اور بدبودار پوتڑے... تیری مامتا کے بھروسے پر رب سوہنے نے انسان بنا کر اتارا اسے' اگر ایسے جانوروں

والا حال ہی دینا ہوتا تو کتا بلا بنا کر نہ بھیج دیتے۔ بلی تک چاٹ چاٹ کر صاف کر لیتی ہے تو ان پلیٹوں سے بھی گئی گزری نکلی۔ چل دھو دھا کر لا اسے۔"

پھر خود ہی اٹھیں بچی کی مالش صفائی ستھرائی کے بعد خوب پاؤڈر لگا کر جب آنکھوں میں سرمے کے ڈورے کھینچے تو کمال ہو گیا۔ اتنی سوہنی ملائم پری جیسی اس کی چھ کی چھ بیٹیاں خوب صورتی میں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں مگر اس رضیہ نے تو......

اس کے دماغ میں جو مرضی چلتا اور زبان سے نکلتا تھی تو وہ ایک ماں ہی... لگا لیا سینے سے مگر... جو ناپسندیدگی اس کی آمد سے پہلے تھی بلکہ اس کے آجانے کے خدشات سے بھی پہلے کی تھی وہ ظاہر ہوتی رہتی۔

"نی رضیہ... اے رجیہ... رجو۔"

"نی رجو اسی رج گئے آں۔ ساڈا دل رج گیا نی رجو!"

"اسی نکو نک رج گئے۔"

اور بچی ماں کے مخاطب ہونے پر قلقاریاں مارتی ماں اسے لاڈ کر رہی تھی بہلا رہی تھی اور وہ بہل رہی تھی۔

مگر زندگی اتنی آسانی سے بہلائی نہیں جا سکتی۔

زندگی دو روپے والی بچہ کہانی نہیں ہوتی جس میں مملکت خداداد کا بادشاہ اپنی سات بیٹیوں کے ہمراہ بڑی رحم دلی اور خوشی سے حکومت کرتا ہے اور راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

دور دراز میں ایک بادشاہ کی سات بیٹیاں تھیں خود سے اپنی بیٹیوں کا پیار ناپنے کو بادشاہ نے پوچھا۔

"میں تمہاری زندگی میں کتنا اہم ہوں۔ مثال دو۔"

ایک نے کہا "آپ ہوا جیسے ہیں۔"

دوسری نے کہا "آپ پانی کی طرح ضروری۔"

تیسری نے کہا "آپ روشنی ہیں۔"

چوتھی نے کہا "آپ میٹھا رس گلا ہیں۔"

"اور آپ... اور آپ"

ساتویں نے کہا۔ "آپ میری زندگی میں نمک کی طرح اہم ہیں۔"

بادشاہ کو یہ مثال بہت ہلکی لگی۔ اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی اور اس نے شہزادی کو تنہا جنگل میں چھوڑ دیا۔

مگر رضیہ نے تو ابھی بولنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ اسے تو ابھی رس گلے اور نمک کے فرق اور اہمیت کی بھی خبر نہیں تھی۔ مگر... اسے ملک بدر کر دیا گیا۔

نفیسہ اور اسحاق خالہ زاد تھے اور شاہین تیسری خالہ کی بے اولاد بیٹی... نفیسہ آٹھویں بار ماں بن رہی تھی۔

شاہین نے منہ سے تو کچھ نہ کہا تھا مگر اس نے نفیسہ اور اسحاق کو اشارہ کر دیا تھا کہ اگر... خدانخواستہ... بیٹی ہوئی تو اسے دے دی جائے بظاہر سب کے ساتھ بیٹے کے لیے دعا گو تھی مگر اس کا دل...

پر اس بار نفیسہ کی جیت ہو گئی اس نے بیٹے کو جنم دے دیا تھا۔

"ہائے میں مری..." شاہین تو رائی۔ وہ تو پوری بچہ ٹوکری سجا کر لائی تھی۔ اسحاق کے گھر ہر بار زچگی کے روز بین ہی پڑے تھے۔ مگر اس بار شاہین پچھاڑیں کھا رہی تھی۔

"میں اپنی بہن بھائی کی خوشی میں خوش ہوں یقین کریں آپ سب لوگ مر رو تو اپنے لیے رہی ہوں۔" اس نے حاضرین کو مخاطب کیا۔ "میری قسمت ہی خراب ہے۔ پہلے مقصود نہ مانا۔ پھر شرط لگا دی منڈا ہی لینا اب بتاؤ کوئی منڈے دیتا ہے۔ پھر ساس نے سیاپا ڈال دیا۔ سسرالیوں ہی سے لینا۔ جائیداد جو اسے ملے گی۔ دیور مانا تو... بچہ مردہ ہوا۔ نند عین ٹائم پہ مکر گئی۔ ہائے ربا ہائے... ہائے۔" وہ سر پر زور زور سے ہاتھ مار رہی تھی۔

نفیسہ خوش تھی... اسحاق خوش تھا۔ بہنیں خوش... محلہ پڑوس سب نہال ایسے میں شاہین کا دکھ...

شاہین خوب ٹھنڈی لے کر سسرال آئی تھی۔ چھوڑی نہیں جا سکتی تھی۔ شادی کی اجازت اس نے

دی نہیں تھی۔۔۔نہ دینے کا ارادہ تھا۔

آپا جی نفیسہ کی خوشی میں خوش تھیں۔ باہر ڈھول پیٹنے کی آوازیں تھیں، کھسروں کی بدھائیاں اور تالی کی آواز۔۔۔ شاہین کے رونے پر حاوی ہو گئی۔

"اللہ یہ ہی چاہتا ہے میں خالی گودی رہوں۔" وہ چادر سر پر جمائو کری اٹھائے شکستہ قدموں سے واپسی کو تیار تھی۔

"آج مرادیں پوری ہونے کا دن ہے کملی!" نفیسہ کے اندر جیسے کسی عالم دین کی روح حلول کر گئی۔ وہ صبر، شکر، تحمل، برداشت پر خطبہ دینے لگی۔

نفیسہ اور اسحاق نے بس آنکھوں آنکھوں میں ہی فیصلہ کیا تھا اور ماں کی رضائی میں گھسی تیرہ ماہ کی رضیہ کا ہاتھ شاہین کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

نفیسہ نے صرف خطاب نہیں کیا تھا ایثار و قربانی کا عملی مظاہرہ بھی کر ڈالا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے اپنے سسرال والوں اور دنیا کی چلتی زبانوں کے آگے بند باندھ دیا تھا۔

اگر شاہین ایسا سوچتی تھی تو یہ یقیناً" اس کی خام خیالی تھی۔ بچہ اپنا ہی ہوتا ہے۔ پھپھیاں چاچے کیسے نئی بھتیجی کو لاڈ کرتے۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کی طرف دیکھنے کو بھی دل نہیں کرتا تھا۔

یہی حال دادا، دادی کا تھا۔ وہ کیسے اپنے دل میں اس کے لیے پیار پیدا کر سکتے تھے۔

رضیہ شاہین کی زندگی میں تبدیلی بن کر آئی۔ وہ اسے سجا بنا کر رکھتی۔ نوالے منہ میں دیتی اور اپنی آغوش میں سلاتی۔

رضیہ اتنی چھوٹی تھی کہ اسے رویوں کی جانچ ہی نہیں تھی۔ اس کی تمام ابتدائی ضروریات بہ حسن و خوبی پوری ہو رہی تھیں اور کیا چاہیے۔ لیکن ہوش سنبھالنے پر اس نے محسوس کیا۔

وہ صرف شاہین کی زندگی کا حصہ تھی اور شاہین نے اپنی ممتا کی تسکین کے لیے بچی گود لے لی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ وہ ایک ایسا ہتھیار بن کر اس کے ہاتھوں میں رہ گئی جس کا نشانہ ہمہ وقت اس کے سسرال والے ہوتے۔

وہ اسے سجا بنا کر رکھتی، پیروں میں سونے کی ونگی جھانجھر۔۔۔ کانوں میں بالے، جن کے وزن کو سہارنے کے لیے سرخ ڈوری کان کے اوپر چڑھی رہتی۔ موٹے کڑے، گلے میں گانی، مانگ نکال کر ماتھے کے عین سامنے دائیں بائیں چاندی کی دوھنس۔

وہ اپنی نند کو جلاتی، جس نے عین ٹائم پر بیٹی دینے سے منع کر دیا تھا۔

"تیری بیٹی کو بھی ایسے ہی شہزادیوں کی طرح رکھتی۔"

شاہین کے سسرال والوں، محلّے والوں اور ملازمین کی مہربانی سے رضیہ بہت پہلے واقف ہو گئی کہ وہ شاہین کی لے پالک بیٹی ہے مگر اس انکشاف نے اس کی زندگی کو تہہ و بالا نہیں کیا۔ وہ اتنی چھوٹی نا سمجھ تھی کہ کسی گہرائی میں نہ ڈوبی۔ شاہین اس سے بے حد پیار کرتی تھی۔

اپنی ہم جماعتوں میں اس کا درجہ اول تھا۔ گاؤں کی امیر غریب سب عورتیں اس کے زیور اور کپڑے چھو چھو حسرت سے دیکھتی تھیں۔ باپ کی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ جب کبھی وہ عمیق نگاہی سے ارد گرد کا جائزہ لیتی۔ مقصود نے کبھی اس سے منہ دیکھے کا بھی لاڈ نہیں کیا تھا۔ بے اولادی کا طعنہ شاہین کے لیے زندگی موت کا مسئلہ تھا مگر اس نے یہ مصیبت نہیں پالی۔ شاہین مقصود کے ابا کے دوست کی اکلوتی بیٹی تھی اور تمام زمین جائیداد اسی کے نام تھی۔

شاہین کا کھونٹا اس جانب سے مضبوط تھا۔ جب ہی ساس نندیں اپنے ہزاروں جتن کے باوجود بھی دوسری نہیں لا سکیں۔ جبکہ خرابی شاہین میں ہی تھی۔ مگر مقصود کے لیے دوسری کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ دوسری کے لیے دوسرے راستے تھے۔

بلکہ دوسری کیا۔۔۔ تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی۔۔۔ جائز کریں تو چار کی حد بندی ہے، ناجائز تو پھر۔۔۔

وہ تلے والے کھسے اور کڑک کپڑے پہن کر مونچھوں کو تاؤ دیتا دوستوں کے جلو میں سب سے آگے سینہ تان کر چلتا اور دوست سب مطلبی، اسے شاہین کی طرف سے فکر نہیں تھی۔ وہ اپنی آل اولاد لے کر چابیوں کا گچھا سنبھالے بڑی بے فکر تھی۔

پہلے ساس نندوں کے طعنوں پر اس سے لڑتی تھی۔ "میرا کیا قصور، خرابی مجھ میں نکلی، تم میں بھی تو نکل سکتی تھی۔ پر میں تو نہ چھوڑ کر جاتی، یا دوسرا تمہارے سر پر بٹھا لیتی، پھر تم کیسے سوکن لا سکتے ہو؟ اچھا چلو لے آؤ، پر مجھے پکا کاغذ دو۔"

اور پکا کاغذ۔۔۔ مطلب عرش سے فرش۔

"میں شاہین سے بہت محبت کرتا ہوں اور دوسری لا کر اسے دکھ نہیں دے سکتا، اس لیے آپ سب ہمیں ایسے ہی رہنے دیں ہم خوش ہیں۔"

نندیں اور ساس حق دق۔۔۔ مگر باپ، بھائی، پہچان گئے۔ چت بھی میری اور پٹ بھی۔ رضیہ کی آمد نے شاہین کو بے فکری دی تو اس کا عکس مقصود کی زندگی میں بھی جھلک مارنے لگا۔ وہ شاہین سے زیادہ بے فکر ہوا اور کھل کر کھیلنے لگا مگر اسی بے فکری کی کوکھ سے بے احتیاطی کا جنم ہوا۔

اور ہیرا منڈی کی ساحرہ زمرد جو اس کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔ بھاری پیر کے ساتھ گلے کی ہڈی بن گئی۔ اگل دیتا تو زمرد کے ہوتے سوتے اسے کہیں کا نہ چھوڑتے اور نگلنے کی صورت میں۔۔۔

لیکن اس نے نگلنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بے اولادی کے لیے شاہین جیسی ہڑبونگ کبھی نہ مچائی تھی۔ مگر جب زمرد نے پلّو مروڑتے ہوئے ہونٹ داب کے لجاتے ہوئے کہا۔

"مقصود! آپ باپ بننے والے ہیں۔" وہ چاروں شانے چت ہوا تھا۔

مشکل تب ہوئی جب اس نے کوٹھی میں عزت شان و مرتبہ کے ساتھ جانے کی خواہش کی۔

"اوئے ربا!" کوٹھی شاہین کے باپ نے جہیز میں دی تھی اور ملکیت بھی۔ کن کن حیلوں، بہانوں، وعدوں، اشاروں سے اسے شہر میں رہنے پر آمادہ کیا تھا۔ یہ الگ داستان تھی۔

راوی چین لکھ رہا تھا مگر چار بیٹیوں کی آمد۔۔۔ اور شہر والے گھر میں زمرد کے میکے والوں کا تانتا۔

سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا تو کبھی ان سب کے ہمراہ شاہین کے روبرو نہ ہوتا، مگر وہ شدید ابال کے عالم میں زمرد کے ساتھ چار عدد بیٹیاں لیے حاضر تھا۔

"ایک طوائف! ہائے۔

اتنے سال کا دھوکا۔۔۔ اوئی۔

صاحب اولاد۔۔۔ چار، چار بیٹیاں۔۔۔"

شاہین نے سر پر مٹھیاں بھر بھر خاک ڈالی مگر سارے سسرال والے دل ہی دل میں چھپائے بیٹیوں کا سر ڈھانپنے کو تیار تھے۔ شاہین کے سامنے تو سب نے اس کے احسن اقدام اور صاحب اولاد کو سراہا مگر۔۔۔

"ہائے تیرا بیڑہ غرق ہوئے مقصود! ہائے جب ہم کہتے تھے تب نہ کی۔ ایک سے ایک اعلا خاندان کی ملتی تھیں۔"

"میری نندیں۔۔۔" بہن نے سر پیٹا۔

"میری بہنیں بھانجیاں۔۔۔" بھابھی نے کوسا۔

"اور تجھ گھنے میسنے نے اتنے سال چھپا کر رکھا۔"

"اور اگلی نے پیدا بھی کیں کڑیاں۔"

شاہین کو چپ لگ گئی تھی شور مچانے، رونے پیٹنے، بددعاؤں، کوسنوں کے بعد۔۔۔ زمرد اور اس کی بیٹیوں کے لیے دروازے الگ تھے۔ دیواریں اٹھی ہوئی تھیں مگر۔۔۔

"یہ پچھل پیری سیدھے رستے سے ویاہ کرنے دیتی تو کیوں میرا پتر ادھر ادھر گند میں منہ مارتا۔"

"ہائے ہماری نسل خراب ہو گئی۔"

"چار چار بیٹیاں۔۔۔ کون ویاہے گا ان کو۔۔۔ بھلے نام کے آگے چوہدری مقصود لگا ہو گا مگر ماں طوائف ہو تو دنیا والے روز حشر ادھر ہی بنا دیتے ہیں۔ ہائے تو مر جائے شاہین۔۔۔ تیری قبر سڑے، جل کر مرے۔۔۔ ہائے۔"

ماں بہنیں کسی حد تک درست تھیں۔
اولاد کی خاطر اگر مقصود شادی کرلیتا تو کیا مضائقہ ہوتا۔ شاہین کی بڑائی مانی جاتی۔ وہ ہی بڑی رہتی مقصود دنیا کا مجرم، آخرت کا مجرم۔ بیٹیوں سے بھی نگاہیں چراتا۔
"اب ہم کریں گے تیری شادی۔ یہ طوائفیں تو چلّے کاٹتی ہیں، وظیفے کرتی ہیں، بیٹی پیدا کرنے کے لیے۔ یہ چار بھی اسی کلموہی کا کیا دھرا ہے۔"
مقصود نے جیسے بچے کی طرح سر جھکا دیا۔
نند کی اپنی نند سے بھی نہ بنی تھی۔ وہ اس پر ہمیشہ حاوی رہی۔ اس کی بیوہ بیٹی لا کر وہ اس پر احسان رکھ سکتی ہے۔ ہاتھ اوپر۔۔۔ پیر شہہ رگ پر۔۔۔
دیورانی کے پاس بھانجیوں کی قطار تھی۔ مگر ساس کے عزائم کچھ اور تھے۔ شاہین کی دفعہ مقصود کے ابا نے دوست کے ساتھ بالا ہی بالا رشتہ طے کردیا تھا۔ وہ صرف بیاہنے گئی تھی۔ زمرد کو مقصود نے خود ہی ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ اس بار پورے چاؤ سے بہو تلاش کررہی تھی۔
گھر گھر جاتی، منہ بنا کر بیٹھتی۔ شاہین کی برائیاں، مقصود کا بھولپن۔ زمرد جیسی نے پھنس لیا، ہائے میرا بھولا بچہ!
جائیداد کی تفصیل۔۔۔ وارث کی طلب۔۔۔ سارا الزام شاہین کے سر۔ ساس کا جوش و خروش ایسا تھا۔ جیسے اپنے اکلوتے کنوارے بیٹے کا رشتہ ڈھونڈنے کے لیے ماں پہلی بار نکلتی ہے۔ خاندانی، سگھڑ اور خوب صورت۔
ساس نے سیدھا راستہ نہ دیکھ کر رضیہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کی غلطی کی تھی۔ "چل یہ بھی میری پوتی، چاچے کے پتر سے بیاہ دوں گی۔"
"رہن دے اماں! چاچے کے پتر کے لیے تو اپنی نواسیاں پسند کرتی رہنا۔ میں تو اسے اپنی آپاجی کے گھر بیاہوں گی۔ بلکہ بیاہوں گی کیا، جوائی کو ساتھ رکھوں گی۔ آپاجی کا شوہر میرے تائے کا پتر۔۔۔ اس کے بیٹے پتر جیسے۔۔۔ میں کیوں اپنے باپ، دادے کی جائیداد دیور، جیٹھ میں بانٹوں گی۔"
ساس حق دق رہ گئی۔
وہ کھلا ہاتھ رکھتی تھی، کوئی تیرا میرا نہیں۔ جو جیسے استعمال کرتا رہے، اس نے کبھی پلٹ کر نہ پوچھا مگر اصل میں اتنی کتائی۔۔۔
شاہین کے تمام رویے یاد تھے، اب آیا تھا وقت گن گن کر بدلے لینے کا۔
مگر آگے بھی شاہین تھی۔ جس نے ہار نہیں سیکھی تھی۔
وہ ساس، نندوں کی سرگرمیاں، خاموشی سے دیکھتی اور انتہائی لاپروائی سے اپنے روزمرہ معمولات میں مگن رہتی۔ اس کی یہ لاتعلقی انہیں دانت کچکچانے پر مجبور کردیتا تھا مگر وہ شاہین کی ان ضربوں کو سنار کی ضربیں سمجھ کر نظرانداز کررہی تھیں۔ ایک لوہار کی کرنے کے ان کے پاس ہتھوڑا تھا۔
لڑکی پسند کرلی گئی۔ شرط شرائط، سوال و جواب سب واضح کرلیے گئے۔ مقصود کی تابعداری حیران کن تھی۔
"بے وفا!" زمرد روتی پائی گئی۔
"نمک حرام۔" شاہین کا دل بولا۔
"ہائے ماشاء اللہ میرا فرماں بردار پتر۔" ماں سرشار تھی۔
مگر شاہین کی ایک لوہار کی لگی۔ دن میں تارے نظر آگئے۔ زبان دانتوں تلے آگئی۔
جس نے سنا انگلیاں چبا ڈالیں۔
"پاگل، احمق، اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہی ہے۔ ارے کوئی اسے عقل دے۔"
"کیا کرنے لگی ہے عقل کی اندھی!"
"کوئی ایسے کرتا ہے، ارے شرم لحاظ ہے کوئی۔ ارے کہاں سولہ برس کی جوانی اور کہاں ڈھلتے سورج جیسی شاہین۔ ٹھوکروں میں پڑ جائے گی، منہ میں پانی ٹپکانے والا کوئی نہ ہوگا۔ اپنے گل پر ترس کھا نادان!"
سارے عالم کو شاہین کے مستقبل کی فکر ہو چلی تھی۔
"اس نے مقصود کو کیسے راضی کیا؟"

پل بھر کو بھونچکا "دنیا کیا کہے گی۔" ملا جھینپنے لگا۔
شاہین نے پل میں ننگا کردیا۔
"جب جگہ جگہ منہ مار رہے تھے، گاڑی بھر کے اولاد کی کھیپ لے کر گاؤں کی گلیوں سے گزرے تب دنیا نے کچھ نہ کہا۔ جب اس طوائف کے تلوے چاٹ رہے تھے۔ تب کوئی کچھ نہ بولا، تو اب۔ تمہاری ماں کی ڈھونڈی چلتر سے لاکھ درجے اچھی لا کر دے رہی ہوں۔ قابل تو تم اس کے بھی نہیں کہ تمہیں کوڑھی عورت بھی ملے۔ بے غیرت!" وہ حلق کے بل چلائی۔
"اس عمر میں طلاق لے کر جاؤں تو کون روکے، مگر ابا نے کہا تھا سرخ جوڑے میں جا رہی ہے، سفید کفن میں نکلنا۔۔۔ مجھے داغ دار کفن نہیں چاہیے۔ میرا دل نہ جلا مقصود۔۔۔ میرا تو یہ گھر ہے، میں تو یہیں رہوں گی ہمیشہ۔ قبر بھی آنگن میں کھود لوں گی، مگر باپ کی وصیت کی لاج رکھوں تو تجھے سفید کفن میں نہ نکال دوں۔ دھوکے باز، فراڈیے!" اس پر دورہ سا پڑا۔
یہ تماشا دیکھنے دنیا اکٹھی تھی۔ بظاہر سنجیدہ بیٹھے مقصود کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ شاہین کی زبان کا زہر اپنی جگہ مگر فائدے میں تو پھر بھی وہی رہا۔ تمام جمع تفریق کو مدنظر رکھنے والی شاہین سے یہ پہلو کیسے چوک سکتا تھا مگر اس نے حسب عادت اپنا ہاتھ اوپر رکھا تھا۔
دنیا عش عش کر اٹھی تھی، اتنا بڑا دل، اتنا بڑا جگرا۔۔۔ ایسی کومل، سنہری، ملائم گڑیا جیسی سوکن۔ ساری دنیا مقصود کو قسمت کا دھنی کہہ رہی تھی۔ سب شاہین کی عظمت کو سراہ رہے تھے۔ اس کے دل، اس کے صبر، ضبط کی مدح سرائی تھی۔ کسی نے سرخ گٹھڑی میں دبکی رضیہ کے بارے میں نہ سوچا۔
شاہین نے کہا "بھلے تیرے جیسے کی اولاد ہوگی، مگر میری بھانجی، بیٹی کے بچے عیش کریں گے، اتنی بھی رال نہ ٹپکا۔"

☆ ☆ ☆

نفیسہ کی کہانی سالوں پہلے ختم ہوئی اور شاہین کی اب۔۔۔
مگر رضیہ کی کہانی کا آغاز تھا۔ بدنصیبی کا، بدبختی، وہ اپنی پیدائش سے پہلے اپنی ماں کے دل و دماغ میں خدشے کی صورت پنپی تھی۔
اور جب یہ خدشہ، مجسم سامنے آیا تو اس نے اسے خود سے دور کردیا۔ وہ دنیا میں آنے سے پہلے ہی مسترد تھی۔ آنے کے بعد نظرانداز کردی گئی۔ وہ کٹھ پتلی تھی، ایک ایسی عورت کے ہاتھوں کی جسے وہ اپنی مرضی سے سجا بنا کر دنیا کے سامنے پیش کردیا کرتی تھی۔ اس کے جسم کی جنبش پر شاہین نامی عورت کا پہرہ تھا اور سوچ کو اس نے پنپنے کب دیا۔
شاہین کی محبت، توجہ ایک ہتھکڑی کی طرح تھی، جو نرم پھولوں میں چھپی تھی۔ رضیہ کو کبھی سختی کا احساس نہ ہوا تھا۔
وہ جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی تھی۔
نئی صبح، نیا آسمان، خوشبو، اوس کی بوندیں۔
اس نے اب تک وہ دیکھا جو شاہین نے دکھایا۔۔۔ مگر یہ نئی دنیا۔
حیرت، شرمندگی، خوف، کیا، کیا نہ تھا۔ حجلۂ عروسی میں بیٹھتے وقت تک، وہ اپنی سکھیوں کو کیا کہے گی، کل تک جس کا تعارف ابا کہہ کر کرواتی تھی، آخ۔۔۔
حالانکہ مقصود اور رضیہ کے رشتے میں اول روز سے نگاہ غلط انداز کا بھی گزر نہیں تھا۔ وہ شاہین کا کھلونا تھا۔ مقصود نے اپنے دل کو ناکام پایا تھا رضیہ کے حوالے سے کسی بھی جذبے کو اجاگر کرنے میں اور پھر اس نے کبھی سعی بھی نہیں کی۔ اسے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے کبھی پدرانہ شفقت سے رضیہ کے گال بھی چھوئے ہوں۔ اس سے زیادہ التفات تو وہ باہر بندھے جانوروں سے کردیا کرتا تھا۔
اسے تو اس کا چہرہ بھی یاد نہیں تھا۔ مگر سرخ جوڑے میں سجی بنی رضیہ یا اللہ۔۔۔
عجب سرخوشی کے عالم میں وہ بدمست سانڈ کی طرح اندھا دھند ٹکراتا پایا گیا۔

وہ نازک تھی، شبنم کی بوند جیسی ہلکی اور شفاف۔ بھولی، معصوم، حیران پریشان اوک میں رکھا شفاف پر۔

رضیہ کی زندگی میں کسی مرد کا گزر نہیں تھا۔ باپ، بھائی، چاچا، ماما.....

یہ نکاح کے بول تھے۔ سب سے مضبوط تعلق یا زندگی کا پہلا مرد، وہ دیوانی ہو گئی۔

تیسرے ماہ اس کا پیر بھاری ہوا تو وہ سارے جہان سے کٹی کٹی پھری، لجا کی ماری اور دوسری طرف شاہین انتقام کی ماری۔

اس کا کمزور وجود، احتیاطی تدابیر، ڈاکٹری ہدایات۔ اس کی لاکھ ناپسندیدگی کے باوجود شاہین اسے دوبارہ اپنے کمرے میں لے گئی۔ وہ اس کے منہ میں نوالے دیتی، سر میں تیل ڈالتی، کندھے گوڈے دابتی۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی، جو مسکرا بھی نہیں پاتی تھی۔

اسے اپنے کمرے میں جانا تھا۔ اسے مقصود کے ساتھ رہنا تھا۔

وہ اس کا شوہر تھا، جو محبوب بن گیا تھا۔ عمر کے فرق سے کیا ہوتا ہے، وہ اس کے بچے کا باپ تھا۔

وہ اس کی شکل دیکھنے کو ترس رہی تھی مگر شاہین سائے کی طرح اس کے ساتھ۔ شاہین کو اور سب کو بیٹے کا انتظار تھا۔ سب دن گن رہے تھے اور وہ پل پل کہ کب وہ اپنے کمرے میں جائے گی۔ اسے مقصود سے محبت ہوئی تھی۔ اس جدائی نے عشق پیدا کر دیا تھا۔

مگر..... بیٹے کی پیدائش جشن تھی۔ سب کے چہرے پر خوشیوں کے عکس تھے۔ سرخی، بھنگڑے، رقص، ڈھول کی تھاپ، آتش بازی کے رنگ آسمان کی سیاہی کھا گئے۔ اور اس سے کہیں زیادہ تاباں، نکھرا چہرہ رضیہ کا..... وہ اپنے کمرے میں جائے گی..... ہاں..... لیکن.....

"پتر چاہیے تھا نا، دے دیا تجھے اور تیرے ہوتوں، سوتوں کو وارث۔ اب بے نام نہیں رہے گا اور اس کی جوانی کو تیرا بڑھاپا گھن لگائے، یہ میں ہونے نہیں دوں گی۔ میری بھانجی ہے، میری گود میں ڈالا اس نے بچہ۔ چل جا کے اس زمرد کے گوڈے گٹے پھڑ..... خبردار جو رضیہ کا نام بھی لیا تو۔"

رضیہ حق دق ان دونوں کی شکلیں دیکھتی رہی۔ وہ چیخ کر کہنا چاہتی تھی، اسے جانا ہے۔ اس نے دن گنے تھے۔ اسے مقصود کی عمر، کردار، اخلاق سے کیا غرض، اس نے دنیا کے لاکھ طعنوں، شرموں کے باوجود خالہ کے کہنے پر سر جھکایا تھا۔

وہ بہت خوف زدہ تھی۔ دنیا سے آنکھ ملانے کے قابل نہ سمجھتی تھی خود کو..... مگر ان کا رشتہ اللہ کے نزدیک جائز تھا۔ مکمل تھا، بے عیب۔

اس کے ہونٹ پھڑپھڑا گئے۔

"جھلاں ورگی میری دھی اور تو اک واکنڈا..... (ایک کا کانٹا) اسے کیا خبر، بھولی، نا سمجھ۔ پتر کے لیے سیاپا ڈال کر بیٹھی تھی نا تیری ماں، بہن، آگیا پتر اور لینے ہوں گے تو سوچیں گے۔ اب تو ادھر سے نکل۔ بلکہ جدھر مرضی نکل،

دھیان رہے۔ طوائف کے ناچتے پیروں کو زیادہ دیر ساکت رہنے کی عادت نہیں ہوتی۔ مشق وشق تو کرتی ہوگی۔ ذرا خبر رکھنا۔ چوہدریوں کے گھر خوشی کے موقع پر ناچنے گانے ہمیشہ مراثنیں ہی آتی ہیں۔ ہمارا نہیں رواج، گھر کی کڑیاں رونق لگائیں۔ اب جا..... میری دھی آرام کرے گی۔"

وہ اس کے پریشان بال سنوارتی سہارا دیتی کمرے میں گھسی۔ پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ رضیہ کی خوشیوں کا، ہنسی کا۔ ہمیشہ کے لیے.....

☼ ☼ ☼

شاہین کے پھینکے پتے اور چلی گئی چال نے بساط پلٹ دی۔ جو کل اس کی دریا دلی کے گن گا رہے تھے وہ توبہ توبہ کرتے پائے گئے۔

اتنی شاطر عورت، کیا مزا چکھایا۔ بھئی منصوبہ بندی ہو تو ایسی..... جتنے منہ اتنی باتیں۔ مگر کامیابی کا ہما شاہین کے سر تھا۔ اس نے مقصود کا حق دق چہرہ دیکھا تھا تو رضیہ کی بن جل مچھلی والی تڑپن کیسے نظروں سے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ مگر وہ اپنی سوچ اور ارادوں میں پکی تھی۔

سجا بنا کر سجی سجائی سونے میں لت پت رضیہ کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھاتی۔ ملنے آنے والی مہمانوں، کمیوں، مراثنوں کے سامنے شہزادی بن کر رہتی۔ ہلکے رنگ کے لباس میں اس کا رعب ہی سب سے جدا ہوتا۔

ننھا کاکا پاس ہی پنگھوڑے میں ہوتا، پھر واکر میں چلنے لگا، پھر سائیکل چلاتے جوان ہو گیا۔

مگر رضیہ کی یادداشت میں اتنے طویل عرصے کا چوری چھپے کا بھی کوئی پل نہیں تھا۔ مقصود بھی جیسے ہار مان کر زمرد کے در پر پڑا رہتا یا پھر باہر دوستوں میں..... شاید سب کچھ اسی طرح چلتا رہتا۔

مقصود کو جھٹکا لگا۔ اس کی بڑی بہن نے اپنے جڑواں بیٹوں کے رشتے باہر طے کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مقصود نے اتفاقاً "ان لڑکیوں کو دیکھ رکھا تھا۔ عام شکل وصورت کی بھدی، بے ڈھنگی لڑکیاں۔

اس نے شکوہ بھائی کے کانوں انڈیلا تو خبر ملی وہ اپنے لائق فائق خوبرو بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش میں ہے مگر بیوی کی ناک پر کوئی نہیں چڑھتی۔ کوئی اچھی لڑکی ہو تو بتائے۔

"تلاش کی کیا ضرورت، اس کی بیٹیاں ہیں نا، چاندی، ثمن، ایمن، مرجان۔"

"برا نہ ماننا بھائی جی! میرا ہیرے ورگا پتر اور تمہاری بیٹیاں....."

"وہ میرا خون ہیں مسعود!" مقصود کرلایا۔

"خون تو آپ کا ہی ہے، مگر اس سے اچھا تھا رگوں ہی میں رہتا، آپ نے پھینکا گندی مٹی پر..... سوکھ کر کالے نشان کی طرح جم گیا اور سڑاند اب تک اٹھتی ہے۔ پھر اس پر لوگوں کے قدموں کے نشان..... سب مکس ہو گیا۔ معذرت ہے بھائی جی!"

وہ منہ پر تھوک گیا تھا۔ صرف تیزاب سے تھوڑی چہرے جھلستے ہیں۔

"دنیا دکھانے کو جینے سے تو گالی ہیں۔ تاج بنا کر سر پر نہیں رکھ سکتے۔" بہن کے الفاظ۔

زمرد بیماری کی پوٹ تھی، اسے مقصود پر فخر تھا۔ کوٹھے پر چڑھنے والوں کی جیب میں نوٹوں سے زیادہ دعوے ہوتے ہیں۔ نوٹوں سے پیٹ بھرتا ہے اور دعووں سے دل۔

مقصود مگر اپنے دعوے میں سچا نکلا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہ بہو کہلائی گئی تھی اور ایک نام، پہچان مل گئی تھی۔ اسے عام عورتوں کا طرز زندگی بھا گیا تھا۔ احساس تشکر سکون دیتا تھا کہ اس کی بیٹیاں بھی ایسی شان دار زندگی بسر کریں گی۔

ساس، نند منہ، سر چومتی تھیں، سر ڈھانپنے کی بات کرتی تھیں۔ بعد میں ادراک ہوا تھا کہ یہ سب شاہین کو دکھایا جاتا تھا۔ اور جب کرنی کا وقت آیا تو.....

صدمہ، حیرت، افسوس، تکلیف، مقصود کا بلڈ پریشر۔ اسے فالج کا حملہ ہوا اور وہ لاچار ہو کر بستر پر گر گیا۔

"شاہین باجی.....!" مایوسی کے گھپ اندھیرے میں زمرد کو روشنی کی کرن دکھائی دی۔ "وہ سب کر سکتی ہے جو کرنا چاہیے، وہ بڑی ہے۔"

وہ اس کے پیر پڑ گئی۔

شاہین کا سر اونچا ہوا۔ ہاں وہ سب کر سکتی ہے۔ اسے ایک موقع چاہیے تھا، مگر تمام عقل لڑانے کے باوجود سدھ نہیں آئی تھی۔ اس نے زمرد کے اپنے پیروں پر جھکے سر کے اٹھنے سے پہلے سب طے کر لیا۔

"تو ٹھیک کہہ رہی ہے زمرد! میں سب کر سکتی ہوں اور کروں گی بھی مگر میری ایک شرط ہے۔"

"میں آپ کی ہر شرط پوری کروں گی۔" وہ پر عزم لہجے میں بولی۔

"ایسا دعوا نہ کر جو پورا نہ کر پائے۔"

"میں اپنی جان سے گزر جاؤں گی۔"

"دیکھ زمرد! تو مسعود اور جمیلہ کے پتروں کے پیچھے رو رہی ہے۔ میں مولوی صاحب کے بیٹے کی بہو بنا دوں گی

تیری چاندی سونے کو۔۔۔" وہ تول تول کر لفظ ادا کر رہی تھی۔

"کون سا جادوئی منتر؟" زمرد اچنبھے سے اس کے جملے اور انداز کا تیقن دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا شاہین سب کر سکتی ہے، مگر آخر کیسے؟

"کرنے کو تو میں خود بھی کر سکتی ہوں۔۔۔ مگر۔۔۔ خیر! مقصود سے کہہ، رضیہ کو طلاق دے دے۔" اس نے دھماکا کر دیا۔ زمرد کے پرخچے اڑ گئے۔

زمین پر بیٹھی زمرد بمشکل کھڑی ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی شاہین کو یوں دیکھتی تھی جیسے کوئی بے پھل بیری ہے۔

وہ شاہین تھی جس کا بسیرا پہاڑوں کی چٹانوں پر ہوتا ہے۔ مقصود جیسے چوہے، پستیوں ہی میں کھوہ بناتے رہ جاتے ہیں۔ بلندی نگاہ کو وسعت دیتی ہے۔

اور شاہین کی دوررس نگاہیں اسے جو دکھا رہی تھیں، وہ اسے کبھی قابل قبول نہیں تھا، کبھی نہیں۔



اس نے مقصود سے کہا تھا۔ "بھلے اولاد تیری بھی ہوگی، مگر عیش تو میری بھانجی اور اس کے بچے کریں گے، مالک ہوں گے۔"

اس نے اپنی پرکھوں کی جائیداد پر عیش کرنے کے لیے کسی غیر لڑکی کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ رضیہ اپنی تھی، بیٹی، بھانجی، بے شک سوکن بھی، مگر تھی تو اپنا خون اور اس کا پیدا کیا بیٹا۔۔۔ کبھی خواب میں بھی تسلیم نہیں کیا کہ اس نے اسے جنم نہیں دیا۔

وہ رضیہ کو آرام کا مشورہ دیتی اور بچے کے ساتھ راتوں کو خود جاگتی، اسے کھلاتی پلاتی، دھوتی نہلاتی۔

شوہر سے دوری کے بعد کاکا رضیہ کا کل تھا۔

"شاہین اب بوڑھی ہو رہی ہے۔ سب کچھ رضیہ ہی کا تو ہوگا۔ وہی تو خاندانی بیوی ہے۔ جوان خون سب سنبھال لے گی۔"

"اور وارث کی ماں۔۔۔ اللہ اور بھی بچے دے گا۔ مرد کی عمر کو کون سی پھپھوندی کھاتی ہے۔"

"شاہین کا بڑھاپا تو اللہ اللہ کرتا سکھ سے گزرے گا۔"

"رضیہ تھوڑی دکھائے گی سوتن کا جلاپا۔ ماں سے بڑھ کر پیار کیا ہے۔ شاہین نے اسے۔"

"کیسے گھی شکر بن کر رہتی ہیں۔"

"بھلے آج شاہین کا ہاتھ اوپر ہے، مگر کب تک رہے گا۔"

"ارے میرے اللہ!" اڑتی پڑتی، کچی جھوٹی اس کے کانوں پڑتی ہی تھیں۔ "اس جانب تو شاہین تیرا دھیان ہی نہ گیا۔" اس نے حواس باختگی سے خود کو کوسا۔

مقصود کا رضیہ کو پیاسی نگاہوں سے تکنا اس کے علم میں تھا۔

رضیہ کے بچپن میں رضیہ اس کے لیے سسرالیوں کے منہ پر مارنے والے تھپڑ کی طرح تھی۔ رضیہ کی جوانی کو اس نے رشتے میں باندھنے کے باوجود مقصود کو للچانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس نے سب کچھ دے کر بھی کیسے تڑپایا، ستایا تھا مقصود کو۔۔۔ وہ ایک گھر میں رہتے ہوئے رضیہ کی خوشبو بھی نہ پا سکتا تھا۔

اسے اس کھیل میں مہارت حاصل ہوئی تھی اور جیت کا مزا و نشہ۔۔۔ واہ! لیکن اس کی زمانہ ساز عیار آنکھوں سے رضیہ کا مقصود کی طرف لپکنا بھی کب پوشیدہ رہا تھا۔ وہ اس کی آواز سنتے، اس کی فقط موجودگی کو محسوس کرنے کے لیے چک پھیریاں کھایا کرتی تھی۔

پھر شاید خود ہی مایوس ہو کر کاکے کے وجود میں چھپنے لگی۔

مگر کاکا تو شاہین کا تھا نا اور شاہین کے سامنے رضیہ تھی، رجو۔۔۔

اور شاہین اب رجو سے رج گئی تھی۔

وہ اس کھیل کو اب بھی اپنی مرضی سے کھیل سکتی

تھی۔ اس کے پاس بڑے مہرے تھے، مگر... بعض کھیل وقت پر مکمل کر لینے چاہئیں۔ مبادا پچھتاوا ہو... خالی ہاتھ...

☼ ☼ ☼

دکھ کی داستان جتنی دیر زیر مطالعہ رہے، پیٹ میں گرہیں لگاتی رہتی ہے۔ آنکھ سے آنسو ٹپکے نہ ٹپکے... دل ہچکیوں سے روتا رہتا ہے۔ سو طوالت چہ معنی۔

رضیہ ایک بار پھر دلہن کے روپ میں تھی۔

"اماں نے کہا، اس گھر کو ایک عورت کی ضرورت ہے۔ صحیح کہا ہوگا، مگر مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے راشدہ کی یادیں ہی کافی ہیں۔ تم رہو یہاں... گھر میں۔"

وہ اس کا گھونگھٹ پلٹے بنا ہچکیوں کے درمیان رک رک کر بولتا جاتا تھا۔ شاید اس نے پی رکھی تھی، زبان بھاری اور لڑکھڑاہٹ سے بھرپور۔

"اماں بولیں... تم بڑی خوب صورت ہو، ہوگی مگر راشدہ جیسی نہیں نا۔ یہ دیکھو..."

اس نے اپنے کپڑوں کی تمام جیبیں ٹٹولیں، پھر ایک بٹوہ برآمد کیا۔ بچی بنی خوب صورت عورت۔

رضیہ کیا خاک اثر لیتی، اس نے جان لیا تھا۔ شکل کی خوبی سے زیادہ بخت کی خوبی اہم ہے۔

"تمہارا گھر ہے، کھاؤ پیو، عیش کرو، سیاہ سفید کرنا، مگر بس مجھے نہ چھیڑنا، صحیح ہے نا۔ تمہیں دوسرا بیڈ روم دیا ہے، وہ تو راشدہ کا ہے نا، میرا اور راشدہ کا اور راشدہ کس کی، میری... میری تھی... میری ہے۔" وہ کم ہوتی آواز کے ساتھ کمرے سے گرتے پڑتے نکل گیا۔

اور اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنے گہنے ایک ایک کر کے اتارنے شروع کر دیے۔

اور پھر آنے والے ہر پل میں ٹھوکر تھی۔ تادیب چوٹ۔ اسے ہر حوالے سے غیر اہم کر دیا گیا۔ ٹھکرا دیا گیا۔

"مجھے نہیں ضرورت بچوں کی... یہ تین ہیں نا، ان میں ممتا کا سکھ ڈھونڈو، میں راشدہ کی روح کو تکلیف کیسے دے سکتا ہوں۔"

اور بچے...؟

"نہیں ہیں آپ ہماری امی، وہ چلی گئی ہیں ہم سب کار میں جا رہے تھے، ٹرک نے ٹکر ماری، وہ اسی وقت مر گئیں، ان کا سارا خون روڈ پر گر گیا، ہم سب کو کچھ بھی نہیں ہوا۔"

دونوں بڑے بچوں نے اس کی حد بندی دکھا دی تھی۔

چھوٹا بہت چھوٹا تھا، چار ماہ کا بچہ۔

جنگ و جدل کے بجائے مصالحت سب سے اچھی راہ ہوتی ہے۔

اور مصالحت برداشت کا دوسرا نام ہے۔ اس نے زندگی سے ہر شے کو نکال کر ایک برداشت کو سامنے رکھ لیا تھا۔ اور اسی برداشت کی طاقت کے سہارے اس نے باقی ماندہ زندگی کے کچھ سال ہی تو گزارنے ہوں گے۔

شروع میں بہت مشکل لگنے والا سفر کچھ آگے بڑھا تو آسانیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ یادوں کے سہارے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔

اسے اپنے خوبرو پڑھے لکھے شوہر کی قربت کے پل مل ہی گئے۔ جب بھی اس پر راشدہ کی یاد کا شدید حملہ ہوتا تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ جاتی۔ اس کی سنتی رہتی، وہ اسے یاد کر کے روتا تو وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھ دیتی۔

"تم... تم بھی یاد کر سکتی ہو... اپنے شوہر کو... میں کوئی طعنہ نہیں دوں گا۔" اس کے سر پر کھایا پیا چڑھ جاتا تو وہ کھلی آفر کرتا۔

وہ ہونٹ دانت سے کاٹتے ہوئے نفی میں سر ہلاتی۔ اسے کوئی یاد نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی یاد کھرنڈ چڑھے زخم کی طرح ہوتی ہے، چھو تو روح تک چیخ اٹھتی ہے۔

وہ کیا یاد کرتی۔

زمرد کی التجائیں۔

شاہین کی شرائط۔

مقصود کی موقع شناسی، معاملہ فہمی۔

شاہین کا بچہ چھین لینا۔

دنیا میں ایک بار پھر اس کی واہ واہ ہوئی تھی۔ فالج زدہ بڈھے سے چھڑوا کر لاڈلی بھانجی کو جوان جہان، پڑھے لکھے آدمی سے بیاہ دیا۔ بھانجی کی عمر کو گلایا نہیں، بھئی واہ۔

اس نے زمرد اور مقصود کی کھلی ہتھیلیوں پر اپنے پیر رکھ دیے تھے، اس کی چاروں بیٹیوں کو زمین، جائیداد، کوٹھیوں کے دم چھلے کے ساتھ رخصت کر کے۔ پھر کسی کو یاد نہ آیا، ان کی ماں کون تھی۔

شاہین نے ایک بار پھر اپنے سسرالیوں کے سینے میں انی گاڑ دی تھی۔

"اتنا داج تو چوہدری اکو دھی کو بھی نہیں دیتے جتنا..."

شاہین ایسی کیوں تھی، بے اولادی کا دکھ، لوگوں کے دل چھلنی کرتے طعنے، اس نے دس سال سہے، وہ منتقم مزاج ہو گئی۔ دولت اولاد کا نعم البدل نہیں تھی مگر اس نے دولت کا استعمال بہت سلیقے سے وقت پر کیا۔

اور رضیہ اپنی قسمت کا نوحہ کس کس کے آگے پڑھتی۔ کس کو مورد الزام ٹھہراتی۔

ماں باپ کو...

شاہین کو...

مقصود کو...

ہر شخص نے اسے مسترد کیا... ذلیل کیا۔

اور بیٹا... جس کے سہارے اس کو زندگی گزارنی تھی، وہ ماں سے سلام کے بہانے ہر سال ملتا تھا مگر شاہین کے پڑھائے سبق کے زیر اثر۔

اور جن تینوں کے لیے وہ ماں بنا کر لائی گئی ان کی دوست بن گئی۔

سالوں بعد بغیر کسی کے کہے سنے ایک روز اسے خود ہی ماں کہنے لگے۔ بس...

زندگی کے لیے بعض اوقات اتنی کامیابی بھی کافی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

شاید امتحان ختم ہوا۔ آزمائش مکمل ہوئی۔

شوہر کا انتقال ہوا تو وہ بیٹوں، بہوؤں میں مگن ایک ذمہ دار بزرگ بن کر ابھری۔

عزت، مرتبہ، مان، حکم، فیصلہ سب اور محبت بھی...

لیکن...

"بس ایسے ہی عرفان، کامران اور عروہ نے سر چڑھایا ہوا ہے۔" اس نے بڑی بہو کی سرگوشی سنی۔

"یہ کون سی ان کی سگی ماں ہیں۔ جو ہم خدمتیں کر کے گھلیں۔" "ہاں نہیں تو... آج کل تو لوگ سگی ماں کی خدمت نہیں کر پاتے، یہ تو پھر سوتیلی ساس ہیں۔" چھوٹی نے ہنسی اڑائی۔

اس کا دل کٹ گیا، اسے ایک بار پھر مسترد کر دیا گیا تھا۔

وہ عرفان کے چھوٹے بیٹے کو شانے سے لگائے سلا رہی تھی۔ معصوم بغل میں منہ دیے غافل ہو رہا تھا، وہ اپنی دادی جی سے بہت ہلا ہوا تھا۔

محبت کے لیے کب یہ شرط ہے کہ ایک ہی جانب سے ملے، یہ تو جب بھی، جہاں سے بھی ملے مٹھیوں میں بھر لینی چاہیے، آنچل سے گرہ لگا دینی چاہیے۔

اس نے ننھے کے بالوں کو محبت سے بوسہ دیا تھا۔ ہوش آنے پر یقیناً "وہ بھی سب کی طرح... لیکن ابھی تو یہ ہے نا، تو بس کافی ہے۔

اس کے آنسو ننھے کے بالوں میں مدغم ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

اور میں کون ہوں رضیہ۔

مدیرہ کی میز پر پڑی مسترد شدہ تحریر۔

"لوگ اتنا دکھ، اتنا کلیجہ چیر دینے والا غم برداشت نہیں کر سکتے..."



افراح خان



"دیکھو نصرت! میں تو سچ بات کہتی ہوں۔ چاہے کسی کو اچھی لگے یا بری منافقت میرے بس کی بات نہیں۔ یہ فائقہ اس قابل نہیں کہ اس کا ہمارے ظفر کے ساتھ کوئی جوڑ بنے۔"

شمسہ آپا نے اپنی بھاوج نصرت کے کان میں کہا تھا لیکن آواز اتنی بلند تھی کہ فائقہ کی والدہ جو چائے لینے گئی تھیں سن چکی تھیں۔ اسی لیے اب ان کے انداز میں مایوسی کے ساتھ خوشامد بھی شامل ہو گئی تھی۔

"ارے شمسہ آپا! آپ نے تو رول لیے ہی نہیں۔ فائقہ نے بنائے ہیں۔ ذرا چکھیں تو سہی۔" فائقہ کی والدہ نے پلیٹ شمسہ آپا کے آگے کی۔

"نہیں بہن! رہنے دو۔ جتنا چکھنا تھا میں چکھ چکی۔ اب تو ہم چلیں گے۔ چلو نصرت! اٹھو۔" شمسہ آپا نے رکھائی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے اس انداز پر جہاں نصرت شرم سے پانی پانی ہو گئیں، وہیں نازش بھی اپنی شرمندگی ٹالنے کے لیے فائقہ کی والدہ سے مخاطب ہو گئی۔

"آنٹی! آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی اور فائقہ کے ہاتھ میں تو بہت ذائقہ ہے۔"

"چلو نازش! کیا یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟" شمسہ آپا نے باہر نکلتے ہوئے نازش کو ٹوکا۔

"جی پھوپھو! آرہی ہوں۔" نازش جلدی سے خدا حافظ کہہ کر ان کے پیچھے لپکی۔

راستہ بھر اور رات کے کھانے تک تو نازش نے خود پر ضبط کیے رکھا، مگر رات کے کھانے کے برتن سمیٹنے کے بعد وہ سیدھی ماں کے کمرے میں جا پہنچی۔

"امی! کیا ضرورت تھی پھپھو کو ساتھ لے جانے کی؟"

"یعنی تمہارا مطلب ہے کہ میں خود چلی جاتی اور واپس آکر تمہارے ابا اور پھپھو سے باتیں سنتی؟ تمہارے ابا کا بس چلے تو پانی بھی ان سے پوچھ کر پئیں۔" نصرت بھی بھری بیٹھی تھیں۔

"امی! فائقہ کتنی اچھی لڑکی ہے پر اب پھپھو ظفر کا رشتہ وہاں نہیں ہونے دیں گی۔" نازش بے بسی سے گویا ہوئی۔

"جانتی ہوں میں... اتنی اچھی اور سلجھی ہوئی لڑکی کو صرف کم حیثیت ہونے کی وجہ سے رد کر آئی ہیں۔ میری تو دلی خواہش ہے کہ لڑکی چاہے امیر نہ ہو، ہماری حیثیت کی نہ ہو مگر ادب آداب ––– والی، شرم لحاظ والی ہو۔" نصرت کو اس رشتے کے چھوٹ جانے کا بے حد ملال تھا۔

"امی! میں آپ کو بتا رہا ہوں، مجھے آج کے زمانے کی پٹر پٹر بولنے والی لڑکیاں سخت زہر لگتی ہیں۔ مجھے سادہ اور گھریلو لڑکی چاہیے۔ رشتوں کو سمجھنے اور نبھانے والی۔" ظفر نے سنا کہ پھپھو نے لڑکی کا گھر بار دیکھ کر انکار کر دیا ہے تو وہ بھی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"میں جانتی ہوں، مگر تم خود بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ نازش نے بھی کل تمہارے ابا کو سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ کہتے ہیں، آپا نے منع کیا ہے تو سوچ سمجھ کر ہی کیا ہو گا۔ پھر وہ بھی اپنا سا منہ لے کر اپنے گھر چلی گئی۔"

"میں ابا سے بات کرتا ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم کچھ کہو گے تو شمسہ آپا خواہ مخواہ یہ ثابت کرنے پر تل جائیں گی کہ تمہاری فائقہ کے ساتھ جذباتی وابستگی ہے۔ مفت میں فائقہ کو بدنام کر کے رکھ دیں گی۔" نصرت نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"امی! آپ جانتی ہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ نازش نے بتایا تھا کہ فائقہ بہت سلجھی ہوئی لڑکی ہے، اس لیے میں چاہ رہا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں بیٹا! مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں تو اپنی طرف سے اقرار کرنے گئی تھی۔" نصرت نے افسردگی سے کہا۔

"چلو! اب اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ میں تمہارے ساتھ وہ نہیں ہونے دوں گی جو نازش کے ساتھ ہوا۔" یہ کہتے ہوئے نصرت کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی اور ظفر جانتا تھا کہ ماں صرف دلاسا دے رہی ہے ورنہ ہو گا تو وہی جو شمسہ پھپھو چاہیں گی۔

نصرت بیٹے کو سمجھا کر باہر لاؤنج میں آئیں تو شمسہ آپا اور مختار سر جوڑے کوئی مسئلہ سلجھا رہے تھے۔ نصرت کو دیکھ کر دونوں چپ ہو گئے۔

"نصرت! رات کے کھانے میں دال گوشت بنا لینا۔" شمسہ آپا نے حکم جاری کر دیا، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ نصرت وہاں سے چلی جائیں۔ نصرت کچن میں آکر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگیں۔

مختار اور شمسہ کی محبت مثالی تھی۔ پورا خاندان دونوں بہن بھائیوں کی محبت کی مثال دیتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مختار اور شمسہ کم عمری میں ہی ماں کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے تھے۔ شمسہ آپا نے ہی مختار کو ماں بن کر پالا اور جب مختار اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تو ان کے والد منظور صاحب نے دونوں کی اکٹھی شادیاں کر دیں۔ تب مختار تیس برس کے اور شمسہ آپا پینتیس برس کی تھیں۔ دو سال تک تو راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ مگر جب شادی کے اڑھائی برس بعد شمسہ آپا بیوگی کی چادر اوڑھ کر آئیں تو نصرت کا سکون رخصت ہو گیا۔ مختار نے نصرت سے کہہ دیا تھا کہ کبھی میری بہن کے سامنے آواز بلند نہ کرنا۔ وہ دن اور آج کا دن شمسہ آپا ہی گھر کے سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔ شادی سے پہلے بھی وہ گھر کی حکمران تھیں اور بعد میں بھی بلا شرکت غیرے حاکمیت ان ہی کے حصے میں آئی تھی۔۔۔ اور اب یہ عالم تھا کہ گھر میں "کیا پکے گا" سے لے کر نازش اور مظفر کی شادی تک تمام امور میں ان ہی کا حکم چلتا تھا۔ نصرت صلح جو طبیعت کی مالک تھیں، مگر بچے ہمیشہ اپنی ماں کے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھتے آئے تھے، اسی لیے شمسہ آپا سے باغی تھے۔

☼ ☼ ☼

بالآخر شمسہ آپا کو ان کی پسند کی بہو مل ہی گئی۔ شمسہ آپا کے ہم پلہ خاندان کی خوب صورت اور پڑھی لکھی نویرہ پہلی نظر میں ہی انہیں بھا گئی۔ گو کہ نصرت اور نازش کو نویرہ کی باتوں سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خاصی تیز اور ہوشیار لڑکی ہے۔ مگر شمسہ آپا نویرہ کی خوب صورتی اور اس کی ماں کی چرب زبانی سے اچھی خاصی مرعوب ہو چکی تھیں۔ نویرہ کے والد اور بھائی کی مالی و سماجی حیثیت بھی نظر انداز کرنے والی نہیں تھی۔ اسی لیے مختار بھی پہلے دن سے شمسہ آپا کے ہم نوا ہو گئے۔ شمسہ آپا کی بات سے تو مختار پہلے کبھی اختلاف نہیں کرتے تھے، مگر اس معاملے میں انہوں نے خاص دلچسپی ظاہر کی۔

چاروناچار نصرت اور نازش بھی مان گئیں اور ظفر بھی راضی ہو ہی گیا۔ وہ الگ بات کہ نویرہ کی ایک جھلک ہی اپنا کام دکھا چکی تھی۔ نصرت کو اختلاف کا حق کبھی ملا ہی نہیں تھا۔ نازش کی بار بھی انہوں نے سمجھوتا کر لیا تھا حالانکہ نازش سسرال میں زیادہ خوش نہیں تھی۔ نازش کے معاملے میں بھی شمسہ آپا نے ظاہری شان و شوکت کو ہی ترجیح دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ نازش اور اس کے سسرال والوں کی سوچ اور طور طریقوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نازش اپنی ماں کا پرتو تھی، اسی لیے رشتہ نبھ بھی رہا تھا۔ اب ظفر کی شادی میں شرکت کے لیے بھی نازش کے سسرال والوں کو سو نخرے دکھانے تھے، جنہیں صرف نصرت کو ہی برداشت کرنا تھا کیونکہ بقول شمسہ آپا میں اس طرح کے "نازک معاملات" میں نہیں پڑتی، نصرت! یہ تمہاری رشتہ داریاں ہیں، تم ہی نبھاؤ۔"

☼ ☼ ☼

"ماما پلیز! آپ میرے سسرال والوں سے کہہ دیں کہ میں شادی میں ڈیزائنر ویئر ہی پہنوں گی، بلکہ بری کے جوڑے بھی ڈیزائنر ویئر ہونے چاہئیں۔"

"ہاں میری جان! پریشان کیوں ہوتی ہو۔ میں نے نازش کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ میری نویرہ ڈیزائنر ویئر ہی پہنتی ہے۔" نویرہ کی ماں نے پیار سے بیٹی کا گال چھوتے ہوئے اس کا مسئلہ حل کر دیا۔

"ماما! آپ کو کیا لگتا ہے کہ ایک مرتبہ کہنے سے ہی وہ لوگ مان جائیں گے؟" نویرہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ہاں! کیوں نہیں جب میں نے نازش سے یہ بات کہی تو ساتھ ہی شمسہ آپا بھی بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے کے تو زاویے ہی بگڑ گئے۔ لیکن پھر نصرت نے بات سنبھال لی۔ کہنے لگیں، کیوں نہیں، جیسی ہماری نویرہ ہے اس کی سب چیزیں بھی ویسی ہی ہوں گی۔ بلکہ وہ تو یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ نویرہ شاپنگ پہ بھی ساتھ چلے۔ اپنی مرضی کی چیزیں لے لے کیونکہ استعمال بھی نویرہ کو ہی کرنی ہیں۔"

"اوہ تھینک گاڈ! نصرت آنٹی بہت اچھی ہیں۔" نویرہ نے کلمۂ شکر ادا کیا۔

"ہاں! پہلے تو ساری ساسیں ہی اچھی ہوتی ہیں۔ پتا تو بعد میں چلتا ہے۔"

"نہیں ماما! نصرت آنٹی کو ہینڈل کرنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔" نصرت کی طبیعت کو نویرہ نے بہت پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔

"ہاں! نصرت تو واقعی مسئلہ نہیں لگتیں، لیکن وہ شمسہ آپا بہت بڑی مصیبت ہیں۔ ساری عمر نصرت کے سینے پر مونگ دلے ہیں۔ اب تمہاری باری ہے۔" نویرہ کی ماں نے اسے حقیقی خطرے سے آگاہ کیا۔

"تم شمسہ آپا کو زیادہ لفٹ نہ کرانا اور ظفر کو قابو میں رکھنا۔"

"وہ تو آپ فکر ہی نہ کریں۔" نویرہ نے بے فکری سے ہاتھ جھاڑے۔

"اور تمہاری کوکنگ کلاسز کیسی چل رہی ہیں؟" انہوں نے نویرہ سے استفسار کیا۔

"اوہو ماما! ٹھیک چل رہی ہیں، مگر اس بکھیڑے کی کیا ضرورت تھی آخر؟" نویرہ اپنی کلاسز سے بہت اکتا چکی تھی۔

"ضرورت تھی۔ بہت ضرورت تھی، تم نے دیکھا نہیں کہ نصرت خود کھانا پکاتی ہیں۔ کتنی کفایت شعار اور سلیقہ مند ہیں تمہاری ساس۔ مرد اپنی بیوی میں بھی ماں کو تلاشتا ہے۔ نصرت کی طرح بن کر دکھانا ظفر کو، وہ ہمیشہ تمہارا تابع رہے گا۔ اور ویسے بھی جب تک مرد اور کچن عورت کے ہاتھ میں ہو۔ راج عورت کا ہی ہوتا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم ہمیشہ راج کرو۔" نویرہ کی ماں نے اسے گر بتائے۔

"بالکل ویسے جیسے آپ نے کیا ہے۔" نویرہ نے ماں کی بات کو پلو سے باندھتے ہوئے کہا۔

"ہاں میری جان! بالکل ویسے جیسے میں نے کیا ہے اور کر رہی ہوں۔" اس کی ماں نے تائید کی۔

☼ ☼ ☼

نویرہ دلہن بن کر بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ظفر اور نویرہ کی جوڑی حقیقتاً "چاند سورج کی جوڑی" تھی۔ جس نے بھی دیکھا، سراہے بنا نہ رہ سکا۔ شادی کی تقریب میں نصرت دونوں کی نظر ہی اتارتی رہیں۔

شوخ چنچل نویرہ کے آنے سے گھر بھر میں رونق آگئی۔ ظفر نے پہلی رات ہی نویرہ کو باور کرا دیا تھا کہ نصرت کو نویرہ کی وجہ سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اگر ایسا ہوا تو وہ نویرہ کا اس گھر میں آخری دن ہو گا۔۔۔ اور نویرہ سمجھ گئی کیونکہ نصرت بہرحال ایک اچھی ساس تھیں جبکہ شمسہ آپا اور نویرہ کے درمیان محاذ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی کھل گیا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے ایک ہفتے بعد ہی شمسہ آپا نے نویرہ سے کھیر میں ہاتھ ڈالنے کی فرمائش کر دی۔

"پھپھو! ابھی تو شادی کو صرف ایک ہفتہ ہی ہوا ہے۔" ظفر نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

"ٹھیک ہے برخوردار! مگر نویرہ کو گھر کے کاموں میں دلچسپی لینی چاہیے۔ آج نہیں تو کل اسے ہی سب سنبھالنا ہے۔ ابھی سے شروع کرے گی تو اسی کے لیے بہتر رہے گا۔" مختار صاحب نے ہمیشہ کی طرح آپا کا ساتھ دیا۔ انہیں کب منظور تھا کہ کوئی ان کی بہن کی نفی کرے۔

"ٹھیک ہے بابا! جب ہم ہنی مون سے واپس آجائیں گے تو نویرہ کچن کا کام سنبھال لے گی۔" ظفر نے اپنے تئیں معاملہ ختم کیا۔

"کیا۔۔؟ ہنی مون پہ جارہے ہو اور کسی سے ذکر تک نہیں کیا؟ ایسے بتارہے ہو جیسے غیروں کو اطلاع دی جاتی ہے۔" یہ خبر سب ہی اہل خانہ کے لیے غیر متوقع تھی، لیکن سب سے پہلا ردِّعمل شمسہ آپا کی طرف سے آیا تھا۔ نوریہ ضبط کیے بیٹھی رہی، کیونکہ اسے اس طرح کے لہجے کی عادت نہیں تھی۔ نصرت نے بھی نوریہ کے بدلتے موڈ کو محسوس کیا اور ظفر نے بھی۔ ظفر کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ نصرت بول پڑیں۔

"آپا! جانے دیں نا۔ یہ ہی دو چار دن تو ہوتے ہیں بچوں کے مزے کرنے کے۔۔۔ اس کے بعد تو روٹین لائف شروع ہو جائے گی۔"

"ہاں ہاں، بچو جاؤ۔ کب جارہے ہو؟" مختار صاحب نے بھی ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی۔

"پرسوں۔" ظفر کا موڈ بھی بحال ہو گیا۔

"کہاں جارہے ہو بیٹا؟" نصرت نے نوریہ کو مخاطب کیا۔

"آنٹی! سنگاپور۔" نوریہ نے خوش ہو کر بتایا۔

"لو بھئی! یہاں تو لٹیا ہی ڈوب گئی۔" شمسہ آپا نے ہاتھ جھاڑے۔

"کیا مطلب پھوپھو؟" ظفر نے براہ راست شمسہ کو مخاطب کیا۔

"تم تو رہنے دو۔ مختار! اب خود ہی دیکھ لو۔ ابھی تو تمہارے صاحبزادے نے اپنا بزنس شروع کیا ہے اور ساتھ ہی چاؤ چونچلے شروع ہو گئے۔ خود حساب لگا لو کہ کتنا وقت لگے گا سب برباد ہونے میں۔" شمسہ آپا کبھی کسی سے نہیں ڈری تھیں تو ظفر کیا چیز تھا۔

"یہ بات تو آپا کی درست ہے۔ ظفر! اگر تمہیں اور نوریہ بیٹی کو جانا ہے تو مری، ایبٹ آباد چلے جاؤ۔ بیرون ملک جانے کی کیا ضرورت ہے۔۔؟ اور ویسے بھی ابھی بزنس سیٹ ہوا ہے۔ منافع آنا تو دور کی بات ہے۔ مشکل ہو جائے گا آپ کے لیے بجٹ سنبھالنا۔" مختار صاحب نے نرمی سے مؤقف بیان کیا۔ شمسہ آپا مزاج کی جتنی تیز تھیں۔ مختار صاحب اتنے ہی نرم۔ وہ شمسہ آپا کی تلخ باتوں کو بھی نرمی کے پیرائے میں بیان کر کے بات منواتے تھے۔

"بابا! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، مگر سنگاپور کے ٹکٹ اور ہوٹل ریزرویشن جمشید بھائی نے کروا دی ہے۔" نوریہ نے شمسہ آپا کو دیکھتے ہوئے آرام سے بتایا۔

"چلو! ٹھیک ہے، تم لوگ جاؤ، لیکن ظفر کوشش کرنا جلدی آجاؤ۔ ورنہ تمہارے کام کا حرج ہوگا۔"

"جی بالکل بابا! آپ فکر ہی نہ کریں۔" جواب نوریہ نے نہایت فرماں برداری سے دیا۔

☼ ☼ ☼

تقریباً دو ہفتے بعد نوریہ اور ظفر کی واپسی ہوئی تھی۔ دونوں سب گھر والوں کے لیے بہت سے تحائف لائے تھے۔ کچھ دن تک تو نوریہ سنگاپور کے قصے سناتی رہی۔ اس کے بعد نوریہ نے گھر کے بیشتر کام سنبھال لیے اور زندگی معمول پہ آگئی۔

"بابا! یہ آپ کی چائے اور شمسہ آنٹی آپ کی چائے یہ رہی۔"

"شکریہ بیٹا! اس وقت چائے کی بے حد طلب تھی۔" مختار صاحب نے نوریہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

شمسہ آپا نے ناگواری سے نوریہ کو دیکھا۔ وہ اس وقت گھر کا بجٹ ترتیب دے رہی تھیں اور کسی کی بھی مداخلت برداشت نہیں کرتی تھیں۔

"نوریہ! ذرا کچن میں دیکھنا۔ کچھ جلنے کی بو آرہی ہے شاید۔" نوریہ کو بیٹھتے دیکھ کر شمسہ آپا نے اسے وہاں سے اٹھانا چاہا۔

"نہیں آنٹی! امی کچن میں ہی ہیں۔" یہ کہہ کر نوریہ صبح کا اخبار لے کر بیٹھ گئی۔

"بابا! آپ نے یہ کالم پڑھا جس میں پاکستانی حکمرانوں کی خاصی کھنچائی کی گئی ہے اور خاصی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے؟"

نوریہ کچھ دن سے مختار صاحب سے کسی نہ کسی کالم

یا نیوز چینل کے کسی ٹاک شو پر مباحثہ شروع کر دیتی اور اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مختار صاحب بھی پرجوش ہو جاتے اور گرما گرم بحث شروع ہو جاتی۔ جس کا اختتام نوریہ اور مختار صاحب کے اتفاق رائے پر ہوتا۔ یہ سب شمسہ کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا، مگر خاموش رہتیں، کیونکہ وہ اس معاملے میں بول بھی کیا سکتی تھیں۔ اب بھی وہ دونوں کی باتیں سن رہی تھیں اور دیکھ رہی تھیں کہ کس طرح نوریہ مضبوط دلائل دے کر سامنے والے کو آسانی سے چت کر دیتی ہے۔

مختار صاحب سے بات کرتے کرتے اچانک ہی نوریہ نے شمسہ آپا کو مخاطب کر ڈالا۔

"آنٹی! آپ بجٹ بنا رہی ہیں؟" شمسہ آپا بھی جائزہ لے رہی تھیں کہ نوریہ کس طرح حکمران پالیسیوں کو نشانہ بناتے ہوئے روئے سخن مہنگائی کی طرف لے گئی اور مہنگائی کا رونا روتے ہوئے یکدم انہیں مخاطب کر ڈالا۔

"آ۔۔۔ ہاں۔۔۔!" شمسہ آپا گڑبڑا گئیں۔

"اتنی مہنگائی۔۔۔ اوپر سے شاہ خرچیاں۔ مہینہ پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"آنٹی! آپ پر تو بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اتنی مہنگائی میں بجٹ سنبھالنا آسان کام نہیں ہے۔" نوریہ کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

"ارے بی بی! تم کیا جانو، کس طرح پورا کرتے ہیں ہم بڑے۔ بعض دفعہ تو اتنا ڈپریشن ہوتا ہے کہ بس، لیکن خاموش رہتے ہیں کہ ذمہ داری ہماری ہے تو ہمیں ہی گھر کو سنبھالنا ہے۔" شمسہ آپا بڑے دنوں کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

"یہ بات تو آپ نے سو فیصد درست کہی آپا!" مختار صاحب تو اپنی بہن کے سب سے بڑے ہمدرد تھے۔

"واقعی بابا! میری ماما کہتی ہیں، نوریہ! تمہاری شمسہ آنٹی نے سارا گھر سنبھالا ہوا ہے۔ ہر وقت گھن چکر بنی رہتی ہیں۔ یہ تھکتی نہیں ہیں۔" آج نوریہ کی ساری ہمدردیاں شمسہ آپا کے ساتھ تھیں۔

"ارے نوریہ! کیا بتاؤں، اتنا تھک جاتی ہوں لیکن میں نہیں کروں گی تو اور کون ہے اس قابل، جو اس گھر کو چلا سکے۔" شمسہ آپا کے چہرے پر یکدم تھکن اتر آئی حالانکہ وہ صرف نصرت کو حکم دینے کا کام کرتی تھیں۔ اور مختار صاحب کو بھی یکدم پشیمانی نے آگھیرا کہ ان کی بہن پر اتنی ذمہ داریاں ہیں۔ کس طرح وہ بے چاری اکیلی ان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔

"آنٹی! مجھے آپ کی تھکن کا احساس ہے، کیونکہ اسی طرح کی بہت سی ذمہ داریاں میری ماما پر بھی ہیں۔ ہماری بھابھی صاحبہ تو ماشاء اللہ سے اپنے موڈ کی مالک ہیں، لیکن ماما مجھے اکثر کہتی ہیں نوریہ جب سے تم گئی ہو، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میرا دایاں بازو چلا گیا۔ تم تھیں تو کتنے کاموں کا پتا بھی نہیں چلتا تھا اور اب سب کچھ میرے کندھوں پر آگیا ہے۔"

"ارے ہاں! میں نے نوٹ کیا ہے، تمہاری بھابھی کچھ آرام طلب ہیں۔" شمسہ آپا اب نوریہ کے گھر والوں کے بخیے ادھیڑنے کے موڈ میں تھیں جبکہ مختار صاحب کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

"نوریہ! تم اپنی شمسہ آنٹی کا ہاتھ کیوں نہیں بٹاتیں؟"

"کیوں نہیں، مجھے تو ان سب کاموں کی عادت ہے۔" نوریہ خوش ہو کر بولی۔

"تو چلو! پھر ابھی سے بسم اللہ کرو۔ اپنی آنٹی کے ساتھ بجٹ بنواؤ۔" نوریہ کی تقرری بھی کر دی گئی۔

"ارے نہیں مختار! یہ کل کی بچی کیا جانے ان ذمہ داریوں کو۔۔۔ اور ویسے بھی یہ تو اس کے آرام کرنے کے دن ہیں۔" شمسہ آپا کو نوریہ سے خطرہ محسوس ہوا۔

"نہیں آنٹی! ذمہ داری دی جاتی ہے تو اسے نبھانا بھی آ ہی جاتا ہے۔ میں تو صرف آپ کے خیال سے مان گئی تھی۔ اگر آپ کو اچھا نہیں لگا تو کوئی بات نہیں۔" نوریہ نے مسکین صورت بنا کر کہا۔

"نہیں نہیں نوریہ! آپا کو کیوں برا لگے گا۔ میں تو کبھی محسوس ہی نہیں کر پایا کہ آپا تھک بھی جاتی ہوں گی۔"

"نہیں مختار! ایسی بات نہیں ہے۔"

"نہیں آپا! میں پہلے ہی بہت شرمندہ ہوں۔" نوریہ

!بس تم اپنی آنٹی کی مدد کروا دیا کرو۔" مختار صاحب نے آپا کی بات کاٹ کر نویرہ کو مخاطب کیا۔

"جی بابا! جیسا آپ کہیں۔" نویرہ کامیاب ہو گئی تھی، جبکہ شمسہ آپا بل کھا کر رہ گئیں۔ انہیں نویرہ کا ہمدردی کرنا سمجھ میں آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شمسہ آپا نے نویرہ سے پہلی بساط پر کیا مات کھائی، مات تو پھر جیسے ان کا مقدر ہی بن گئی۔ نویرہ ہر کام اتنی چالاکی سے کرتی کہ بظاہر تو ایسا ہی لگتا کہ وہ شمسہ آنٹی کا بہت خیال رکھتی ہے۔ لیکن شمسہ آپا جان چکی تھیں کہ وہ ان کا پتا صاف کرنے کے چکر میں ہے۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھیں۔ مختار صاحب نویرہ کے سب سے بڑے حامی تھے۔ نصرت پہلے ہی کسی گنتی میں نہیں تھیں۔ لیکن وہ ظفر کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ موقع ملنے پر نویرہ ہی کی حمایت کرتیں اور ظفر ہر وقت یا تو نویرہ کے بارے میں فکر مند ہوتا یا اپنی ماں کی پروا کرتا تھا۔ باقی اس گھر میں کیا ہو رہا ہے اسے فکر نہیں تھی۔ شمسہ آپا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ نویرہ کو کیسے زیر کریں۔ چنانچہ انہوں نے روایتی طریقہ اپناتے ہوئے اس کے کاموں میں مین میخ نکالنا شروع کر دیا۔

نویرہ ہر کام میں اپنی مرضی چلانے لگی تھی، جبکہ پہلے ہر کام شمسہ آپا کے مشورے سے ہوتا تھا، بلکہ وہ حکم جاری کرتی تھیں۔

آج رات کے لیے شمسہ آپا نے سبزی پلاؤ کا حکم جاری کیا تھا۔ لیکن جب وہ کھانے کی میز پر آئیں تو چکن اچاری دیکھ کر ان کا دماغ گھوم گیا۔ لیکن ضبط کیے بیٹھی رہیں۔ سب بڑی رغبت سے کھا رہے تھے اور یہ بات شمسہ آپا سے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔

"اف نویرہ! اتنی مرچیں اس قدر چٹ پٹا اور مسالے دار کھانا ہے۔۔۔ توبہ! اب ساری رات سینہ جلتا رہے گا۔" آخری جملہ بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہو گیا، مگر بڑبڑاہٹ اتنی اونچی تھی کہ سب نے سن لیا۔ ایک پل کو تو نویرہ کا دل چاہا کہ کہے چکن "اچاری" ہے چٹ پٹا تو ہو گا ہی۔ مگر جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں پیار بھری فکر مندی تھی۔

"شمسہ آنٹی! رہنے دیں۔ آپ یہ مت کھائیں۔ میں آپ کے لیے آملیٹ بنا دیتی ہوں۔ خدانخواستہ آپ کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔"

"ہاں ہاں۔۔۔ نویرہ! جاؤ شاباش "آپا کو آملیٹ بنا دو۔" مختار صاحب بھی فکر مندی سے بولے۔

"نویرہ! پہلے اپنا کھانا ختم کرو۔" ظفر نے نویرہ کو روکنا چاہا۔

"نہیں ظفر! آنٹی کو بدہضمی ہو گئی تو۔۔۔ اور ویسے بھی آنٹی ایک بار ہاتھ روک لیں تو دوبارہ کھانا نہیں کھاتیں۔ میں بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔"

شمسہ آپا دیکھتی ہی رہ گئیں کہ یہ کیا ہو گیا، جبکہ نویرہ جھٹ پٹ آملیٹ بنا لائی اور شمسہ آپا کو مجبوراً" مزے دار چکن اچاری چھوڑ کر ایک چٹکی نمک اور ایک چٹکی کالی مرچ والا آملیٹ کھانا پڑا۔

مختار صاحب خوش تھے کہ چلو! ان کے گھر میں ان کے بعد کوئی تو ہے۔ جو ان کی بہن کا خیال رکھتا ہے۔ ظفر خفا تھا کہ پھوپھو کی وجہ سے اس کی بیوی کو کھانا چھوڑ کر آملیٹ بنانا پڑا۔ نویرہ مطمئن تھی جبکہ شمسہ آپا کے دل پر جو گزر رہی تھی، یہ وہ ہی جانتی تھیں، کیونکہ چکن اچاری واقعی بے حد لذیذ تھا۔

☼ ☼ ☼

مہینے کی دو تاریخ تھی۔ حسب معمول ظفر نے مختار صاحب کو مہینے کا خرچ جو اس کے ذمے تھا، تھمایا۔ مختار صاحب نے اپنی پنشن مع ظفر کے دیے پیسے شمسہ آپا کو دے دیے۔

"ارے مختار! یہ تو صرف چالیس ہزار ہیں۔ باقی کے پیسے کہاں ہیں؟" شمسہ آپا کی حیرت بجا تھی۔

"لیکن میں نے تو ساری پنشن آپ کو دی ہے۔"

"ہاں! تم نے تو دی ہے، لیکن ظفر! تم نے کم پیسے دیے ہیں۔" شمسہ آپا نے ظفر کو مخاطب کیا۔

"ظفر! جب میں نے تم سے کہا تھا کہ کاروبار میں نفع نقصان تمہارا معاملہ، لیکن گھر تم ہر ماہ ایک لگا بندھا خرچ دو گے تو پھر یہ کیا ہے؟" نویرہ ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"بابا جان! دس ہزار کم ہیں۔ وہ میں نے رکھ لیے تھے۔"

"کیوں، تم نے کیوں رکھے، جب تمہیں ہر مہینے جیب خرچ ملتا ہے؟" مختار صاحب کی تیوری پر پڑے بل با آسانی گنے جا سکتے تھے۔

"حد ہے لڑکی! جو چاہے کرتی پھرتی ہو۔ تمہیں کسی کا ادب لحاظ نہیں؟ کیوں مختار! اگر یہ ہم سے مانگ لیتی تو کیا ہم منع کر دیتے؟" شمسہ آپا نے مختار صاحب کو بھی شامل کر لیا۔

"نویرہ! آج تم نے جو حرکت کی ہے۔ وہ بہت غلط ہے گھر کی بیٹیاں ہر کام پوچھ کر کرتی ہیں۔ میں بے حد مایوس ہوا ہوں۔" مختار صاحب کی آواز اونچی ہو گئی۔

"یہ لیں پانی لیں مختار!" نصرت مختار صاحب کی آواز سن کر پانی کا گلاس لے آئیں۔

"دیکھو لڑکی! اس طرح کی حرکتوں سے گھر نہیں بسا کرتے۔ تم کل کی بالشت بھر لڑکیاں چاہتی ہو کہ ایک ہی دن میں سب چیزوں پر قبضہ کر لو۔ کیا شوہر کیا اس کی کمائی۔" شمسہ آپا کا لہجہ تلخ ہوتا چلا گیا۔

"بس پھوپھو! حد ہوتی ہے۔ آپ بات خواہ مخواہ بڑھا رہی ہیں۔"

"ظفر رکو بیٹا!" نصرت نے بیٹے کو روکنا چاہا۔

"نہیں امی! میرے پیسے میری بیوی نے رکھ لیے تو کون سا طوفان آگیا۔" ظفر کو بھی غصہ آگیا۔

"ظفر! یہ کیسے بات کر رہے ہو تم شمسہ آپا سے۔ خبردار! جو یہ لہجہ آئندہ اپنایا تم نے۔" مختار صاحب ظفر پر گرم ہونے لگے۔

"لیکن بابا جان۔۔۔"

"رکیں ظفر! میں بات کرتی ہوں۔" نویرہ نے سنگین ہوتے معاملے کو سنبھالنا چاہا۔

"ارے! تم کیا بات کرو گی، تم ہی تو فساد کی جڑ ہو۔"

شمسہ آپا کو آج سارے بدلے اتارنے کا موقع ملا تھا، وہ کیسے چپ رہتیں۔ اس سے پہلے کہ ظفر کچھ بولتا نویرہ نے مختار صاحب کو مخاطب کیا۔

"بابا جان! آپ مجھے بھی تو کچھ کہنے کا موقع دیں۔ آپ کو پورا حق ہے کہ آپ مجھے ڈانٹیں ڈپٹیں، لیکن مجھ سے یہ تو پوچھیں کہ وہ پیسے میں نے کیوں رکھے ہیں۔" نویرہ روہانسے لہجے میں بولی۔

"لو اب تم کہانیاں گھڑو گی بی بی! ہم نہ سنیں تمہارے بہانے۔" شمسہ آپا پھر بول پڑیں۔

"ایک منٹ آپا۔۔۔ اکھو کیا کہنا ہے۔ کیوں رکھے تم نے خود سے یہ پیسے؟"

"بابا جان! دراصل پچھلے مہینے خرچے بہت ہو گئے تھے۔ یوٹیلیٹی بلز بھی زیادہ آئے اور نازش کی نند کی بھی شادی تھی۔ دس ہزار کی کمی بیشی ہو گئی۔ شمسہ آنٹی پریشان تھیں تو میں نے انہیں اپنے جیب خرچ سے دس ہزار دے دیے۔ اس مہینے میرے بھتیجے کا عقیقہ تھا تو میں نے ظفر سے کہا۔ انہوں نے مجھے پہلے ہی دے دیے۔"

"شمسہ آپا! آپ نے تو مجھے یہ بات نہیں بتائی؟" نویرہ کی بات سننے کے بعد مختار صاحب آپا سے مخاطب ہوئے۔

"وہ دراصل میں نے سوچا، تمہیں کیوں پریشان کروں۔" شمسہ آپا گھبرا گئیں۔ اب کیا بتاتیں کہ پانچ ہزار تو انہوں نے اپنی چچازاد کو جو ان کی بہترین سہیلی بھی تھی کو قرض دے دیے اور باقی پانچ ہزار اپنی کچھ ملنے آنے والی خواتین کی خاطر تواضع میں خرچ کر ڈالے۔

"بابا! بس میں نے یہی سوچا کہ اگر کوئی کمی بیشی ہو گئی ہے تو میں پوری کر دیتی ہوں۔" نویرہ نے شمسہ آپا کو دیکھتے ہوئے بتایا اور مختار صاحب کے نرم پڑنے پر ان کی کرسی کے قریب بیٹھ گئی۔

"بابا! میں نے کچھ غلط کیا کیا؟ میں بھی تو اس گھر کی بیٹی ہوں۔"

"ہاں ہاں! کیوں نہیں، بلکہ میں تو بہت خوش ہوں

کہ ہماری بیٹی اتنی عقل مند ہے۔ کیوں نصرت! دیکھا ہماری نوریہ کتنی کفایت شعار ہے۔ ورنہ ہم تو سمجھے تھے کہ نوریہ نازو نعم میں پلی ہے۔ شاہ خرچ ہوگی۔" مختار صاحب نے نصرت کو مخاطب کیا، جو کہ تب سے خاموش تماشائی بنی کھڑی تھیں۔

"بابا! یہ تو غلط بات ہے۔ آپ مجھے غلط سمجھتے رہے۔" نوریہ نے لاڈ سے کہا۔ ظفر بھی آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"نہیں! اب بالکل نہیں ہوگی یہ غلطی ہم سے۔ ہمیں تو تم پر پورا یقین ہے کہ تم اس گھر کو بہت اچھے طریقے سے چلا سکتی ہو۔ اسی لیے گھر کا بجٹ اب تمہارے ہاتھ میں۔" مختار صاحب نے اپنے رویے کا مداوا کرنا چاہا۔

"کیا مطلب بابا؟" نوریہ سب سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھی سے بولی۔

"مطلب تمہاری ترقی ہوگئی ہے بھئی۔ اب تم اپنی شمسہ آنٹی کو آرام دو اور گھر کا بجٹ سنبھالو۔" مختار صاحب کا بولنا تھا کہ نوریہ اور ظفر خوش ہوگئے۔

"چلو اب تم لوگ ابھی بازار جاؤ اور اپنے بھتیجے کے لیے اچھا سا تحفہ لینا۔" نصرت اور شمسہ آپا اب تک حیران تھیں۔ جو کام نصرت تیس سال میں نہیں کر سکی تھیں، وہ نوریہ نے آٹھ مہینے میں کر دکھایا۔

"مختار! یہ کیا کیا تم نے۔ وہ کل کی بالشت بھر لڑکی اور تم نے سارا گھر اس کے حوالے کر دیا۔" شمسہ آپا تیز لہجہ میں بولیں۔

"آپا! میں نے ٹھیک کیا۔ آپ اس عمر میں ان سب جھنجھٹوں سے اکیلی نمٹ تو لیتی ہیں، مگر آپ کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی ہے۔ آپ کا بی پی ہائی رہتا ہے۔ عموماً اس عمر میں خواتین آرام کرتی ہیں یا پوتے پوتیوں سے کھیلتی ہیں، جبکہ ہم نے آپ کے کندھوں پر بوجھ ڈال رکھا ہے۔ سچ آپا! میں کافی دنوں سے بہت فکر مند تھا۔" مختار صاحب کے لہجے میں بہن کے لیے فکر مندی واضح تھی۔

"نہیں مختار! اب ایسی بھی طبیعت خراب نہیں میری کہ میں اپنی ذمہ داریوں سے ہی منہ موڑلوں۔" شمسہ آپا نہیں جانتی تھیں کہ پچھلے دنوں سب کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے بیماری کا بہانہ انہیں اتنا مہنگا پڑے گا۔

"نہیں آپا! بس اب بہت ہوگیا۔ اب آپ کے آرام کرنے کے دن ہیں۔ اللہ نے ظفر کا جوڑا ایک سمجھ دار عورت سے بنایا ہے۔ وہ سب سنبھال سکتی ہے۔ ماشاء اللہ بہت سمجھ بوجھ والی بچی ہے۔ بہت صلاحیتیں ہیں اس میں۔"

نصرت اپنے سرتاج کو دیکھ رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ ان میں کیا کمی تھی۔ لیکن انہیں اپنی سوچوں کو زبان دینا اور اپنی بات منوانا نہیں آتا تھا اور یہی کمی تھی ان میں۔ وہ بے بس بیٹھی شمسہ آپا اور مختار صاحب کو شکوہ کناں نظروں سے دیکھتی ہوئی کچن کی جانب چل دیں۔



"نصرت اٹھو... نصرت!" مختار صاحب تکلیف کی شدت سے کراہ رہے تھے۔

"مختار! کیا ہوا آپ کو؟" نصرت نے انہیں سینہ پکڑے دیکھا تو بوکھلا گئیں۔

"آپ یہ پانی پئیں۔" نصرت کے اپنے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

"ن... صر... ت... م... یں۔" درد کی شدت سے مختار صاحب جملہ بھی مکمل نہیں کرپارہے تھے۔

"میں ظفر کو اٹھاتی ہوں۔" نصرت یہ کہہ کر ظفر کے کمرے کی طرف بھاگیں۔

"ظفر۔ ظفر! دروازہ کھولو۔" نصرت زور زور سے دروازہ پیٹتے ہوئے ظفر کو آوازیں بھی دیے جارہی تھیں۔

"امی کیا ہوا خیر ہے؟" ظفر نے دروازہ کھولا تو نیند سے اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"ظفر! تمہارے ابا کو پتہ نہیں کیا ہوگیا۔ وہ۔"

کہتے ہی نصرت سسکیاں بھرنے لگیں۔

ظفر جب کمرے میں پہنچا تو مختار صاحب سینہ پکڑے بائیں جانب کی کروٹ میں گول ہو کر لیٹے تھے۔

ظفر نے جلدی سے گاڑی نکالی اور مختار صاحب کو لے کر اسپتال چلا گیا۔ نصرت بھی ساتھ گئیں۔ شمسہ آپا بھی جانا چاہتی تھیں، مگر ظفر نے انہیں منع کر دیا اور جلدی میں ماں کو لے کر نکل گیا۔ اس وقت نوریہ کو شمسہ آپا پر حقیقتاً" ترس آرہا تھا۔ شمسہ آپا روئے چلی جارہی تھیں۔

"آنٹی! آپ روئیں مت۔ اللہ سے دعا کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

نوریہ جتنا انہیں دلاسا دیتی، شمسہ آپا کے رونے میں اتنی ہی روانی آجاتی۔ شمسہ آپا پر وہ رات قیامت کی طرح تھی۔ وقت تو جیسے رک گیا تھا۔ نوریہ نے ظفر کو دو تین بار فون بھی کیا، لیکن ظفر فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ یہ بات بہت پریشان کن تھی۔ وہ بھی اللہ سے خیریت کی دعا مانگنے لگی۔

فجر کے وقت ظفر کی گاڑی گھر کے دروازے پر آکر رکی۔ گاڑی کے پیچھے ایمبولینس بھی تھی۔ مختار صاحب کو ایمبولینس میں لایا گیا تھا۔ مختار صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ نصرت غم سے نڈھال تھیں۔ بار بار بے ہوش ہو جاتیں، جبکہ شمسہ آپا سکتہ کے عالم میں مختار صاحب کی میت کے قریب بیٹھ گئیں۔ نازش بھی پہنچ گئی۔ اچانک ہی پورا گھر سوگ کی چادر میں لپٹ گیا۔ ظفر نے بظاہر تو اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا، مگر وہ بھی بہت ٹوٹ گیا تھا۔ ایسے میں نوریہ نے سب کو سنبھالا۔ گو کہ وہ بھی صدمے کا شکار تھی، لیکن گھر کے باقی لوگوں کے لیے اس صدمہ کی شدت زیادہ تھی۔

نوریہ نے ساری ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھالی۔ شمسہ آپا کا سکتہ ٹوٹنے میں دو تین دن لگے، جبکہ نصرت کی طبیعت سنبھلنے میں ہی نہ آتی تھی۔ ظفر سب کے سامنے مضبوط نظر آتا تھا، جبکہ نوریہ جانتی تھی کہ تنہائی میں وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا ہے۔ نازش بھی ایک مہینے تک گھر میں رہی، پھر اسے جانا پڑا۔ نوریہ کے گھر والے بھی ہر کام میں پیش پیش رہے۔ نوریہ کی ماں بھی ہر روز آجاتیں۔ سب مہمانوں کو دیکھتیں۔ تعزیت کرنے والے ان ہی کے پاس بیٹھتے، کیونکہ نصرت اور شمسہ آپا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ مہمانوں کو دیکھ سکتیں یا ان کی تواضع کر سکتیں۔ بجنید نے بھی ظفر کا بڑے بھائیوں کی طرح ساتھ دیا۔ وہ ظفر کو سمجھاتا کہ اب وہ ہی اس گھر کا بڑا ہے۔ اسے اپنی ماں کا سہارا بننا ہے۔

نوریہ نے پورے گھر کو سنبھال لیا اور گھر کا نظام بخوبی چلانے لگی۔ کیونکہ زندگی کے اس کھیل میں اب اسے ذمہ دار بہو کا کردار نبھانا تھا اور اس نے یہ کردار بخوبی نبھایا۔ شمسہ آپا کو تو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ مختار چلے گئے۔ وہ ان کے بھائی ہی نہیں، بیٹے بھی تھے۔ کبھی نوریہ سے کہتیں مختار عصر کی نماز پڑھنے گئے تھے۔ انہیں فون کرو اب تک آئے کیوں نہیں یا پھر کہتیں ان کے کپڑے تو استری کرواؤ۔ میرے بھائی کا کوئی دھیان نہیں رکھتا۔ ایسے میں نازش یا نصرت پاس ہوتیں تو رونے لگتیں، جبکہ نوریہ انہیں سمجھاتی تھی۔

نوریہ شمسہ آپا کو اس غم سے نکالنا چاہتی تھی اور کامیاب بھی رہی۔ چھ ماہ بعد گھر معمول پر آگیا۔ پورے خاندان میں نوریہ کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ سب یہی کہتے کہ نوریہ جیسی بہو آج کے دور میں ملنا مشکل ہے، ہر جگہ نوریہ ہی کا ذکر ہوتا۔ شمسہ آپا جب دنیا کی طرف دوبارہ راغب ہوئیں تو بقول ان کے خیر خواہاں کے، پانی سر سے گزر چکا تھا۔ گھر کا نظام نوریہ خوش اسلوبی سے چلا رہی تھی۔ گھر میں کب کیا ہوگا! کس طرح ہوگا سب نوریہ کے ہاتھ میں تھا۔

شمسہ آپا کو بھائی کی موت کا غم ضرور تھا اور اس غم میں صبر کرنے میں انہیں کافی دیر بھی لگی، مگر اپنی راجدھانی یوں کسی کے ہاتھ میں دیکھ کر ان کی برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے پھر سے گھر میں مداخلت شروع کر دی۔ نصرت نے تو اللہ سے لو لگالی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ہر وقت تسبیح ہوتی یا وہ نماز اور قرآن پڑھنے لگتیں۔ یا پھر نوریہ کی کچن میں مدد کروانے چل دیتیں۔ نازش اپنے گھر کی تھی۔ کبھی کبھی آجاتی مگر مہمانوں کی طرح گھر کے معاملات میں نہ پہلے اس نے مداخلت کی تھی اور نہ اب کرتی تھی۔ جب کہ شمسہ آپا کسی بھی طرح سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ نوریہ کی ہر بات اور ہر کام میں مین میخ نکالنے لگتیں۔ اس کے مشوروں کو رد کر کے اپنی مرضی تھوپتیں۔ پہلے کچھ عرصہ تو نوریہ نے برداشت کیا کہ ابھی مختار صاحب کے جانے کا غم تازہ ہے، لیکن ایک دن اس کی بھی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے اپنے گھر والوں کو اس شام چائے پر بلایا تھا۔

شمسہ آپا کچن میں گئیں تو چائے کے لوازمات دیکھ کر ان کا دماغ گھوم گیا۔ انہوں نے آج تک نصرت کو اتنی اجازت نہ دی تھی کہ وہ اپنے میکے والوں کی اتنی خاطر کرے چاہے وہ لوگ کھانے پر کیوں نہ آرہے ہوں۔ جبکہ نوریہ نے تو تین منزلہ ٹرالی پوری کی پوری سجالی تھی۔

"توبہ نوریہ! حد ہے فضول خرچی کی۔ تمہارے گھر والے ماشاء اللہ کھاتے پیتے لوگ ہیں، گھر سے بھی کھا کر آئے ہوں گے اتنا تو میں نے نصرت کو کبھی کھانے پر اہتمام نہیں کرنے دیا۔ حد ہے بھئی۔" لیکن سامنے نوریہ تھی نصرت نہیں۔

"اللہ کا شکر ہے آنٹی میرا شوہر اچھا کماتا ہے اگر میں نے تھوڑا اہتمام کر لیا تو کیا بڑی بات ہو گئی۔"

"بس بی بی! یہ اپنے شوہر کی کمائی کا زعم ہمیں نہ دکھاؤ۔" شمسہ آپا نے ہاتھ جھاڑے۔ "چلو اب اس میں سے دو چار چیزیں تو کم کرو۔" انہوں نے ٹرالی پکڑی۔ اسی وقت ظفر بھی کچن میں داخل ہوا۔

"آنٹی ایک منٹ، دیکھیں میں جو کہتی ہوں سچ کہتی ہوں منافقت مجھ سے نہیں ہوتی۔ سچ پوچھیں تو آپ کی عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے نا کہ دوسروں کی زندگیوں میں مداخلت کرنے کی۔ ظفر آپ کے بیٹوں کی جگہ ہیں جبکہ حقیقت تو یہی ہے کہ وہ آپ کے بیٹے نہیں بھتیجے ہیں۔ امی کے بیٹے ہیں۔ وہ چاہیں تو مداخلت کر سکتی ہیں لیکن انہیں دیکھیں، کتنے آرام سے لاؤنج میں بیٹھی میری ماما سے باتیں کر رہی ہیں۔" نوریہ نے دھیمی آواز میں تلخ حقیقت بیان کی۔ "تم مجھے جتلانا کیا چاہتی ہو۔ یہی کہ یہ گھر میرا نہیں۔ دیکھو ظفر اپنی بیوی کو یہ کیسی باتیں کر رہی ہے مجھ سے۔" شمسہ آپا کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

"دیکھیں پھپھو! غلطی نوریہ کی نہیں ہے۔ آپ بڑی ہیں۔ یہ بات تو آپ کے سمجھنے کی ہے۔ بہتر ہو گا اس گھر میں امن برقرار رہے اور تمہارے میرے کی باتیں نہ ہوں۔" ظفر نے دو ٹوک بات کی۔

شمسہ آپا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "تو کیا میں امن کے خلاف ہوں یا میری وجہ سے امن برباد ہو رہا ہے گھر کا۔"

"آنٹی! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں باہر جا کر چائے پینی چاہیے۔" یہ کہہ کر نوریہ اور ظفر ٹرالی لاؤنج میں لے گئے، جبکہ شمسہ آپا کے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔ ان کی راجدھانی کبھی تھی ہی نہیں۔ وہ تو صرف قابض تھیں۔ یہ حقیقت سمجھنے میں انہوں نے بہت دیر کر دی۔ نوریہ ان کی ہم پلہ تھی ان کی ٹکر کی تھی جبکہ نصرت نے سمجھوتہ کر لیا تھا اور نوریہ انہیں بہت کچھ سمجھا گئی تھی۔

☆

نگہت سیما

زمین کے آنسو

ایک فلک شاہ کو خوابوں میں اکثر ایک خوب صورت اور نشیلی آنکھوں والی لڑکی روتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس نے اسے فرضی نام "حور عین" دے رکھا ہے۔ وہ اس پر کچھ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"الریان" کے سربراہ عبدالرحمٰن شاہ ہیں۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان اور احسان (شانی) ان کے بیٹے ہیں۔ عمارہ (عمو) اور زارا ان کی بیٹیاں ہیں۔

"مراد پیلس" کے سربراہ مراد شاہ کے بیٹے سلجوق، عبدالرحمٰن کے گہرے دوست ہیں۔ سلجوق کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فلک شاہ (مومی) "الریان" آجاتے ہیں۔ وہاں ان کی سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔ احسان سے ان کی دوستی زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور عمارہ سے محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ فلک شاہ کالج میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ ... شاہ کو سلجوق کے انتقال کے بعد ان کی والدہ زریں جائیداد کے چکر میں لے جاتی ہیں مگر وہاں اس کا شوہر فیروز فلک سے چڑنے لگتا ہے۔ سلجوق کے انتقال کی وجہ سے جائیداد کے شرعی حق سے محرومی کے بعد وہ فلک شاہ کو واپس مراد شاہ کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور چھ ماہ بعد فوت ہو جاتی ہے۔

مکمل ناول



عبدالرحمٰن شاہ کی بہن مروہ کی سسرالی رشتے دار مائرہ سے ملاقات میں احسان اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ عبدالرحمٰن فلک شاہ سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں اور اپنی بیٹی عمارہ کی شادی کردیتے ہیں۔ ایک جھگڑے میں فلک شاہ "الریان" والوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرکے بہاول پور چلے جاتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ان کے بیٹے ایبک کی "الریان" میں آمد ہوتی ہے۔ احسان کی بیوی مائرہ اور بیٹی رائیل کے علاوہ سب ایبک کی آمد پر خوش ہوتے ہیں جبکہ حم احسان ایبک کا فین ہے۔ "الریان" میں رہنے والی اریب فاطمہ جو کہ مروہ پھپھو کے شوہر کی رشتے کی بھانجی ہے' ایبک سے کافی متاثر ہے۔

عمارہ اور فلک شاہ "الریان" آنے کے لیے بہت تڑپتے ہیں۔ عمارہ کو انجائنا اٹیک ہوتا ہے تو عبدالرحمٰن شاہ بھی ... ہوجاتے ہیں۔

احمد رضا اور سمیرا' حسن رضا اور زبیدہ بیگم کے بچے ہیں۔ احمد رضا بہت خوب صورت اور ہینڈسم ہے۔ وہ خوب ترقی' کامیابی اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رضا کا دوست ابراہیم اسے ایک بزرگ اسماعیل خان سے ملواتا ہے۔ ان سے مل کر رضا کو حسن بن صباح کا گمان گزرتا ہے۔

عمارہ کی طبیعت بہتر ہوتے ہی ایبک انہیں بابا جان عبدالرحمٰن شاہ کی بیماری کا بتاتا ہے۔ عمارہ یہ سنتے ہی بابا جان سے ملنے کے لیے بے چین ہوجاتی ہیں۔

احسان شاہ' فلک شاہ کو مائرہ سے اپنی محبت کا احوال سناتا ہے تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ کیونکہ مائرہ نے اس سے کھل کر اظہار محبت کردیا ہے جو کہ اس کا رشتہ عمارہ سے طے ہوچکا ہے اور وہ عمارہ سے بے حد محبت کرتا ہے۔

احمد رضا کو پولیس گرفتار کرکے لے جاتی ہے۔ اس پر الزام ہے کہ ایک شخص اسماعیل جو خود کو اللہ کا بھیجا ہوا خلیفہ کہتا ہے' لوگوں کو بہکا رہا ہے۔ احمد رضا' اسماعیل سے ملتا ہے۔ احمد رضا کو اس کے والد گھر لے آتے ہیں۔

الوینا جو اسماعیل کے ہاں احمد رضا کو ملی تھی۔ وہ اسے فون کرکے بلاتی ہے۔ وہ وہاں جاتا ہے تو اس کی ملاقات اسماعیل سے ہوتی ہے۔ اسماعیل' احمد رضا سے کہتا ہے کہ احمد رضا کو دولت' عزت اور شہرت ملنے والی ہے۔ احمد رضا مسحور ہوجاتا ہے۔ ہمدان کو عمارہ پھوپھو کی بیٹی انجی بہت پسند تھی' لیکن گھر والوں کے شدید ردعمل نے اسے مایوس کردیا۔ نئی نسل میں سے کوئی نہیں جانتا کہ عمارہ پھوپھو پر الریان کے دروازے کیوں بند ہیں۔

اریب فاطمہ مروہ پھوپھو کی سسرالی رشتہ دار ہے' جسے مروہ پھوپھو پڑھنے کے لیے الریان لے آئی ہیں' یہ بات مائرہ بھابھی کو پسند نہیں ہے۔ ایبک' عمارہ کو لے کر بابا جان کے پاس آیا تو اتنے عرصہ بعد انہیں دیکھ کر بابا جان کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ بابا جان کی طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ اسپتال میں' عمارہ کو دیکھ کر سب بہت خوش ہوتے ہیں' مگر مائرہ اور رائیل انہیں تنفر اور سخت تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ مائرہ عمارہ سے کافی بدتہذیبی سے پیش آتی ہے جبکہ احسان شاہ غصے سے منہ موڑ کر چلے جاتے ہیں۔

فلک شاہ' مروہ پھپھو سے مائرہ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ وہ فلک اور عمارہ کے فوری نکاح کا مشورہ دیتی ہیں۔ یوں مصطفیٰ اور عثمان کے ولیمہ میں ان دونوں کا نکاح ہوجاتا ہے۔ مائرہ رحیم یار خان سے مصطفیٰ کو فون کرکے اپنا نام پوشیدہ رکھ کر فلک شاہ کے خلاف بھڑکاتی ہے مگر مصطفیٰ مروہ پھپھو سے بات کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں تاہم ان کو یہ فون کال آج بھی یاد ہے۔

فلک شاہ نے حق نواز کی پارٹی باقاعدہ طور پر اختیار کرلی۔ مائرہ اور احسان کی شادی کے بعد ایک جھگڑے میں فلک شاہ بھی بھی "الریان" میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں بصورت دیگر ان کی طرف سے عمارہ کو طلاق ہوگی جبکہ احسان شاہ کہتے ہیں کہ "الریان" سے اگر کوئی "مراد پیلس" گیا تو وہ خود کو گولی مارلیں گے۔

سمیرا کو شک ہوجاتا ہے کہ احمد رضا' اسماعیل خان کے پاس اب بھی جاتا ہے تاہم احمد رضا اسے بہلا لیتا ہے اور یوں ان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ اسماعیل خان اسے ورلڈ سوسائٹی آف مسلم یونٹی کا اہم کارکن بنا کر اس سے ٹی وی سیدھے بیان دلوادیتا ہے۔ حسن رضا یہ خبر پڑھ کر احمد رضا کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔

عبدالرحمٰن شاہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو ایبک انہیں کرنل شیردل کی انیکسی میں لے آتا ہے۔ وہاں سے وہ فلک شاہ سے ملنے بہاول پور جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ احسان شاہ' مائرہ اور رائیل کے ساتھ رحیم یار خان چلے جاتے ہیں اور عمارہ سے نہیں ملتے۔ ایبک کی پیدائش کے بعد مائرہ نے احسان شاہ کے ساتھ منگنی کرتے ہوئے فلک شاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنی بے عزتی نہیں بھولی ہے اور وہ اس بات کا بدلہ ضرور لے گی۔

ایبک' اریب فاطمہ سے اظہار محبت کرتا ہے۔

حسن رضا' احمد کو گھر سے نکال کر دکھی ہوجاتے ہیں۔ تاہم انہیں احمد کی حرکت پر ملال بھی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے معافی مانگتے ہیں اور اس کے دوست ابراہیم کے ساتھ اسے ڈھونڈتے ہوئے طیب خان کی کوٹھی جا پہنچتے ہیں' مگر وہ لاعلمی کا اظہار کردیتا ہے۔ احمد رضا' الوینا کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ وہ اکثر گھر جانے کی خواہش کرتا ہے۔ مگر الوینا مختلف حیلے بہانوں سے اسے روک لیتی ہے۔ ایک پریس کانفرنس میں طیب خان اور رباب حیدر مدہوشی کی کیفیت میں احمد رضا سے اسماعیل خان کی نبوت کا بیان دلوادیتے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس بیان کی تردید کرتا ہے' مگر رچی اسے سختی سے جھٹلادیتا ہے۔

عمارہ اور ایبک کے ساتھ عبدالرحمٰن شاہ کے مراد پیلس آنے کی خوشی میں فلک شاہ خوب تیاری کرتے ہیں۔ وہ اپنے ماضی میں کھوجاتے ہیں۔ فلک شاہ' مائرہ اس کا ذکر شیردل سے کرتے ہیں۔ شیردل انہیں تسلی دیتے ہیں کہ وقتی جذباتیت ہے۔ ختم ہوجائے گی۔ ان کی پارٹی نے بہت جلد شہرت حاصل کرلی۔ حق نواز کی صحافی دوست کو چند اہم شخصیات نے اغوا کرکے قتل کردیا تھا جس کی وجہ سے حق نواز نے پارٹی چھوڑدی۔

ایبک کی پیدائش پر عمارہ بہاول پور چلی گئیں۔ ایبک ایک ماہ کا ہوا تو دادی کا انتقال ہوگیا۔ حق نواز نے دوسری پارٹی اختیار کرلی۔ فلک شاہ ان کے ساتھ تھے۔ فلک شاہ الریان کے برابر والے مکان میں رہتے تھے اور اکثر ہی الریان جاتے رہتے تھے۔ دادا جان کا بھی انتقال ہوگیا۔ عبدالرحمٰن شاہ نے احسان کی شادی کا فیصلہ کیا۔ مائرہ نے عین وقت پر شادی سے انکار کردیا۔ یہ بات مروہ پھپھو اور فلک شاہ جانتے تھے۔ رحیم یار خان میں مائرہ اچانک فلک شاہ کے کمرے میں داخل ہوئی ہے اور پرانی باتیں دہراتی ہے تاہم آخر میں احسان سے شادی پر راضی ہوجاتی ہے۔ ان دنوں ملک دشمن عناصر کی سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ حق نواز بہت پریشان رہتا تھا۔ اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ دوسری طرف مائرہ' عمارہ سے بدتمیزی سے پیش آتی تھی۔ حق نواز کہیں لاپتا ہوگیا۔ کافی دنوں بعد شیردل فون پر بتاتے ہیں کہ حق نواز زخمی حالت میں اسپتال میں ہے اور فلک سے ملنا چاہتا ہے۔ فلک پریشانی کے عالم میں تیز بخار میں پھنکتے ایبک کو الریان چھوڑنے جاتے ہیں تو ملازمہ کی اطلاع پر وہ احسان کے کمرے میں جاتے ہیں۔ مگر کمرے میں قدم رکھتے ہی مائرہ ان پر غلط الزامات کی بوچھاڑ کردیتی ہے۔ احسان شاہ' مائرہ کی بات پر یقین کرلیتا ہے۔ فلک شاہ کو صفائی دینے کا موقع نہیں ملتا۔ انہیں حق نواز کے پاس جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ وہ نیچے آتے ہیں تو بابا انہیں ڈانٹنا شروع کردیتے ہیں۔ انہیں علم ہوجاتا ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہیں۔ غصے کی کیفیت میں فلک شاہ کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ آئندہ اگر وہ الریان آئے تو عمارہ کو تین طلاق۔ حق نواز ان سے ملے بغیر مرجاتا ہے۔ جنازے میں انہیں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ وہ کئی مفتیوں اور علماء سے فتویٰ لیتے ہیں۔ ان سب کے مطابق الریان جانے کی صورت میں عمارہ ان پر حرام ہوجائیں گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے مراد پیلس چلے جاتے ہیں۔

—6—

چھٹی قسط

"تم ٹھیک تو ہو نا احمد؟" الوینا نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"الوینا! مجھے گھر جانا ہے۔"

"ہاں تو چلے جانا لیکن ..." وہ یکدم پریشان نظر

آنے لگی تھی۔

"لیکن کیا.....؟" اس نے بے چینی سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹایا۔

"وہ..... "کچھ جھجکی" آج باہر جانے میں خطرہ ہے۔ لوگ بہت غصے میں ہیں۔ وہ تمہیں۔"

"وینا! مجھے یہاں ہر شخص نہیں پہچانتا۔ کسی کو کیا خبر میں کون ہوں۔ میں کوئی ایسی وی آئی پی شخصیت نہیں ہوں..... مجھے تو میرے سارے محلے والے بھی شکلا" نہیں جانتے ہوں گے۔ کسی کو کیا خبر کہ یہ شخص جو جارہا ہے احمد رضا ہے جس نے وہ بکواس کی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن....."

"لیکن کیا وینا؟" اس نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی۔

"وہ شاید حضرت صاحب اجازت نہ دیں۔ انہوں نے منع کیا ہے باہر جانے سے۔"

"لیکن مجھے جانا ہے وینا! میرے باپ نے یہ خبر پڑھ لی تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ مرجائے گا اس غم سے کہ اس کا بیٹا۔"

"اچھا تم چلو اٹھو اپنے..... میرا مطلب ہے میرے کمرے میں چلو..... میں ابھی آتی ہوں۔ پھر کچھ کرتے ہیں۔ تم اتنے میں اپنے کپڑے وغیرہ بیگ میں رکھ لو۔"

"اچھا.....!" وہ اٹھ کر الوینا کے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے الماری میں سے اپنے کپڑے نکال کر بیڈ پر ڈھیر کردیے اور الماری کے نچلے خانے سے بیگ نکالتے ہوئے اس کی نظر اپنے اٹیچی کیس پر پڑی تھی۔ حسن رضا نے اس کی ہر چیز اس میں رکھ دی تھی۔ ہر وہ چیز جس کی اسے ضرورت ہو سکتی تھی۔

"کیا ابو مجھے معاف کردیں گے۔ کیا وہ میری بات کا یقین کرلیں گے کہ یہ سب کچھ میں نے نہیں کہا۔"

وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک وہ یونہی بیٹھا سوچتا رہا۔ اس روز ابو نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی..... اور میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی الوینا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھا۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جانا چاہا لیکن دروازہ باہر سے لاک تھا۔ وہ دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے ششدر سا کھڑا تھا۔ ایک بار پھر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ ناب کو ادھر ادھر گھمایا اور پھر الجھا الجھا سا واپس بیڈ پر آکر بیٹھ گیا۔ بیڈ پر بکھرے کپڑے ایک طرف کرکے بیگ نیچے بیڈ کے پاس رکھ کر وہ لیٹ گیا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔

کیا کہیں اس سے کچھ غلط ہو گیا تھا۔

اور یہ غلطی کہاں تھی۔

وہ آنکھیں موندے سوچنے لگا۔

اس دن سے جب وہ پہلی بار ابراہیم کے ساتھ اسماعیل خان کے پاس آیا تھا..... آج تک اس نے ہر بات سوچ لی تھی لیکن اسے کہیں کچھ غلط نظر نہیں آیا تھا۔ بس یہ ایک بیان جو اس سے غلط منسوب کردیا گیا تھا۔ اسماعیل خان اچھا آدمی تھا۔

شاید کوئی بزرگ۔

کوئی ولی۔

لیکن نعوذباللہ وہ پیغمبر کیسے ہو سکتا ہے اور اس نے تو ایسا کوئی دعوا بھی نہیں کیا۔

اس نے کروٹ بدلی اور ایک بار پھر اسماعیل خان سے اب تک ہونے والی گفتگو دل ہی دل میں دہرانے لگا اور یوں ہی سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ اس کی آنکھ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے کھلی تھی۔

اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بڑی میز پر دو ڈونگے اور پلیٹیں رکھی تھیں۔ الوینا ایک ڈونگے کا ڈھکن اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ مسکرائی۔

"منہ ہاتھ دھو کر فٹافٹ آجاؤ۔"

وہ خاموشی سے اٹھ کر واش روم چلا گیا۔ واپس آیا تو میز پر کچھ اور بھی لوازمات رکھے تھے۔ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ الوینا نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔

"تم بغیر کچھ کھائے پیے سو گئے تھے۔ میں آئی تھی

نہیں بلانے" تم سو رہے تھے میں نے جگایا نہیں۔ بہت سوئے تم۔ چھ بج رہے ہیں شام کے۔"

"اس زندان میں دن رات کا پتا ہی نہیں چلتا۔"

لہجے میں ہلکی سی تلخی در آئی تھی۔ الوینا نے اس کی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"تم خود کو یہاں قید سمجھتے ہو احمد!" وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"کیا ایسا نہیں ہے؟"

"نہیں بالکل بھی نہیں۔" الوینا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "اگر آج تمہیں حضرت جی نے باہر جانے سے منع کروایا تھا تو صرف تمہارے بھلے کے لیے۔ ایک دو روز میں لوگوں کا جوش و خروش ختم ہو جائے گا تو چلے جانا۔"

اس نے کھانا کھاتے کھاتے الوینا کی طرف دیکھا۔

"پھر کمرا باہر سے لاک کیوں تھا؟"

"ہرگز نہیں..... تم سے کس نے کہا کہ کمرا باہر سے لاک تھا۔" الوینا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں نے کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بند تھا۔"

"اوہ مائی گاڈ! تم غلط فہمی کا شکار ہو۔ اس کمرے کا لاک خراب ہے۔ بعض اوقات خود بخود لاک ہو جاتا ہے اور پھر اندر سے نہیں کھلتا۔ جب سے ہم ادھر شفٹ ہوئے ہیں تب ہی سے ایسا ہے۔ تم جانتے ہو حضرت جی کی سیکیورٹی کے خیال سے ہم کسی لاک ٹھیک کرنے والے کو ادھر نہیں لاسکتے ابھی۔"

احمد رضا نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس نے سوچا ضرور تھا کہ اتنے دنوں سے وہ یہاں ہے۔ پہلے تو کبھی کمرا خود بخود لاک نہیں ہوا تھا۔

"تم بدگمان ہو رہے ہو ہم سے نا" تو ٹھیک ہے تم کھانا کھالو۔ میں تمہیں خود گیٹ تک چھوڑ کر آتی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیلی تھی۔

"ایسا نہیں ہے وینا۔ میں بدگمان نہیں ہوں۔" وہ کھسیایا۔

"لیکن میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ تم جانتی ہو ابو مجھ سے پہلے ہی خفا ہیں۔ اس بیان کے بعد تو وہ مزید ناراض ہو جائیں گے۔ اور مجھے گھر میں کبھی گھسنے نہیں دیں گے لیکن اب کی بار میں بھی وہاں دھرنا دے کر بیٹھ جاؤں گا۔ امی اور سمیرا ہیں نا میری سفارش کرنے کو۔"

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"کہو تو میں بھی چلوں تمہارے ساتھ تمہاری سفارش کرنے کو۔"

"نہیں..... نہیں ابھی نہیں۔" وہ گھبرایا۔

الوینا بے اختیار ہنس دی۔ اور وہ دم بخود سا ہو کر اس کے ہموار دانتوں کو دیکھنے لگا۔ اس وقت وہ ساڑھی میں ملبوس تھی اور اس کے نازک سراپے پر گہرے اور میرون شیڈ والی ساڑھی بے حد جچ رہی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر کل چلے جانا۔"

"کل۔" اس نے الوینا کی طرف دیکھا۔

"ہاں آج حضرت صاحب پردے سے نکل آئے ہیں۔ کل شام یہاں ایک بڑی تقریب ہے دوسری بلڈنگ کے ہال میں کچھ لوگ حضرت جی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور اسلام قبول کرلیں گے۔"

"کون رچی وغیرہ؟"

"شاید وہ بھی، کچھ اور لوگ بھی ہیں۔" اس تقریب میں شرکت کرکے چلے جانا۔ پرسوں صبح کی کسی فلائٹ سے حضرت جی بھی چلے جائیں گے یہاں سے دبئی اور وہاں سے شکاگو۔"

"اور تم بھی ان کے ساتھ جاؤ گی؟"

"ہاں!" الوینا نے کبابوں کی ڈش اس کی طرف بڑھائی۔ "یہ لو نا....."

"نہیں تھینک یو۔"

وہ افسردہ سا ہو گیا تھا۔ بھوک ایک دم مرگئی تھی۔ یہ افسردگی گھر نہ جاسکنے کی تھی یا الوینا سے بچھڑنے کی' وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔

"ابھی ڈنر میں تو بہت دیر ہے۔ میں نے تمہارے لیے اسپیشل کہہ کر بنوائے ہیں۔ تم نے صبح سے کچھ کھایا جو نہیں تھا۔"

وہ بہت محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے

بے دلی سے ایک کباب اٹھا کر پلیٹ میں رکھ لیا۔
"تو پھر کل تقریب کے فوراً" بعد میں چلا جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" الوینا مسکرائی تو اس کی نظریں الوینا کی طرف اٹھیں اور وہ مسحور سا اسے دیکھتا رہا۔ ایک رات اور الوینا کے سنگ۔

اندر کہیں خوشی کا جلترنگ سا بجا تھا اور افسردگی کا غبار چھٹنے لگا تھا۔۔۔ کل۔۔۔ صرف ایک دن کی تو بات ہے۔ اس نے خود کو مطمئن کر لیا تھا۔

اب وہ پوری طرح الوینا کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اور اس کی نظریں بار بار اس کا طواف کر رہی تھیں۔
"بہت پیاری لگ رہی ہو۔"
ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ مسلسل اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔
"جلدی آنا وینا۔۔۔!"
جب وہ برتن سمیٹ رہی تھی تو اس نے کہا۔ تو الوینا نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چلی گئی۔ اب وہ صرف الوینا کے متعلق سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام کے چھ بجے حسن رضا بے حد تھکے اور نڈھال سے سر جھکائے اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ دور دور تک بس کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد پیچھے ہٹ کر بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔ وہ صبح سات بجے گھر سے نکلے تھے لیکن دفتر نہیں گئے تھے۔ بہت دیر تک وہ ایک دوکان کے تھڑے پر بیٹھے رہے۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کا دماغ خالی ہو گیا ہو اور وہ کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔

انہوں نے دوبارہ کوٹ کی جیب سے وہ مڑا تڑا اخبار نکال کر دیکھا اور پھر یونہی واپس جیب میں رکھ لیا۔ گلی میں چہل پہل شروع ہوئی تو وہ اٹھ کر اسٹاپ کی طرف چل دیے تھے۔ پھر بس آئی تو وہ بس میں بیٹھ گئے۔ سر نیچے کیے پیشانی پر ہاتھ کا چھجا سا بنائے جیسے انہیں ڈر ہو کہ لوگ انہیں دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ احمد رضا کا باپ ہے۔ پھر یونہی ان کا اسٹاپ گزر گیا اور انہیں پتا نہ چلا۔۔۔ آخری اسٹاپ پر کنڈیکٹر نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"صاحب! اترنا نہیں ہے۔"
"ہاں۔۔۔!" انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔
"ارے آپ میاں صاحب! آپ کا دفتر تو پچھلے اسٹاپ پر تھا۔" ہر روز آنے جانے کی وجہ سے کنڈیکٹر انہیں پہچانتا تھا۔
"ہاں بس وہ آج ادھر ہی آنا تھا۔" وہ تیزی سے اتر گئے۔ کچھ دیر فٹ پاتھ پر بے دھیانی سے کھڑے رہے پھر ایک رکشا روکا اور اس سے اخبار کے دفتر میں چلنے کو کہا۔

اخبار کے دفتر میں پہلے تو کسی نے ان کی بات نہ سنی۔ بڑی مشکل سے ان کی ایڈیٹر تک رسائی ہوئی۔ وہ صحافیوں کی بڑی عزت کرتے تھے اور اپنے دل میں انہیں بڑا اعلا مقام دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے ہاتھ میں قلم تھا اور ہر قلم تھامنے والا ان کے نزدیک بہت قابل احترام تھا لیکن یہاں آکر ان کے رویّے سے ان کے احساسات کو بہت ٹھیس پہنچی تھی اس لیے جب وہ ایڈیٹر کے سامنے آئے ان کی آنکھیں ان کے رویے سے بھی نم ہو رہی تھیں۔
"یہ کانفرنس کہاں ہوئی تھی؟"
انہوں نے مڑا تڑا اخبار کھول کر ایڈیٹر کے سامنے رکھا تو ایڈیٹر نے مشکوک نظروں سے انہیں دیکھا۔
"کیا آپ اس جھوٹے نبی کو قتل کرنا چاہتے ہیں؟"
"میں ایک کمزور ایمان رکھنے والا آدمی ہوں۔ کچھ بھی سوچنے سے پہلے میرے سامنے میری بچی اور بیوی آجاتی ہے، جو میرے بعد بے سہارا اکیلی رہ جائیں گی۔۔۔۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں جو بے خطر آتش نمرود میں کود جاتے ہیں۔"
ان کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے۔ جنہیں انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے پونچھا۔
"تو پھر آپ اس جگہ کا پتا کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں؟" وہ اب بھی مشکوک نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔
"میرا بیٹا!" انہوں نے ایک گہری سانس لی۔
"وہ اس کے مریدوں میں شامل ہو گیا ہے۔ میں اسے ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔" ان کی نظریں جھک گئیں۔ ان کے چہرے پر چھائی بے بسی ان کی آنکھوں میں پھیلی نمی نے ایڈیٹر کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔ اس نے ترحم بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور گھنٹی بجا کر اس صحافی کو بلایا جو اس پریس کانفرنس کی رپورٹنگ کرنے گیا تھا۔ اس نے انہیں اس بلڈنگ کا اتا پتا سمجھا دیا تھا۔
"آپ تو بڑے معقول آدمی لگتے ہیں۔ آپ کا بیٹا کیا اتنا نا سمجھ تھا کہ جھوٹ اور سچ میں فرق نہیں جان سکا؟"
"میرا بیٹا یو۔ ای۔ ٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اسکالرشپ ہولڈر۔"
وہ بات کرکے رکے نہیں تھے اور تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔ ایڈیٹر حیرت اور دکھ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

اس بلڈنگ کے جس ہال میں کانفرنس ہوئی تھی، وہ صرف ایک دن کے لیے کرائے پر لیا گیا تھا۔ یہ ہال اسی مقصد کے لیے تھا۔ اکثر سیمینار وغیرہ کے لیے این جی اوز یا کوئی ادارہ کرائے پر لے لیتا تھا۔ وہ دل گرفتہ سے بلڈنگ سے باہر نکل آئے تھے اور ایک بار پھر طیب خان کی رہائش گاہ کی طرف جا رہے تھے۔۔۔ شاید۔۔۔
چوکیدار نے بتایا کہ طیب خان تو پشاور گیا ہوا ہے۔ پھر انہیں پہچان کر بولا۔
"آپ وہی ہیں نا ایک بار پہلے بھی آئے تھے ایک لڑکے کے ساتھ۔"
"ہاں۔" وہ کوٹھی کے باہر بنے چبوترے پر بیٹھ گئے۔

"آپ کو کیا کام ہے طیب خان سے؟"
چوکیدار نے پوچھا تو کچھ سوچ کر انہوں نے وہی بات دہرا دی جو اخبار کے دفتر میں کہی تھی۔ چوکیدار لمحہ بھر کچھ سوچتا رہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ "آپ کل تین بجے آئیے گا۔ مجھے چھٹی پر جانا ہے۔ میں آپ کو لے چلوں گا وہاں جہاں وہ خبیث رہتا ہے۔ بس اب جائیں۔"
وہ کچھ کہنا چاہتے تھے پوچھنا چاہتے تھے کہ وہ زبانی پتا سمجھا دے، وہ ڈھونڈ لیں گے لیکن چوکیدار نے اندر جا کر گیٹ بند کر لیا تھا۔ وہاں سے وہ واپس گھر جانے کے لیے اٹھے تھے لیکن پھر تھوڑا آگے جا کر اسٹاپ پر موجود بینچ پر بیٹھ گئے تھے اور ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔ آس پاس موجود ایک دو پھل بیچنے والے خوانچہ فروشوں نے دو تین بار انہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔ دو نوجوان ان کے پاس آکر کھڑے ہو گئے تھے وہ دونوں اسماعیل خان کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ ایک بہت جذباتی ہو رہا تھا۔
"میرا دل چاہتا ہے وہ کم بخت مجھے مل جائے تو اسے جہنم رسید کر دوں اپنے ہاتھوں سے۔"
انہوں نے بڑی حسرت سے ان لڑکوں کو دیکھا۔
"کیسے خوش نصیب باپ کی اولاد ہیں۔"
وہ اٹھ کھڑے ہوئے بس آگئی تھی۔ ان کا جی چاہا وہ اس لڑکے کی پیشانی چوم لیں۔ جو اب بھی جوش و خروش سے اسے جہنم رسید کرنے کی باتیں کر رہا تھا لیکن وہ اسے حسرت سے دیکھتے بس کی طرف بڑھ گئے۔ جب وہ اپنی گلی میں داخل ہوئے تو انہوں نے سمیرا کو گیٹ کھول کر گلی میں پریشانی سے تکتے پایا۔۔۔ پھر سمیرا کی نظر ان پر پڑی اور اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ وہ یکدم ہی گیٹ سے باہر نکل آئی۔
"ابو! آپ آگئے۔ بہت دیر کر دی آپ نے؟"
"ہاں کام زیادہ تھا۔" وہ اس کے ساتھ اندر چلے آئے۔
اگلی صبح وہ دفتر نہیں گئے تھے۔ سارا دن کمرے میں لیٹے رہے۔ زبیدہ نے انہیں لیٹے دیکھا لیکن کچھ پوچھا نہیں۔ سمیرا کالج جا چکی تھی۔
ایک بجے کے قریب وہ اٹھے تھے۔ زبیدہ کچن میں کھانا بنا رہی تھیں۔
"زبیدہ۔۔۔!" انہوں نے کچن کے دروازے کے

قریب جا کر کہا۔ زبیدہ نے آلو چھیلتے ہوئے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"زبیدہ! مجھے معاف کر دینا میں نے شاید تمہارے بیٹے کے ساتھ زیادتی کی۔"

"وہ صرف میرا بیٹا نہیں تھا۔"

"ہاں!" ان کا سر جھکا ہوا تھا۔

"میرا بھی تھا، پھر بھی تم ماں ہو۔ مجھ سے زیادہ اس سے محبت کرتی ہو گی۔ اس لیے مجھے معاف کر دینا کہ ......"

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"شاید آپ نے اپنی طرف سے جو بہتر سمجھا وہ کیا۔"

پہلی بار زبیدہ نے اس طرح کی بات کی تھی، شاید سمیرا انہیں اخبار کی خبر کے متعلق بتا چکی تھی۔ مزید کوئی بات کیے بغیر وہ کچن کے پاس سے ہٹ آئے تھے۔ کچھ دیر تخت پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے وضو کر کے نماز پڑھی جب وہ نماز پڑھ رہے تھے سمیرا بھی آگئی تھی اور تخت پر بیٹھی انہیں تسبیح پڑھتے دیکھ رہی تھی۔

"ابو! آپ دفتر نہیں گئے؟"

وہ نماز پڑھ چکے تو اس نے پوچھا۔

"ہاں اپنی ماں کا خیال رکھنا۔ میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔"

"کیا ہوا امی کو؟" وہ گھبرا گئی۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن ......" پھر بات ادھوری چھوڑ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد وہ طیب خان کی کوٹھی کے باہر کھڑے تھے۔ چوکیدار نے باہر نکل کر انہیں دیکھا تھا۔

"صاحب! آپ اسٹاپ پر میرا انتظار کرو۔"

چوکیدار کے ساتھ وہ دو بسیں بدل کر یہاں پہنچے تھے وہاں سے پیدل وہ بانس بازار کے رش میں سے گزر کر ایک تنگ گلی میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے دور سے ایک طرف اشارہ کیا۔ "وہ اس گلی میں دوسرا مکان ہے۔ آج کل وہ یہاں چھپا ہوا ہے۔ آپ کا بیٹا بھی ادھر ہی ہو گا۔ آج یہاں سے انہیں کہیں جانا ہے ادھر بڑی تقریب ہے۔ آپ یہاں بیٹھ جاؤ۔ آپ کا بیٹا نکلا تو بات کر لینا...... مان گیا تو ساتھ لے جانا۔ کیونکہ مکان کے اندر نہیں جا سکو گے اندر گن مین ہوں گے...... خیر میں چلتا ہوں۔ کسی کو میرے متعلق مت بتانا اپنے بیٹے کو بھی نہیں...... یوں ظاہر کرنا جیسے اتفاق سے ادھر آ نکلے ہو۔ یہاں پیچھے تھوڑی سی کھلی جگہ ہے وہاں ان کی گاڑیاں کھڑی ہوتی ہیں۔ کسی چائے وغیرہ کے ہوٹل پر بیٹھ جاؤ۔ وہ ٹھیک پانچ بجے یہاں سے نکل کر جائیں گے...... وہ جگہ بھی نزدیک ہی ہے۔"

انہوں نے چوکیدار کی ساری باتیں دھیان سے سنی تھیں اور اس کا شکریہ ادا کر کے وہ کھلی جگہ پر پڑے ہوئے کوڑے دان کے پیچھے زمین پر پڑے ایک پتھر پر بیٹھ گئے تھے۔ ان کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ جب بھی آہٹ ہوتی وہ تھوڑا سا جھانک کر دیکھ لیتے...... اس جگہ لوگوں کی آمد و رفت کم ہی تھی۔ ایک بار ایک لڑکا کوڑا پھینکنے آیا تھا۔ ایک بار سائیکل پر کوئی گزرا تھا اور پھر انہوں نے اسے دیکھا۔

اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ وہ کتنے دنوں بعد احمد رضا کو دیکھ رہے تھے۔ اس کے پیچھے دو یا تین افراد اور تھے پھر ایک لڑکی تھی۔ وہ کھڑے ہو گئے تھے۔

وہ لمحہ بھر کے لیے رک کر پیچھے دیکھنے لگا تھا۔ انہوں نے اپنا سر پیچھے کر لیا تھا۔ وہ تقریباً کوڑا دان کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنی جیب کو تھپتھپا کر اپنے پسٹل کی موجودگی کو محسوس کیا اور پھر ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ وہ اب پھر ساتھ والی لڑکی سے کچھ کہتا وہاں کھڑی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت خوبرو لگ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بڑا سنجیدہ لگا تھا۔ انہوں نے فوراً اس کے چہرے سے نظریں ہٹا لی تھیں اور اب جیب سے اپنا پسٹل نکال کر انہوں نے مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگے تھے۔ صرف چند قدم

فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھا تھا اور انہوں نے مضبوطی سے دانت دانتوں پر جمائے انہوں نے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

ایبک اریب فاطمہ سے بات کر کے وہاں رکا نہیں تھا اور انیکسی کے لکڑی کے منقش دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے خیال آیا تھا کہ وہ تو سب کے لیے کولڈ ڈرنکس لینے نکلا تھا۔

اپنے سر پر ہولے سے ہاتھ مارتا ہوا وہ پلٹا تھا۔ اریب فاطمہ ابھی تک وہیں گیٹ سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

"اوہ مائی گاڈ! اس لڑکی کی آنکھیں ہیں یا سمندر۔"

"آپ آخر اس طرح اور اس قدر کیوں رو رہی ہیں۔ اب کم از کم یہاں اس گھر میں کوئی خطرہ نہیں ہے اور اگر آپ واپس جانا چاہتی ہیں تو میں عمر سے کہتا ہوں۔ وہ آپ کو چھوڑ آتا ہے۔ لیکن بخدا! روئیں تو مت۔"

اریب فاطمہ نے بے حد شاکی نظروں سے اسے دیکھا اور ہاتھوں کی پشت سے رخسار رگڑ ڈالے۔

"اگر میری کوئی بات آپ کو بری لگ گئی ہے تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ یقین کریں مس اریب فاطمہ! میرے لیے آپ اتنی ہی محترم اور عزیز ہیں جتنی منیبہ، مرینہ، حفصہ اور میں آپ سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی "الریان" کے لوگوں سے کرتا ہوں۔ میں آپ کے لیے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ڈر گیا تھا، آپ یوں اکیلی چل پڑیں گھر سے۔ میں کسی کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا اور "الریان" سے وابستہ لوگوں کی آنکھوں میں تو بالکل بھی نہیں۔ "الریان" سے میرے بابا کو عشق ہے اور مجھے اپنے بابا سے عشق ہے۔"

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور اریب فاطمہ کی آنکھوں میں پھر نمی پھیلتی چلی گئی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے کیا سمجھا تھا۔ وہ بھی نری احمق اور بے وقوف ہے۔ بھلا کہاں ایبک فلک شاہ اور کہاں وہ۔

اس نے اتنی سی دیر میں جانے کیا کیا سوچ ڈالا تھا۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا محسوس ہوا لیکن اس نے زبردستی اپنی آنکھوں میں امڈ آنے والے آنسوؤں کو پیچھے دھکیلا اور ایک بار پھر شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

کیا تھا اگر وہ کچھ دن اپنی بات کی وضاحت نہ کرتا تو وہ اس خوش فہمی میں رہتی کہ وہ اتنا دلکش انسان......

"آپ اس طرح مجھے دیکھیں گی تو مجھے اپنا آپ مجرم لگنے لگے گا۔" ایبک کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے فوراً گھبرا کر نظریں جھکالیں۔

"نہیں...... نہیں۔ میں نے آپ کی تو کسی بات کا برا نہیں مانا...... مجھے تو بس ڈر لگ رہا تھا۔"

"کس سے، مجھ سے؟"

"نہیں بھلا آپ سے کیوں ڈر لگے گا۔" اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر فوراً ہی نظریں جھکالیں۔

"تو پھر کس سے ڈر لگ رہا تھا آپ کو؟" وہ جیسے فرصت سے کھڑا تھا۔

"مائرہ آنٹی سے۔"

"لیکن میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ یہاں نہیں ہیں رحیم یار خان گئی ہیں۔"

"تو اسی لیے تو ڈر لگ رہا ہے کہ وہ وہاں۔" اس وقت اس کے چہرے پر اتنی معصومیت تھی کہ ایبک ایک ٹک اسے دیکھے گیا اور وہ بات کرتے کرتے اٹک گئی۔ ایبک نے فوراً نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

"وہ وہاں کیا کریں گی ایسا جو آپ کو خوف زدہ کر رہا ہے؟" ایبک نے اسے اٹکتے دیکھ کر پوچھا۔

"وہ وہاں سے ہمارے گاؤں جا سکتی ہیں۔"

"تو کیا آپ کے گاؤں میں کرفیو لگا ہوا ہے۔ آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں جا سکتا۔"

"نہیں، نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ میرے ابا اور اماں سے شکایت لگائیں گی کہ میں یہاں پڑھنے نہیں آئی بلکہ۔" اور آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"میں نے مروہ آنٹی سے کہا بھی تھا کہ مجھے ہاسٹل میں داخل کروا دیں لیکن وہ کہتی تھیں۔ "الریان" میں سب میرا خیال رکھیں گے۔ بہت محبتیں ملیں گی اعتماد پیدا ہوگا۔"

"تو کیا "الریان" میں سب آپ کا خیال نہیں رکھتے؟" ایبک نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"رکھتے ہیں۔ بہت رکھتے ہیں لیکن وہ مائرہ آنٹی۔" اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے جو بہتے ہی چلے آ رہے تھے۔

اس روز مائرہ آنٹی نے کتنی بے عزتی کی تھی اس کی۔ وہ اسپتال سے گھر آئی تھی اور منیبہ کے کمرے میں کتابیں کھولے بیٹھی تھی جب مائرہ اندر آئی تھیں۔

"فاطمہ......!" ان کی آنکھوں میں غصہ اور ناراضی تھی۔

"جی!" وہ یک دم گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ اور میری بات دھیان سے سنو۔ تم یہاں پڑھنے آئی ہو۔ مروہ مامی نے تمہیں یہاں بھیجا ہے تو صرف پڑھائی سے مطلب رکھو۔ کوئی اور گل نہ کھلا بیٹھنا۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے خاندان کی بے عزتی ہو "الریان" میں۔ بدقسمتی سے تمہارا تعلق میرے خاندان سے ہے۔"

"لیکن میں نے تو کچھ ایسا نہیں کیا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا۔

"نہیں کیا تو کر لو گی۔ یہ ہمدان سے ملنے ہاسپٹل کیوں گئی تھیں تم......؟"

"ہمدان سے؟" وہ سٹپٹا گئی تھی۔ "نہیں تو۔ میں تو...... آپ کو بتایا تھا نا میں نے۔"

"مجھے کیا خبر سچ کہہ رہی تھیں یا جھوٹ۔" انہوں نے کندھے اچکائے۔

"بہرحال آئندہ میں تمہیں ہمدان یا کسی لڑکے سے فری ہو کر بات کرتے نہ دیکھوں۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ ہمدان کو پھنسا لو گی اپنی معصومیت سے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ ہمدان اور رابیل کی بات تقریباً طے ہے۔ بڑوں میں بات طے ہو چکی ہے۔ بچوں تک ابھی نہیں پہنچا۔ اور مجھے ذرا سی بھی تمہاری شکایت ملی تو میں تمہارے ماں باپ سے بات کروں گی کہ وہ بلا لیں تمہیں یہاں سے۔"

"نہیں۔" وہ خوف زدہ سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

اور وہ اس پر خونخوار سی نظر ڈالتی باہر چلی گئی تھیں۔ وہ بہت ڈر گئی تھی۔ اعلا تعلیم حاصل کرنا صرف اس کا ہی نہیں، اماں کا خواب بھی تھا...... اور وہ اپنے خوابوں کی موت تو برداشت کر سکتی تھی لیکن اماں کے خواب۔

ایبک بہت غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ یقیناً "مائرہ ممانی نے کوئی غلط بات ہی کی ہو گی۔ وہ سمجھ سکتا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ مائرہ مامی نے یوں ہی کہہ دیا ہو گا کچھ...... ان کی عادت ہے۔ وہ بعض اوقات یوں ہی بول جاتی ہیں۔ آپ دل پر نہ لیں...... وہ آپ کے گاؤں نہیں جائیں گی۔" اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر ایبک کو دیکھا۔

"آپ کو کیسے پتا کہ وہ نہیں جائیں گی۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اماں سے اور ابا سے میری شکایت لگائیں گی کہ میں......" وہ پھر اٹک گئی تھی۔

ایبک مسکرایا تھا۔

"مجھے پتا ہے کہ وہ نہیں جائیں گی آپ کے گاؤں اور اب پلیز یہ آنسو صاف کرلیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کا رونا نہیں سہہ سکتا۔"

"جی!" اس نے فوراً ہی دونوں ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کیا اور پھر چادر کے پلو سے رگڑ ڈالا۔

"آیئے میں آپ کو اندر چھوڑ آؤں۔"

"نہیں۔" اس نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ "میں جا رہی ہوں۔"

وہ تیز تیز چلتی ہوئی انیکسی کی طرف جا رہی تھی اور اس کی سیاہ چادر کا پلو زمین کو چھو رہا تھا۔

بالکل ایسے ہی بالکل یونہی۔

اس کی کہانی کی ہیروئن کی طرح۔

وہ جب اپنی کہانی کی ہیروئن کا سراپا لکھ رہا تھا تو اس

کے سامنے شاید اریب فاطمہ تھی۔
ویسی ہی بھیگی بھیگی آنکھیں۔
اور ان غزال آنکھوں میں ٹھہرا سہم۔
وہ وہیں گیٹ کے پاس پڑی چوکیدار کی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ انیکسی کی طرف مڑتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر فوراً" ہی چہرہ موڑ لیا تھا۔
ایبک کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
یہ لڑکی..... اس لڑکی میں ایسا کیا ہے۔ جو براہ راست دل پر ضرب لگاتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے اسے روتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکل گیا تھا۔
"میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اریب فاطمہ!"
اپنے الفاظ پر وہ خود ہی حیران رہ گیا تھا اور اب اسے یونہی روتے دیکھ کر اس نے وضاحت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن خود اس کا دل اپنی وضاحت سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔ آج سے پہلے تو ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی سے ایسی بات کہتا۔ پھر آج ہی کیوں۔ تو کہیں وہ سچ مچ تو اریب فاطمہ سے...
اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔
صرف چند ملاقاتوں میں کیا کوئی کسی سے محبت کر سکتا ہے۔ بغیر جانے بغیر سمجھے۔
"بہرحال!" اس نے ہولے سے سر کو جھٹکا "کچھ بھی ہو' اس لڑکی میں مقابل کو متاثر کرنے کی زبردست صلاحیت ہے۔"
تب ہی اس کی نظر کرنل شیر دل کے گھر کی طرف سے آتے عمر احسان پر پڑی۔ اس کے ساتھ کرنل شیر دل کا ملازم چائے کا سامان اٹھائے چلے آ رہا تھا۔
"ارے ایبک بھائی! آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟" عمر نے ملازم کو انیکسی کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود گیٹ کی طرف ایبک کے پاس آیا تھا۔ ایبک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"بس یونہی بیٹھ گیا تھا۔" وہ کھڑا ہو گیا۔
عمر احسان کی آنکھوں میں حیرت تھی "آپ تو کولڈ ڈرنکس لینے گئے تھے۔"
"اوہ ہاں' بس جا رہا تھا۔" ایبک نے گیٹ پر ہاتھ رکھا۔
"لیکن اب تو چائے بن گئی ہے۔ چلیں ادھار رہا آپ پر' پھر کبھی سہی۔ اس وقت تو گرما گرم چائے کے ساتھ گرما گرم چکن رول اور پکوڑے' سموسے اور زبردست قسم کا چاکلیٹ کیک کھائیے آکر..... آنٹی شیر دل نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔ چکن رول اور سموسے فریز کر رکھے تھے اور پکوڑے ابھی ابھی تلے ہیں اور اس وقت مزید کچھ مل رہی ہیں۔"
"اچھا؟" ایبک مسکرایا تھا۔ "اتنی سی دیر میں آنٹی سے دوستی کر لی۔"
"ہاں آنٹی شیر دل تو بہت کیوٹ سی ہیں۔"
"آنٹی شیر دل" کی اصطلاح پر ایبک کو ہنسی آئی تھی۔ وہ عمر احسان کے ساتھ باتیں کرتا جب انیکسی میں آیا تو منیبہ اور حفصہ سب کو پلیٹیں سرو کر رہی تھیں۔ بڑی پھرتی کے ساتھ انہوں نے سٹنگ میں موجود چھوٹی گول ڈائننگ ٹیبل پر سب ڈشز رکھوا دی تھیں اور اب ایک ایک ڈش اٹھا کر سب کو پیش کر رہی تھیں اور اس میں تو کوئی شبہ نہیں تھا کہ "الریان" کی لڑکیوں میں بلا کا سلیقہ اور سگھڑپن تھا۔ سوائے رابیل کے۔
ایبک فلک شاہ نے سوچا اور بابا جان والے بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے تھوڑا سا کھسک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔
"کونے میں کیوں ٹک گئے ہو' ایزی ہو کر بیٹھو بیٹا!"
بابا جان نے اپنے خوب صورت نواسے کو دیکھا تھا اور پھر فوراً" ہی نظریں اس کے چہرے سے ہٹالی تھیں مبادا ان کی نظر لگ جائے۔
"میں ٹھیک ہوں بابا جان!" منیبہ شاہ نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی۔
"تھینک یو۔" ایبک شاہ نے پلیٹ لے لی تھی اور اب حفصہ رول اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اس نے ایک رول اٹھا لیا۔
"بیٹا! تم خود بھی کچھ لے لونا۔ ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"
"آپ کو پتا ہے پھپھو!" عمر احسان نے سموسہ اٹھاتے ہوئے کہا۔
"مونی آپا اور حفصہ آپا "الریان" کی وہ ہستیاں ہیں جو دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتی ہیں۔"
بابا جان نے محبت سے انہیں دیکھا۔
"مونی بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔ مرتضیٰ بھی بچپن میں ایسا ہی تھا..... اپنے حصے کی چیزیں چھوٹے بہن بھائیوں کو کھلا کر خوش ہوتا تھا۔"
"تو پھر مرتضیٰ ماموں پاکستان کیوں نہیں آتے کبھی؟"
عمارہ سے جڑی بیٹھی عاشی نے بابا جان سے پوچھا۔
"تاکہ وہ پاکستان آکر اپنے حصے کی چیزیں سب چھوٹوں میں بانٹ دیں۔"
زبیر احسان کو اس کی بات پر بے تحاشا ہنسی آئی عاشی نے ناراضی سے اسے دیکھا۔
"زبیر بھائی! آپ کے پاس تو سینس ہی نہیں ہے۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" اب کے عمر احسان کا قہقہہ بہت بلند تھا۔
"شیور!" اس نے زبیر احسان کو انگوٹھا دکھایا تھا۔
"ہماری عاشی گڑیا تو بہت ذہین ہے۔"
"پھر آپ کا کیا مطلب تھا عاشی رانی؟"
ایبک نے تھوڑا سا آگے جھک کر عاشی کے رخسار کو دو انگلیوں سے چھوا۔
"مرتضیٰ ماموں اتنے لونگ' اتنے کیئرنگ ہیں تو یہاں کیوں نہیں رہتے "الریان" میں ہم سب کے ساتھ۔ بابا جان کے ساتھ..... میں نے تو کبھی انہیں نہیں دیکھا جب سے "الریان" میں آئی ہوں دو سال سے۔"
عثمان شاہ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
"کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں میری جان! جاب کی' زندگی کے سیٹ اپ کی۔ وہ "الریان" سے دور نہیں جانا چاہتا تھا لیکن۔"
"الریان" سے تو کبھی کسی نے دور نہیں جانا چاہا تھا۔ اس کے بابا جان نے بھی نہیں۔" ایبک نے افسردگی سے سوچا۔
اور وہ بھی "الریان" سے دور ہوئے بھی نہیں تھے۔ وہ بہاول پور میں رہ کر بھی "الریان" میں سانس لیتے تھے اور ان سے زیادہ کس نے "الریان" کو چاہا ہو گا بھلا۔
"بابا جان! عاشی کو تو مجھے دے دیں۔ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی..... ہماری زارا کی نشانی ہے۔ اپنی جان سے بڑھ کر چاہوں گی اسے اور موی کا تو آپ کو پتا ہے نا' ہمیشہ بہنوں کی طرح چاہا زارا کو' بہنوں جیسا ہی مان دیا اسے۔ زارا کو اس دنیا سے گئے دو سال ہو گئے' ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب موی نے زارا کو یاد نہ کیا ہو۔"
"ہاں' میرے بعد لے جانا اسے۔ اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔ سوچتا تھا میرے بعد کیا ہو گا اس کا..... کون خیال رکھے گا اس کا۔ یہ بچیاں تو کل اپنے گھروں کی ہو جائیں گی اور..... میری عاشی سات سال کی عمر میں ماں سے تو محروم ہوئی ہی۔ باپ نے بھی بھلا دیا۔"
"بابا جان! آپ نے پھر وہی باتیں شروع کر دیں۔"
عمارہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
"یہ زندگی کی حقیقت ہے بیٹا! جانا تو ہے نا سب نے اور ہم تو عمر کی اس منزل پر ہیں کہ سامان باندھے بیٹھے ہیں۔ جانے کب گاڑی آجائے۔ بس بیٹا! جب تک زندہ ہوں' عاشی کو اپنے پاس رکھوں گا۔ اس کی صورت میں تم دونوں کی صورتیں دیکھتا ہوں۔" ماحول میں یکدم افسردگی سی پھیل گئی تھی۔
"بس اب ایک ہی حسرت ہے کہ ایک بار موی کو دیکھ لوں۔ اس سے مل لوں' گلے لگا لوں۔" انہوں نے ایبک کی طرف دیکھا۔
"بیٹا! اس سے کہو' آجائے یہاں تمہارے پاس۔ فون کرواسے۔ میری بات کرواؤ..... میں کہتا ہوں اس سے کہ ایک بار مجھ سے آکر مل جائے..... "الریان" کے دروازے اس نے خود پر بند کیے تھے' یہاں تو آسکتا ہے نا۔"
ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔

ایبک نے ان کے لرزتے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"جی بابا جان! وہ تو خود آپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔"

اس کی نظریں یکدم اندر آتے کرنل شیر دل پر پڑی تھیں اور شیر دل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہنے سے منع کیا تھا۔ ایبک نے فوراً" بات بدل کر کرنل شیر دل کو مخاطب کیا۔

"ارے انکل! یہ آپ اپنے ساتھ کیا لائے ہیں۔ پورے کمرے میں مزیدار خوشبو پھیل گئی ہے۔"

"فرائیڈ چکن ہے بھئی تمہاری آنٹی کی اسپیشل ریسپی۔" کرنل شیر دل نے منیبہ کی طرف دیکھا۔

"بیٹا! باہر ٹیبل سے ڈش اٹھا کر سرو کرو۔"

"جی!" منیبہ جو کھڑی تھی باہر چلی گئی۔

ایبک بابا جان کو بتانے لگا کہ آنٹی چکن کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کرکے ٹوتھ پک میں پرو کر جانے کون سے مسالے لگا کر فرائی کرتی ہیں کہ بس 'آپ چکھ کر دیکھیں۔"

"اچھا دیکھتے ہیں۔" بابا جان مسکرا دیے تھے۔ ایبک موضوع بدلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

بابا جان ابھی ایک اٹیک سے سنبھلے تھے اور کرنل شیر دل کو ڈر تھا کہ وہ فلک کے متعلق جان کر کہیں ڈسٹرب نہ ہو جائیں اور کچھ مسئلہ نہ ہو جائے تب ہی انہوں نے ایبک کو تاکید کی تھی کہ بابا جان ذرا ریلیکس ہو جائیں تو آرام سے انہیں بتا دینا اور پھر میں یا تم جا کر اسے لے آئیں گے۔

"اریب باجی! آپ تو کچھ بھی نہیں لے رہیں۔ کم از کم یہ چکن تو لے لیں نا جس کی ایبک بھائی نے اتنی تعریف کی ہے۔"

عمر احسان کی آواز پر چونک کر ایبک نے ادھر دیکھا۔ اریب فاطمہ عمر کے قریب ہی ایک موڑھے پر بیٹھی تھی۔ جانے یہ موڑھا کب یہاں آیا تھا۔ شاید انکل شیر دل نے بھجوایا ہو گا۔

اریب فاطمہ نے ایک اسٹک اٹھائی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے رخساروں پر سرخی تھی۔ غالباً رگڑنے سے اور رونے سے۔۔۔ اس کے گندم رنگ رخساروں پر یہ ہلکی سرخی بہت بھلی لگ رہی تھی اور اس پر قدرے سوجی ہوئی آنکھیں اور بھی غضب ڈھا رہی تھیں۔ عمر نے نہ جانے اس سے کیا کہا تھا کہ وہ مسکرا رہی تھی۔ نگاہیں جھکائے وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی اور اس کی لمبی گھنی پلکوں کا سایہ اس کے رخساروں پر لرز رہا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے گیا۔

اس کی اس محویت کو سب سے پہلے منیبہ شاہ نے ہی محسوس کیا تھا جو حفصہ کی مدد سے سب کو چائے تقسیم کر رہی تھی۔ ایبک کو چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے وہ ہولے سے کھنکھاری تھی۔

"ایبک بھائی! چائے۔"

"اوہ ہاں!" ایبک نے چونک کر ہاتھ میں پکڑی پلیٹ حفصہ کی ٹرے میں رکھ دی اور چائے کا کپ منیبہ سے لیتے ہوئے مسکرایا۔ منیبہ نے جان بوجھ کر شرارت سے مڑ کر اریب فاطمہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"فاطمہ! تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو' بہت پیاری۔"

ایبک اور ہمدان نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا گئی۔

"مونی آپا! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اریب آپی تو ہمیشہ سے ہی خوب صورت ہیں' صرف آج ہی تو پیاری نہیں لگ رہی ہیں۔"

عمر کو اریب فاطمہ بہت خوب صورت لگتی تھی۔ معصوم' پاکیزہ اور شفاف سی۔

عمارہ نے دلچسپی سے اریب فاطمہ کو دیکھا جو خود کو موضوع بنائے جانے پر گھبرا سی گئی تھی اور اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔

"اگر رابیل آپی ادھر ہوتیں نا تو آپ سے ناراض ہو جاتیں عمر بھائی!"

عاشی ابھی تک عمارہ سے جڑی بیٹھی تھی۔ عمارہ نے ایک بازو اس کے گرد حمائل کر رکھا تھا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" عمر نے سر ہلایا۔

"اور کیا پتا مارتیں بھی۔" اس نے مزے سے کیک کھاتے ہوئے آنکھیں جھپکائیں۔

"وہ کیوں بھلا گڑیا؟" ایبک نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے عاشی کی طرف دیکھا۔

"وہ نہیں پسند کرتیں نا' ان کے علاوہ کسی اور کی تعریف ہو اور وہ تو مجھے بھی پسند نہیں کرتیں۔"

"کیوں' آپ کو پسند کیوں نہیں کرتیں؟"

ایبک کو اس کی باتیں بہت دلچسپ لگ رہی تھیں۔

"میں ان سے زیادہ خوب صورت جو ہوں۔ ہوں نا؟" اس نے ایبک سے تائید چاہی۔

"ہاں بالکل ہو۔" صرف ایبک کے ہی نہیں' سب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ اٹھی۔

"ہماری شہزادی کا تو کوئی مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔" ایبک نے جواباً" کہا تو اس نے اریب کی طرف دیکھا۔

"اریب فاطمہ بھی نہیں؟"

"نہیں۔" ایبک کھل کر ہنسا۔

"لیکن اریب آپی' رابی باجی سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ وہ ذرا زیادہ گوری ہیں' لیکن اریب آپی زیادہ کیوٹ ہیں۔ سب کو اچھی لگتی ہیں۔ اس لیے تو مائرہ آنٹی ان سے جلتی ہیں۔ اور ان سے لڑائی بھی کرتی ہیں' اس روز ان سے کہہ رہی تھیں کہ میں تمہیں رابیل کے حق پر ڈاکا نہیں ڈالنے دوں گی۔ اب اس میں اریب آپی کا کیا قصور کہ سب انہیں خوب صورت کہتے ہیں۔ رابی باجی سے بھی زیادہ۔"

وہ مزے سے ارد گرد سے بے نیاز کہے جا رہی تھی جب کہ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی اور اریب نے جو ایبک کی ہنسی میں کھوئی ہوئی ابھی تک سوچ رہی تھی کہ اس شخص پر ہنسی واقعی سوٹ کرتی ہے۔ ایک دم چونک کر عاشی اور پھر سب کی طرف دیکھا۔

عاشی اب مزید کیا کہنے والی تھی' وہ یک دم خوف زدہ ہو گئی اور ہاتھ میں پکڑا کپ عمر کو پکڑا کر وہ فوراً" اٹھ کر تیزی سے باہر چلی گئی لیکن عاشی نے مزید کچھ نہیں کہا تھا اور اپنی انگلیوں پر لگی کریم اور چاکلیٹ چاٹ رہی تھی۔ تب ایبک بے اختیار ہی اٹھ کر اس کے پیچھے باہر گیا تو ہمدان اور منیبہ کے لبوں پر ایک ساتھ مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی لیکن دونوں نے سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپالی تھی جبکہ بابا جان بہت دل گرفتی سے عثمان شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"عثمان! یہ مائرہ بیٹی کو اس بچی سے کیا دشمنی ہے۔ میں نے کئی بار محسوس کیا ہے۔ اس کا رویہ اس بچی سے صحیح نہیں ہے۔ مروہ نے ہماری ذمہ داری پر اسے یہاں چھوڑا ہے۔ وہ اسے اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہے۔ بیٹیوں کی طرح ہی پیار کرتی ہے وہ اس سے۔"

"اگر مروہ کی بیٹی کا مائرہ بھابی "الریان" میں رہنا پسند نہیں کرتیں تو پھر ہمارے بچوں کی "الریان" میں موجودگی بھی انہیں کھلتی ہو گی۔"

عثمان شاہ کے لہجے میں جانے ایسا کیا تھا کہ منیبہ ایک دم بولی تھی۔

"نہیں نہیں چچا جان! مائرہ چچی تو ہم سب سے بہت پیار کرتی ہیں۔"

"گاڈ فادر!" عمر زیر لب کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اریب فاطمہ غیر ہیں' اجنبی ہیں' اس لیے مائرہ چچی کو ان کا "الریان" میں رہنا پسند نہیں ہے۔" منیبہ وضاحت کر رہی تھی۔

"ایک بچی کا کیا بوجھ۔ کتنا کھا جاتی ہے وہ۔ جہاں اتنے نوکر چاکر کھاتے پیتے ہیں' وہاں اگر مروہ کی منہ بولی بیٹی کھا رہی ہے تو مائرہ کو کیا تکلیف ہے۔ ابھی تو ہم زندہ ہیں۔" بابا جان ابھی تک افسوس میں تھے۔

"ایسا نہیں ہے بابا جان! آپ کو پتا تو ہے' مائرہ بھابی کا مزاج ایسا ہی ہے۔" عمارہ نے ہولے سے ان کا بازو تھپتھپا کر تسلی دی۔ "آپ خوامخواہ دل پر مت لیں۔"

"وہ تو یہ بھی کہتی ہیں' رحمت بوا مفت کی روٹیاں کھاتی ہیں۔ نہ کام کی نہ کاج کی۔ ان کی اب "الریان" میں کیا ضرورت ہے۔"

عاشی نے ٹشو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تو عثمان شاہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"عاشی گل! آپ خوامخواہ کی فضول باتیں مت کیا کریں۔" عاشی سہم کر عمارہ سے لپٹ گئی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ عمر احسان نے دروازے پر ہاتھ رکھے رکھے مڑ کر عاشی اور عثمان چچا کی طرف دیکھا اور پھر باہر کا دروازہ کھول کر لان میں قدم رکھا لیکن ایبک کو اریب فاطمہ کے پاس کھڑے دیکھ کر مسکرایا۔

"ایبک بھائی! اریب آپی کو جانے مت دیجیے گا۔ آنٹی شیردل زبردست قسم کا ڈنر تیار کر رہی ہیں۔" ایبک نے مڑ کر اسے دیکھا تو وہ ہاتھ ہلاتا ہوا واپس انیکسی میں چلا گیا۔

"اریب فاطمہ رکیں پلیز' کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

اریب فاطمہ کو دوبارہ گیٹ کی طرف جاتے دیکھ کر ایبک کے لبوں سے نکلا تو اریب فاطمہ نے مڑ کر اسے دیکھا اس کا پورا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"میں آپ سے پوچھ رہا تھا آپ اس طرح کیوں چلی آئی ہیں اور آپ رو کیوں رہی ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آپ کے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔ عاشی نے تو ایسا کچھ نہیں کہا۔"

"عاشی نے۔" اس کے لب کپکپائے۔ "ہاں عاشی نے کچھ نہیں کہا مجھے لیکن اگر اس نے سب کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو مجھے مائرہ مامی نے کہی تھیں تو سب کیا سوچیں گے۔ مجھے نہیں پتا تھا جب وہ مجھے ڈانٹ رہی تھیں تو عاشی سن رہی تھی۔"

"عاشی نے اور کچھ نہیں کہا۔" ایبک کے لہجے میں نرمی تھی۔ "میرا خیال ہے' اس نے زیادہ کچھ نہیں سنا ہو گا اور اگر آپ صحیح ہیں تو آپ کو لوگوں سے نہیں ڈرنا چاہیے اریب فاطمہ!"

"نہیں۔۔۔" اس نے چادر کے پلو سے اپنا بھیگا چہرہ اچھی طرح صاف کیا۔ "ہمیں لوگوں سے ڈرنا چاہیے ۔۔۔ میری اماں کہتی ہیں کہ لوگوں کا ڈر اور خوف اچھی چیز ہوتا ہے۔ خاص کر لڑکیوں کے لیے۔۔۔ احتساب کا کام کرتا ہے۔ بہت بڑا محتسب ہوتا ہے لوگوں کا ڈر بھی۔"

"مجھے کبھی اپنی ماں سے ملوائیے گا اریب فاطمہ! کیا وہ کوئی فلسفی یا ادیب ہیں؟"

"نہیں۔" اریب فاطمہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ نہ فلسفی ہیں نہ ادیب لیکن زمانے نے جو کچھ انہیں سکھایا ہے' آپ ادیب ہو کر بھی نہ سیکھ پائے ہوں گے۔"

ایبک کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے حیرت کی رمق ابھری اور پھر معدوم ہو گئی۔

"آپ اچھا بولتی ہیں اریب فاطمہ! ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا' آپ صرف روتی اور ڈرتی ہیں۔"

"ہاں مجھے ڈر لگتا ہے زمانے سے' لوگوں سے۔"

"اریب فاطمہ! جب آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ آپ بالکل صحیح ہیں تو پھر کس لیے ڈرنا؟"

"لیکن لوگ تو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے اور سنتے ہیں۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ جھوٹ اور سچ کی تحقیق کرتا پھرے۔"

"لیکن سچ کبھی زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا۔ حقیقت ایک دن ظاہر ہو جاتی ہے۔"

"ہاں ایک دن حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔" وہ پتا نہیں کیوں یکدم تلخ ہو گئی تھی' ایبک حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن بعض اوقات حقیقت ظاہر ہونے تک سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ آپ کسی پر جھوٹا الزام لگا دیں۔ ایک دنیا اس الزام کو سچ مان لے اور جب آپ پر سچ ظاہر ہو تو آپ کس کس کے پاس جا کر گواہی دیں گے کہ وہ جھوٹ تھا۔ کون آپ کی بات کا یقین کرے گا اور اگر کر بھی لیا تو ایک زندگی جو اس جھوٹ کی وجہ سے زندہ درگور ہو گئی۔ آپ اس میں زندگی واپس لا سکیں گے؟ جو کھو گیا' جو نقصان ہو گیا' وہ پورا کر سکیں گے۔ نہیں کبھی نہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں شاید' لیکن کیا آپ بتانا پسند کریں گی کہ مائرہ مامی نے ایسا کیا کہہ دیا ہے جو آپ اتنی ڈری ہوئی اور خوف زدہ ہیں۔ مجھ پر اعتبار کریں۔ مجھے

بتائیں شاید میں کچھ مدد کرسکوں۔"

"ہاں کوئی تو ہو کسی کو تو پتا ہو کہ مائرہ مامی نے کتنی گھٹیا بات کی ہے۔" اریب فاطمہ نے سوچا اور ایبک کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے بولی۔

"وہ کہہ رہی تھیں میں ہمدان بھائی کو۔۔۔ یقین کریں۔ میں نے کبھی ہمدان بھائی کے متعلق ایسا سوچا بھی نہیں۔"

"اور ایسا سوچنا بھی نہیں اریب فاطمہ!" بے اختیار ہی ایبک کے لبوں سے نکلا تھا۔

"کیا کہا آپ نے؟" اریب فاطمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"کچھ نہیں اریب فاطمہ! میں کہہ رہا تھا آپ مائرہ مامی کی باتوں کی پروا مت کیا کریں۔ وہ تو جو منہ میں آتا ہے بولتی چلی جاتی ہیں۔ آپ پلیز اندر چلیں نا۔ بابا جان آپ کے اس طرح اٹھ آنے سے پریشان ہو گئے تھے۔"

تب ہی اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ عمر احسان ادھر ہی آرہا تھا۔

"ایبک بھائی! آپ ابھی تک آپ یہیں کھڑے ہیں۔ میں سمجھا آپ فاطمہ آپی کو گھر چھوڑنے چلے گئے ہیں۔"

"میں تو اریب فاطمہ سے بات کر رہا تھا کہ عاشی تو بچی ہے ایسے ہی بے سوچے سمجھے بول جاتی ہے۔"

"تو اور کیا۔ میری ماما آپ سے بالکل بھی جیلس نہیں ہوتی ہیں۔ آئیں چلیں اندر۔ بابا جان آپ کے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔"

ایبک نے آہستہ سے اسے جانے کے لیے کہا۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں ایبک بھائی؟" عمر نے پوچھا۔

"ماما کی دوائیاں لینی تھیں اسٹور سے اور دس پندرہ منٹ کا ایک اور کام ہے۔"

وہ بات کر کے گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور عمر اریب فاطمہ کے ساتھ واپس انیکسی کی طرف جانے لگا۔

☆ ☆ ☆

اس نے ٹیبل پر اپنا سامان رکھتے ہوئے کچھ دیر کے لیے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ آج کا سارا دن بے حد مصروف گزرا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی سب لوگ انکل شیر دل کے گھر سے ڈنر کر کے نکلے تھے۔ بقول عمر احسان کے آنٹی شیر دل نے زبردست ڈنر تیار کیا تھا۔ انکل مصطفیٰ اور ثنا آنٹی بھی ڈنر تک آگئے تھے۔

"آنٹی! یہ اتنا سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" ہمدان نے کہا تو منیبہ نے اس کی بات اچک لی۔

"ہاں کچھ اگلے دنوں کے لیے رکھ لیتیں کیونکہ ہم کو تو اب روز ہی آنا ہے جب تک عمارہ پھپھو اور بابا جان یہاں ہیں۔"

مسز شیر دل بہت خوش تھیں۔ "مجھے آپ سب لوگوں کا آنا بہت اچھا لگا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے ہماری بے رنگ زندگی میں رنگ سا آگیا ہے۔ آپ لوگ روز آئیں۔۔۔ ڈنر ہر روز ہماری طرف۔"

وہ سب ہی کرنل شیر دل اور ان کی بیگم کے خلوص و محبت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔

منیبہ کو بار بار افسوس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ پہلے کرنل شیر دل کی بیگم سے کیوں نہیں ملے۔

یونہی ہنستے مسکراتے ماحول میں کھانا کھایا گیا اور ایبک فلک شاہ کو بھی آج کا کھانا ہر روز کے کھانے سے کہیں زیادہ اچھا لگا تھا۔ آج اس نے اپنے ہوش میں پہلی بار ماما کو اس طرح کھل کر ہنستے دیکھا تھا۔

کاش بابا بھی اس ماحول کا حصہ ہوتے۔ کتنے اداس اور کتنے اکیلے ہوں گے وہ وہاں۔ ایبک فلک شاہ کے خیال سے اداس ہو گیا تو اس نے سر جھٹک کر خود کو یقین دلایا۔

"ایک روز بابا بھی ضرور بابا جان سے ملیں گے ان شاءاللہ۔"

وہ سیدھا ہو کر بیٹھا اور ٹیبل پر پڑا کلپ بورڈ اٹھا لیا۔

سب لوگ ڈنر کے بعد چلے گئے تھے۔ بابا جان دوا کھا کر سو گئے تھے اور کرنل شیر دل نے اس کے لیے میٹرس بھجوا دیا تھا جو اس نے سٹنگ میں بچھا لیا تھا۔ ماما بھی تھک گئی تھیں اس لیے وہ انہیں سونے کی تلقین کرتا ہوا سٹنگ میں آگیا تھا لیکن خود اسے نیند نہیں آرہی تھی سو اس نے کچھ لکھنے کا سوچا تھا۔

"کیا ہی اچھا ہو یہ کہانی جلد مکمل ہو جائے تو۔ وہ ٹی وی کے لیے بھی ڈراما لکھ سکے۔ جس پر بہت پہلے ڈسکس کیا جا چکا تھا اور اس کا فلو بھی تیار کر لیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا کہ یہ کہانی اس کی شاہکار کہانیوں میں سے ہوگی۔ اس لیے پہلے وہ یہ کہانی لکھنا چاہتا تھا اور پھر ڈرامے پر کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کلپ بورڈ اٹھایا اور ڈائننگ ٹیبل پر آکر بیٹھ گیا۔ کلپ بورڈ کے اوپر لگے ہوئے کاغذوں پر نظر دوڑائی اور قلم اٹھایا اور لکھا۔

"اس نے ایک ناراض سی نظر مجھ پر ڈالی اور میری مٹھیوں سے اپنی اوڑھنی کا پلو چھڑانے کی کوشش کی۔"

"نہیں پلیز حور عین! اس طرح خفا ہو کر مت جاؤ۔ یہاں آؤ بیٹھو اور مجھے بتاؤ اپنے متعلق۔

اچھا اپنے متعلق کچھ بھی مت کہو زمین کے متعلق بتاؤ۔ میں بہت دھیان سے تمہاری بات سنوں گا۔۔۔ اور بالکل بھی نہیں بولوں گا لیکن بس تم میرے پاس بیٹھی رہو یہاں۔ بولتی رہو اور میں تمہیں سنتا رہوں۔"

وہ اب بھی شاکی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کی اوڑھنی کا پلو اب بھی میری مٹھی میں تھا۔

"زمین کے سینے پر اتنے زخم لگے ہیں کہ اگر میں تمہیں ایک ایک زخم دکھاؤں تو کئی صدیاں بیت جائیں۔"

"یہ زمین بھی تو صدیوں پرانی ہے حور عین!"

"ہاں صدیوں پرانی۔" ایک آہ کے ساتھ وہ وہیں بیٹھ گئی تھی اور دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا تھا۔

"اچھا میرا پلو تو چھوڑو۔"

"جی چاہتا ہے اب تمہارا پلو پکڑا ہے تو زندگی کی آخری سانس تک پکڑے رکھوں۔"

"یہ تم شاعر ادیب بھی بس باتوں میں ماہر ہوتے ہو۔" مسکراہٹ اس کے لبوں پر اس طرح طلوع ہوئی تھی جیسے افق کے کنارے سے سورج کی پہلی کرن جھانکے۔ اس کی پلکیں جھک گئی تھیں لانبی گھنی پلکیں لرز رہی تھیں اور ان کا سایہ اس کے رخساروں پر اس طرح پڑ رہا تھا جیسے"

"جیسے اریب فاطمہ کے رخساروں پر۔" وہ چونکا۔

"اریب فاطمہ!" اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یہ لڑکی ایسی ہے کہ اسے چاہا جائے۔ معصوم شفاف اور۔۔۔ مجھے لگتا ہے کسی روز میں اس لڑکی کی محبت میں بہت شدت سے مبتلا ہو جاؤں گا۔"

"تو کیا اب بھی تم اس لڑکی سے محبت نہیں کرتے ہو۔" دل نے ہولے سے سرگوشی کی تھی۔

"شاید۔۔۔"

"شاید نہیں سچ مچ تم اس سے محبت کرتے ہو ایبک فلک شاہ!" اس روز سے جب تم نے پہلی بار اسے "الریان" میں منیبہ کے پیچھے چھپے بیٹھے دیکھا تھا اور وہ منیبہ کے کندھے کی اوٹ سے چپکے چپکے تمہیں دیکھتی تھی اور اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکتے تھے اور پلکیں جھک جاتی تھیں۔"

"شاید۔" وہ مسکرایا "شاید اسی روز اس نے میرے دل میں کہیں کسی کونے میں جگہ بنالی ہو۔"

ہولے سے سر جھٹک کر اس نے پھر قلم اٹھا لیا تھا۔

"تو میں کیا لکھ رہا تھا؟"

اس نے ایک نظر اپنے لکھے پر ڈالی اور پھر تیزی سے اس کا قلم چلنے لگا۔

"اور زمین کے آنسو تو کبھی خشک ہی نہیں ہوئے۔ ایک کے بعد ایک زخم ایک نیا چرکا ایک نیا دکھ اور زمین تو شاید پیدا ہی رونے کے لیے ہوئی تھی۔

کبھی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لیے۔

اس کا اور آنسوؤں کا تو ازلی ساتھ ہے۔ تم تو شاعر ہو ادیب ہو مصنف ہو۔ تم نے تو تاریخ کے اوراق کھول کر دیکھے ہوں گے۔ تمہیں تو ان موتیوں کی

قیمت کا اندازہ ہوگا جو اس بدنصیب کی آنکھوں سے ہمیشہ بہتے رہے۔"

"تم زمین کے لیے اتنی دکھی کیوں ہوتی ہو۔" میں اس کی آنکھوں کے کٹوروں کو پانیوں سے بھرتا دیکھ رہا تھا۔

"اس لیے کہ میرا اور زمین کا ازلی رشتہ ہے۔ ہمارے دکھ بھی سانجھے ہیں اور خوشیاں بھی۔

میں بھی تو زمین کی طرح صدیوں سے رو رہی ہوں، جب میری کوکھ اجاڑی گئی۔ جب دو ہاتھوں نے مجھے زندہ گڑھے میں ڈال کر اوپر مٹی ڈالی تو میری ننھی چیخیں صرف زمین سنتی تھی اور اپنے ماتا بھرے ہاتھوں سے مجھے تھپکتی تھی لیکن تم دیوانے شاعر تم کیا جانو زمین کے دکھ۔"

آنکھوں کے کٹورے چھلک پڑے تھے۔

"تمہیں تو لب و رخسار کے قصے کہنے سے ہی فرصت نہیں ملتی...... تم تو بس محبت کی جھوٹی کہانیاں لکھو...... حالانکہ تم تو خود محبت کے میم کے بھی معنی نہیں سمجھتے، پوری پوری محبت کا ادراک کیسے کرو گے؟"

اس نے نظریں جھکالیں...... میں اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا جو بھیگتا جا رہا تھا۔

وہ جب جب زمین پر لگنے والے زخموں کا ذکر کرتی تھی اس کا پورا وجود جیسے کسی اذیت سے تڑپتا تھا۔

"سنو! مجھے اب جانے دو اور تم اپنے خیالی محبوب کے تصور سے اپنی بزم سجاؤ اور اس کے لب و رخسار کی کہانیاں لکھو۔"

وہ اٹھنے لگی تھی۔ لیکن میں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔ میری اس جسارت پر وہ جز بز ہوئی لیکن اپنا ہاتھ چھڑا کر بیٹھ گئی۔

"ٹک...... ٹک!" ایک نے چونک کر قلم رکھ دیا اور سامنے دیکھا کلاک نے دو بجائے تھے۔ اس نے لکھے ہوئے آخری صفحے کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اسے نیچے رکھا۔ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے ہلکا سا دبایا اور پھر قلم اٹھایا۔

آج اس نے کافی لکھ لیا تھا اور لکھتے ہوئے اس نے قلم ایک بار بھی نہیں رکا تھا۔ ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اس نے لکھے ہوئے کاغذوں پر ایک نظر ڈالی اور مزید لکھنے کا ارادہ ترک کر کے کاغذوں کو ترتیب سے رکھتے ہوئے اس نے ایک سرسری نظر ان پر ڈالی۔

اور یوں ہی ایک صفحہ پڑھنے لگا۔

"اور اس روز جب مکے کی گلیوں میں گزرتے ہوئے بوڑھی عورت نے کوڑا پھینکا تھا اور جس روز طائف والوں نے پتھر برسائے تھے تو کیسے کیسے زمین کا جی چاہا تھا کہ وہ دھنس جائے، مارے شرمندگی کے اور کبھی ظاہر نہ ہو۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باغ میں ہاتھ اٹھائے اہل طائف کے لیے دعائیں کرتے تھے کہ یا اللہ! انہیں بصیرت عطا کر، یہ نا سمجھ ہیں تو زمین ان کی تار تار اوڑھنی اور زخمی پاؤں دیکھ کر تڑپ تڑپ کر روتی تھی، کرلاتی تھی اور ان پاکیزہ مقدس قدموں پر نثار ہوتی تھی۔ اور جب شعب ابی طالب میں وہ سب درختوں کے پتے کھاتے تھے۔ اللہ سے صبر شکر کی دعا کرتے تھے تو زمین کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنا سینہ چیر کر ان کے لیے پھلوں اور اناج کے ڈھیر لگا دے۔ بس وہ آنسو بہاتی تھی اور روتی تھی۔ مریم کی طرح۔"

"یہ مریم کا ذکر زمین کے ذکر میں کہاں سے آگیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مریم کے ذکر کو زمین کے ذکر سے الگ تو نہیں کیا جا سکتا نا لیکن تم کیا سمجھو گے خوابوں اور خیالوں میں رہنے والے اور زمین کی ملکیت پر فخر کرنے والے۔ تم زمین کو اپنی ملکیت کیوں سمجھتے ہو۔"

"اسے چھوڑو تم بتاؤ مریم کون ہے۔" مجھے تجسس ہو رہا تھا۔

"مریم!" اس نے اپنے لبوں پر زبان پھیری تھی۔

"مریم نے صدیوں پہلے جنم لیا تھا۔

یوں سمجھ لو اس زمین کے ساتھ ہی اس کا جنم ہوا تھا اور زمین پر پہلا قتل بھی اسی کی وجہ سے ہوا، چلو؟

تم اسے کوئی نام، کوئی روپ دے دو۔

کبھی وہ بے نام ہوتی ہے۔

زندہ دفن کر دی جانے والی۔

کبھی وہ شوہر کی چتا پر جل جانے والی ہوتی ہے۔

کبھی اس کے گلے میں طوق ڈال دیا جاتا ہے۔

کبھی وہ کنیز ہوتی ہے، بادشاہوں کا دل بہلانے والی اور کبھی بازار میں بیٹھ کر گانے والی۔

کبھی شوہر کی جوتیاں کھا کر بھی اس کے در کو نہ چھوڑنے والی۔

کبھی ولی اور کبھی سواد بننے والی۔

لیکن یہ جس مریم کا میں نے ذکر کیا ہے نا یہ چک فیروز شاہ کے چودھری غلام فرید کی بیوی تھی۔ جس کی پانچ بیٹیاں تھیں اور جو روتی تھی زمین کی طرح اور اللہ سے صبر و شکر کی دعا کرتی تھی......" ایک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"لگتا ہے میں کچھ ایسا لکھنے میں کامیاب ہو رہا ہوں جو شاہکار کہلایا جا سکے۔" اس نے تمام کاغذ ترتیب سے فائل میں رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اڑھائی بج رہے تھے۔ وہ میٹرس پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

"لے سنگ لاتے دیلا تر۔

Le songlot de la terra۔

"زمین کی سسکیاں"

"آہ پاؤلن لیکولی بد قسمت ماں۔"

وہ ہولے سے ہنسا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ نیند دور دور تک آنکھوں میں نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ ایک بار پھر اٹھ کر لکھنا شروع کر دے لیکن اب لکھنے کا موڈ نہیں رہا تھا۔

پتا نہیں ژل لافورگ (Zhil Laforg) کی "زمین کی سسکیاں" شاہکار قرار دی گئی تھی یا نہیں لیکن ایک فلک شاہ کی "زمین کے آنسو" کو ایک شاہکار ہونا چاہیے۔ ایسی کتاب جو اس کی پچھلی تمام کتابوں کو پیچھے چھوڑ دے۔ میں صبح اس سارے لکھے گئے کو دوبارہ پڑھوں گا اور اسے پھر سے لکھوں گا۔

اسے دوبارہ لکھنے کی عادت نہ تھی۔ وہ ایک بار ہی لکھتا تھا بعض اوقات تو وہ اپنے لکھے ہوئے کو دوبارہ پڑھتا بھی نہیں تھا، لیکن اس بار وہ غلطی کی گنجائش نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

جب کوئی تحریر چھپ کر آتی تھی کئی بار تو اسے دیکھ کر اسے احساس ہوتا تھا کہ اسے لکھنے کے بعد اسے ایک دفعہ پڑھ لینا چاہیے تھا اور اگر وہ پڑھ لیتا تو اس موضوع پر زیادہ بہتر لکھ پاتا لیکن وہ ہمیشہ ہی وقت کی کمی کا شکار رہتا تھا...... لیکن اس بار وہ جب تک مطمئن نہیں ہوگا اس تحریر کو چھپنے کے لیے نہیں دے گا۔

اسے اپنی فرانسیسی زبان پڑھانے والی ٹیچر پاؤلن لیکولی کا خیال آیا۔ پتا نہیں وہ اب بھی وہاں اس انسٹیٹیوٹ میں ہوتی ہوگی یا اپنے وطن چلی گئی ہوگی۔ ان دنوں جیسے دوسری زبانیں سیکھنے کا فیشن چل نکلا تھا اور اس کے کتنے ہی کلاس فیلو لڑکے اور لڑکیاں جرمن اور فرنچ سیکھ رہے تھے سو وہ بھی فرنچ سیکھنے لگا تھا۔

پاؤلن لیکولی...... وہ سنہرے بالوں اور بھوری آنکھوں والی اس کی ٹیچر...... وہ صبح ضرور جا کر کرپتا کرے گا۔ کیا پتا وہ اب بھی وہیں ہو اور پھر وہ اس سے ژل کے متعلق کچھ اور جاننے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس کی نظمیں پڑھ کر دیکھے گا اور پاؤلن کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ اسے اپنا شاہکار تخلیق کرنے کے لیے کچھ محنت کرنا چاہیے۔

اس نے کروٹ بدلتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔



"بابا...... بابا! وہ آ رہے ہیں۔ پہنچ گئے ہیں ایئرپورٹ پر۔"

انجی بہت ایکسائٹڈ ہو رہی تھی۔ "ابھی جواد کا فون آیا ہے۔"

فلک شاہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ انہوں نے انجی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

"بابا! آپ ٹھیک تو ہیں نا۔" انجی پریشانی سے انہیں دیکھنے لگی انہیں خاموش دیکھ کر گھبرا کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"مجھے پورچ تک لے چلو۔"

"نہیں بابا! ہم یہیں پر ان کا استقبال کریں گے۔" انجی گھبرا گئی تھی۔ وہ رات سے ان کی کیفیت دیکھ رہی تھی۔ کہیں ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کی طبیعت خراب ہو گئی تو۔

"باہر۔۔۔ سردی ہے بابا!" انہوں نے سر ہلا دیا۔

انہوں نے اپنی کرسی کی پشت پر سر ٹکتے ہوئے آنکھیں موندلی تھیں اور دل پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی بن کر گزرا تھا۔ بالآخر یہ لمحے گزر گئے تھے۔ گیٹ پر ہارن کی آواز آئی تھی۔ پھر گیٹ کھلنے کی آواز پر انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ انجی تیزی سے اندرونی گیٹ کھولنے کے لیے جا رہی تھی۔ انہوں نے سختی سے دانتوں پر دانت جما لیے تھے اور دل پر ہاتھ رکھے آگے کو جھک گئے تھے۔ ایک بابا جان کا ہاتھ تھامے سب سے پہلے لاؤنج میں آیا تھا اور اس کی نظر آگے کی طرف جھکے فلک شاہ پر پڑی تھی۔

بابا جان کا ہاتھ جواد کے ہاتھ میں دیتے وہ تیزی سے ان کی طرف بڑھا۔

"بابا۔۔۔ بابا!" انہوں نے ایک کی آواز سنی تھی۔ سر اٹھا کر اسے دیکھنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن وہ کچھ بول نہیں سکے تھے۔ انہوں نے بابا جان کو بے قراری سے اپنی طرف آتے دیکھا تھا لیکن وہ اٹھ کر دوڑ کر ان کے گلے نہیں لگ سکتے تھے۔ انہوں نے بے بسی سے اپنی ٹانگوں کو دیکھا، جنہوں نے برسوں پہلے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ انہیں سہارا دینے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ 1979ء تھا جب ایک رات انہیں گرفتار کر لیا گیا تھا ملک میں فتنہ و شر پھیلانے کے الزام میں۔ کوٹ لکھپت جیل اور پھر شاہی قلعے میں ان پر جو بھی گزری تھی، وہ اذیت کی ایک داستان تھی، لیکن وہاں سے نکل کر وہ کن لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے، وہ آج تک نہیں جانتے تھے۔ شاید یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے حق نواز کو مارا تھا۔۔۔ یا پھر کوئی اور۔۔۔ وہاں جو تشدد ان پر ہوا۔۔۔ اپنی طرف سے تو وہ انہیں مار کر ہی پھینک گئے تھے، لیکن زندگی دینے والے نے انہیں زندگی دے دی تھی، مگر پھر اس کے بعد وہ اپنے قدموں پر کھڑے نہ ہو سکے تھے۔

بابا جان ان کے قریب آئے تھے۔ انہوں نے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوما تھا۔ ان کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا لیکن وہ ایک سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے تھے۔ بابا جان روتے ہوئے ان کے ماتھے کو ان کے رخساروں کو چوم رہے تھے۔

"یہ تم نے کیا کر لیا مومی! اسی لیے منع کرتا تھا اسی لیے سمجھاتا تھا، مت اس سیاست کے کھیل میں پھنسو۔ یہاں سیاست تھوڑی ہوتی ہے۔ اس ملک میں تو۔"

"بابا جان!" وہ ان سے معافی مانگنا چاہتے تھے لیکن ان کے ہونٹوں سے آواز نہیں نکلی تھی، بس انہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"مومی!" بابا جان نے تڑپ کر ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چومے تھے۔ آنکھوں سے لگائے تھے۔ "ان ظالموں نے تمہارے ساتھ یہ کیا کیا؟ کیوں کیا؟"

"بابا جان!" ان کے منہ سے نکلا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ ان کے گرد حمائل کر کے وہ بلک بلک کر رونے لگے تھے۔ ان کی کرسی کے پاس کھڑے بابا جان نے ان کا سر اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور۔۔۔ وہ ان کے دامن میں منہ چھپائے بازو ان کی ٹانگوں کے گرد حمائل کیے روئے جا رہے تھے۔

"بابا جان! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے بہت ظلم کیا۔ اپنے ساتھ، عمارہ کے ساتھ، آپ کے ساتھ۔"

"بس کرو مومی بیٹا! بس کرو اب۔" انہوں نے آہستگی سے ان کے بازوؤں کو الگ کیا۔

"ہم نے بھی غلطیاں کی۔ ہم بھی قصور وار ہیں۔ ہم نے دوسروں کے کانوں سے سنا اور دوسروں کی آنکھوں سے دیکھا۔ ورنہ کوئی درمیانی راستہ نکالا جا سکتا تھا لیکن یہ جدائیاں نصیب میں تھیں۔"

"بابا جان پلیز۔۔۔ آئیں ادھر بیٹھیں۔ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔"

ایک نے انہیں اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا۔

"کہاں لے چلے ہو مجھے۔ یہاں اپنے مومی کے پاس بیٹھنے دو۔"

"کہیں نہیں بابا جان! یہ آپ ادھر صوفے پر ایزی ہو کر بیٹھ جائیں اور ماما آپ بھی۔۔۔ میں بابا کی چیئر ادھر ہی لے آتا ہوں۔"

بابا جان کو صوفے پر بٹھا کر فلک شاہ کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے تھوڑا سا جھک کر فلک شاہ سے کہا۔

"بابا پلیز۔ اب نہیں رونا آپ نے۔" اور پھر خود ہی ایک ہاتھ سے ان کے آنسو صاف کیے۔

"بابا! آپ کو پتا ہے نا بابا جان کی اور ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کے اس طرح رونے سے وہ ڈپریس ہو جائیں گے۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آج بابا جان آئے ہیں، کل باقی سب بھی آ جائیں گے ان شاء اللہ۔"

"اب جب عمر کی نقدی ختم ہوا چاہتی ہے آپی! جب زندگی کے چھبیس سنہرے سال سب کی جدائیاں سہتے گزر گئے اب؟" ان کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

"اور اگر اب بھی یہ جدائیاں ختم نہ ہوتیں تو۔" ایک نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"تو یہ حسرت دل میں لے کر قبر میں اتر جاتا کہ۔۔۔"

"تو پھر بابا! خوش ہو جائیں نا کہ اب بھی اللہ نے کرم کیا۔"

وہ ہولے ہولے کہتا ان کی کرسی دھکیلتا بابا جان کے قریب لے آیا تھا۔

"مومی!" بابا جان نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔ "کیسے جی لیا تم نے "الریان" کے بغیر، کیسے گزارے اتنے سال؟"

"مومی سے پوچھیں بابا جان! کیسے گزارے۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

اور عمارہ نے تو ایک بار نہیں، کئی بار بتایا تھا۔

"مومی نے تو ایک ایک پل "الریان" کو یاد کیا ہے اور ان چھبیس سالوں میں اتنے آنسو بہائے ہیں کہ سمندر بھر جاتے۔"

وہ کتنی ہی دیر تک سکتے کے عالم میں فلک شاہ کی وہیل چیئر کو دیکھتے رہے تھے۔

"کب ہوا یہ حادثہ۔۔۔ مجھے کسی نے بتایا کیوں نہیں۔۔۔ کبھی ہمدان نے بھی ذکر نہیں کیا۔ میرا مومی معذور۔۔۔"

"مومی نے منع کیا تھا بتانے سے۔" عمارہ نے نظریں جھکائیں۔

وہ تقریباً دو سال بعد بہاول پور سے آئے تھے اور کرنل شیر دل کے گھر ہی ٹھہرے تھے۔ دو سال انہیں سنبھلنے میں لگے تھے پھر بھی جب وہ کرنل شیر دل کے گلے لگے تھے تو پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے، جیسے لاہور میں قدم رکھتے ہی سارے زخم تازے ہو گئے تھے۔ اس رات انہوں نے حق نواز کو بھی یاد کیا تھا، جو ناحق مارا گیا تھا۔

اور وہ رات تو جیسے ان کے دل پر کندہ تھی جب انہوں نے اپنے لیے "الریان" کو شجر ممنوعہ بنا دیا تھا۔ اس روز شیر دل کے ساتھ وہ سر الطاف کی طرف گئے تھے۔ سر الطاف بہت افسردہ تھے۔

"یہ صحیح نہیں ہوا، بالکل بھی صحیح نہیں ہوا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پہلے اسے انصاف کے کٹہرے میں لایا جاتا۔ اس پر فرد جرم عائد کی جاتی۔ ثبوت دکھائے جاتے۔ پھر بھی یہ ظلم ہوا ہے فلک شاہ! بے شک میں اس کی پارٹی کا رکن نہیں تھا۔ لیکن میں ظالم کی حمایت نہیں کر سکتا، میں ظلم کا حامی نہیں ہوں۔ تم تو اس کی پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔"

"ہاں حق نواز کی وجہ سے۔ وہ اپنی صحافی دوست کے اغوا سے بہت دل برداشتہ تھا، ورنہ پارٹی سے ہمیں کئی

اختلافات تھے۔"

"اتنا بڑا سانحہ ہو گیا کیا کسی نے احتجاج نہیں کیا؟ جلوس نہیں نکالے؟"

"اتنے بڑے پیمانے پر نہیں شاید لوگ خوف زدہ ہیں۔ حالانکہ اپوزیشن اور مخالف گروپ کو بھی یہ چانس دیا جانا پسند نہیں آیا۔" سر الطاف نے انہیں بتایا تھا۔

"ان کے کارکنوں کو کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔ کوئی احتجاج کچھ تو......"

اور پھر پتا نہیں انہیں کیسے اس کی آمد کی خبر ہو گئی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے' اپنے دفتر میں وہ سب احتجاج کرنا چاہتے تھے۔ ایک بڑا جلوس نکالنے کی تیاری کر رہے تھے کہ فلک شاہ کو ان کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا۔ تب شیر دل کیسے مارا مارا پھرا تھا۔ کتنی کوششیں کی تھیں جب اسے کوٹ لکھپت سے قلعے میں منتقل کیا گیا تھا۔ اور جب شیر دل کسی بہت اونچی سفارش کے ساتھ قلعے پہنچا تھا تو اسے پتا چلا تھا کہ اسے تو کل صبح ہی رہا کر دیا گیا تھا لیکن پھر پورے ایک ہفتے بعد بالکل حق نواز کی طرح اسے کوئی کرنل شیر دل کی کوٹھی کے باہر پھینک گیا تھا۔ ان کی ٹانگیں کچل دی گئی تھیں۔

"بس کرو خدا کے لیے شیر دل! بس کرو مزید سننے کی تاب نہیں ہے مجھے۔"

بابا جان رو پڑے تھے۔ فلک شاہ کی وہیل چیئر دیکھ کر انہیں شیر دل کی زبانی اپنے مومی پر ہونے والے ظلم کی داستان پھر سے یاد آ گئی تھی۔ پتا نہیں چھبیس سال کیسے گزار لیے تھے انہوں نے اس بے خبری میں اور انہوں نے مصطفیٰ یا عثمان سے بھی نہیں پوچھا تھا اور نہ ہی احسان شاہ کی ناراضی کا خیال کیا تھا۔ بس مصطفیٰ کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ وہ بہاول پور جا رہے ہیں مومی سے ملنے۔

"ابھی آپ کی طبیعت کچھ اور سنبھل جاتی تو میں آپ کو لے جاتا بابا جان۔"

لیکن انہوں نے مصطفیٰ کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ "چھبیس سالوں میں تو تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ مجھے میری عمو اور مومی کے پاس لے جاؤ۔ تم نے بھی اس فاصلے کو پاٹنے کی کوشش نہیں کی جو خود بخود ہی بنتے چلے گئے تھے۔"

انہوں نے دل ہی دل میں سوچا ضرور تھا' لیکن مصطفیٰ سے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس رات کے بعد بیچ میں صدیوں کے فاصلے حائل ہو گئے تھے۔

وہ رات کیسے گزری تھی۔ انہیں خبر نہیں تھی۔ غصے میں اس نے سوچا تک نہیں کہ وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہا ہے۔ انہوں نے کتنی ہی بار اماں جان سے کہا تھا اور وہ تو خود پوری رات روتی رہی تھیں۔ "میں نے غصہ کیا تھا...... ڈانٹا تھا۔ بزرگ تھا۔ اس کے باپ کی جگہ تھا۔ میں غصے میں تھا۔ تو وہ ہی خاموش ہو جاتا۔ یہ غضب نہ ڈھاتا۔"

رات آنکھوں میں کٹی تھی اور صبح وہ فجر کے لیے نکلے تو سیدھے ملک ہاؤس جا پہنچے تھے۔ وہاں تالا لگا ہوا تھا۔

"کہاں چلے گئے آخر دونوں اتنی صبح۔"

انہوں نے سوچا تھا پھر اس روز انہوں نے دو تین چکر لگائے تھے۔ ان کا گھر مقفل تھا۔ تب انہوں نے مصطفیٰ کو فون کر کے ساری حقیقت بتا دی تھی اور جب وہ مصطفیٰ سے بات کر رہے تھے تو احسان شاہ اندر خاموشی سے آ کر بیٹھ گئے تھے اور انہیں مصطفیٰ سے بات کرتے سنتے رہے تھے اور جب وہ بات کر چکے تھے تو احسان شاہ نے کہا تھا۔

"بابا جان! اس گھر کے دروازے خود مومی نے اپنے اوپر بند کر لیے ہیں' لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو میں خود اس کا آنا بند کر دیتا۔"

انہوں نے حیرانی سے احسان شاہ کو دیکھا تھا۔

"وہ یہاں نہیں آ سکتا اور نہ ہی "الریان" کا کوئی فرد ان سے کوئی تعلق یا رابطہ رکھے۔"

"کیوں رابطہ نہ رکھے احسان شاہ! وہ کوئی غیر تو نہیں ہے۔ ہماری عمارہ کا شوہر ہے۔ ٹھیک ہے' وہ جذباتی ہے' غصیلا ہے۔ میں نے کبھی اس طرح اس سے بات نہیں کی تھی اتنے غصے سے اور ناراضی سے تو وہ برداشت نہیں کر سکا اور فضول اور غلط بول دیا۔ میں جاؤں گا کل خود مفتی صاحب کے پاس' مسئلہ پوچھوں گی۔"

"بابا جان! میں نے آپ سے کہا تا کہ وہ خود یہ نہ کرتا تو میں منع کر دیتا اسے یہاں آنے سے۔"

"لیکن کیوں احسان شاہ کیوں...... کیا کیا ہے مومی نے؟"

"بہتر ہے بابا جان! آپ کچھ مت پوچھیں۔ جو بھرم ہے اسے رہنے دیں۔"

اور اپنی بات کر کے احسان شاہ وہاں رکا نہیں تھا بلکہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور وہ سوچتے ہی رہ گئے تھے کہ آخر احسان کو کس بات پر اتنا غصہ ہے۔ شاید کسی بات پر مومی سے ناراض ہے اور احسان شاہ کی بچپن سے عادت تھی کہ وہ بڑی سے بڑی بات پر بھی نہ ناراض ہوتا تھا نہ برا مانتا تھا لیکن اگر کبھی کسی بات پر ناراض ہو جاتا تو پھر سخت ناراض ہوتا تھا۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ مومی سے زیادہ عرصہ تک وہ ناراض نہیں رہ سکتا اور پھر اگلے دو تین دن احسان شاہ کے منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے ملک ہاؤس کے چکر لگائے تھے اور مفتی صاحب کے پاس جا کر بھی اس مسئلے کو ڈسکس کیا تھا اور مفتی صاحب کے بتانے کے بعد کہ اب کوئی صورت نہیں' وہ اور بھی دل برداشتہ ہوئے تھے' لیکن دل میں یہ امید تو تھی کہ وہ نہیں' ہم تو ملنے جا سکتے ہیں۔

انہوں نے کتنی ہی بار بہاول پور فون کیا تو پتا چلا وہ وہاں نہیں ہے۔ آخر دونوں کہاں چلے گئے۔ پریشان ہو کر وہ پھر احسان کے پاس ہی آئے تھے۔ "الریان" میں صرف وہی تو تھے اس وقت۔

"یہیں اسی شہر میں ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"کیسے پریشان نہ ہوں احسان! غصے میں کچھ کر نہ بیٹھا ہو وہ خدا کے لیے بیٹا! اس کا پتا کرو۔"

"کچھ نہیں کیا اس نے بابا جان! آیا تھا میرے آفس میں مجھ سے ملنے۔ میں نہیں ملا۔"

"کیوں نہیں ملے تم اس سے؟"

"میں اس سے ملنا نہیں چاہتا' نہ آج نہ پھر کبھی زندگی میں۔ اور عمارہ کا فون آیا تھا میرے پاس' میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ ایک کو چھوڑ کر آ جاؤ۔ لیکن اگر اس کے بغیر نہیں رہ سکتی ہو تو لے آؤ اسے بھی' "الریان" کے دروازے اس کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔"

"وہ کیسے آ سکتی ہے یہاں' تم کیا کہہ رہے ہو۔ اس کا مطلب سمجھتے ہو...... وہ اگر یہاں قدم رکھے گی تو اسے طلاق ہو جائے گی۔"

"سمجھتا ہوں بابا جان! اسے کسی ایک کو تو چھوڑنا ہو گا' ہمیں یا مومی کو۔"

"درمیانی راستہ بھی نکالا جا سکتا ہے بیٹا! جو غلطی موی نے کی ہے' اس کا ازالہ تو نہیں ہو سکتا' لیکن ہم انہیں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔ ملنے جا سکتے ہیں۔"

"نہیں' آپ کیسے ملنے جا سکتے ہیں۔ موی نے کہا تھا کہ وہ یا ان کی بیوی اگر "الریان" میں آئی یا ہم لوگوں سے ملی تو......"

یہ مائرہ تھی۔ جو وہیں بیٹھی ان کی اور احسان کی گفتگو سن رہی تھی۔

"نہیں...... نہیں۔" انہوں نے فوراً" بات کاٹی تھی۔ "موی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے ملنے کی بات ہرگز نہیں کی تھی۔"

انہیں پورا یقین تھا' لیکن پھر مائرہ نے اتنی بار اس بات کو دہرایا کہ انہیں یقین سا ہونے لگا "لیکن اس روز جب زارا آئی تھی اور اس نے رو رو کر عمارہ کے پاس جانے کی التجا کی تھی تو وہ یکدم ہی تیار ہو گئے تھے بہاول پور جانے کے لیے اور انہیں موی کا کہا ایک ایک لفظ یاد آ گیا تھا...... اور اماں جان نے بھی اس کی تصدیق کی تھی' تب احسان شاہ نے وہ بات کہہ دی تھی کہ وہ ششدر سے ہو کر رہ گئے تھے۔

"عمارہ نے ہمارے بجائے موی کا انتخاب کیا ہے۔ یہ اس کی اپنی چوائس ہے...... لیکن "الریان" سے اگر کوئی شخص بھی یا عمارہ ملنے جائے گا تو میں قسم کھاتا ہوں کہ اسی وقت خود کو اور مائرہ کو ختم کر دوں گا۔"

اتنی نفرت، اتنا غصہ۔
وہ حیرت سے احسان شاہ کو دیکھتے رہ گئے تھے۔
"آخر ایسا کیا کر دیا ہے اس نے احسان شاہ! مجھے بتا کیوں نہیں دیتے؟" انہوں نے بے بسی سے پوچھا تھا۔
"کچھ نہیں بابا جان! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ اس بات پر پردہ ہی پڑا رہنے دیں۔"
اور وہ خاموشی سے بیٹھ گئے تھے۔ زارا روتی ہوئی چلی گئی تھی۔ کتنے سارے دن یوں ہی گزر گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ ان کے پاس تو کسی کا فون تک نہیں آیا تھا۔ نہ عمارہ کا نہ مومی کا۔ وہ کتنی ہی بار ملازموں سے پوچھتے تھے۔ کوئی فون تو نہیں آیا۔ تب زارا کا فون آیا تھا۔ وہ مجیب کے ساتھ بہاول پور کا چکر لگا آئی تھی۔ عمارہ اور مومی بھائی بہاول پور آگئے ہیں۔ اس نے انہیں اطلاع دی تھی۔
"دونوں کی حالت بہت خراب ہے بابا جان! پلیز آپ اور اماں جان جا کر انہیں مل آئیں۔ بہت روتے ہیں مومی بھائی۔ عمو آپی سے بھی زیادہ ان کی حالت بری ہے۔ بابا جان! پلیز ان کی غلطی کو معاف کر دیں اور ان سے تعلق مت توڑیں۔ آپ ان کے ساتھ ہوں گے تو انہیں یہ غم سہارنے کی طاقت ملے گی "الریان" چھوڑنے کا غم بہت بڑا ہے۔ آپ لوگوں نے بھی چھوڑ دیا تو کیسے سنبھلیں گے۔ تب انہوں نے کتنی بے چینی سے بہاول پور کا نمبر ملایا تھا۔
"عمارہ یا مومی سے بات کروا دو۔"
"جی عمارہ بی بی تو ہاسپٹل گئی ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر تک آجائیں گی آپ پھر فون کر لینا۔"
"عمارہ ہاسپٹل گئی ہوئی ہے۔" انہوں نے اماں جان کو بتایا تھا جو پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔
"ہاں اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں کب سے کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر کے پاس چلی جائے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"
اور پھر دوبارہ فون کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ مائرہ نے شاید احسان شاہ کو بتایا تھا فون کے متعلق تب ہی وہ ان کے کمرے میں چلے آئے تھے۔
"بابا جان! میں نے کہا تھا "الریان" سے کوئی رابطہ نہیں کرے گا نہ ملے گا ان دونوں سے۔"
"یہ رشتے ٹوٹنے والے تو نہیں بیٹا! بیٹی ہے وہ ہماری۔ ایک حماقت اس نے کی ہے۔ دوسری اب ہم کریں۔"
"احسان نے قسم کھائی ہے بابا جان! وہ؟" مائرہ نے آہستگی سے کہا تھا۔
"قسم کا کفارہ بھی ادا کیا جا سکتا ہے بیٹا! احسان نے بھی غصے میں کہہ دیا ہے اب۔"
"میں نے غصے میں بات نہیں کی تھی، سنجیدگی سے کہا تھا اور میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ اگر آپ، اماں جان یا کوئی اور یہاں سے مراد پیلس گیا تو میں ابھی اسی وقت خود کو شوٹ کر لوں گا۔"
انہوں نے جیب سے اپنا پستول نکال لیا تھا۔
"یہ کیا حماقت ہے احسان شاہ!" وہ یکدم گھبرا اٹھے۔
"ڈالو اسے جیب میں خوامخواہ کیوں اٹھا لائے ہو اسے۔"
"خوامخواہ نہیں بابا جان..... میں سچ مچ کہہ رہا ہوں آپ ان سے تعلق رکھیں، ملیں..... لیکن اس سے پہلے میری لاش سے گزر کر جایئے گا۔"
اور وہ تو جیسے ڈھے سے گئے تھے۔
"جاؤ احسان! اپنے کمرے میں اور مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" اس روز اماں جان کے آنسو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں تھمے تھے اور خود انہوں نے رات جاگ کر گزاری تھی۔
"مصطفیٰ! خدا کے لیے جلدی آجاؤ۔" انہوں نے مصطفیٰ کو فون کیا تھا۔
"لیکن ان کے آنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ احسان شاہ نے مصطفیٰ کی بھی کوئی بات نہیں سنی تھی..... ان کی ایک ہی بات تھی۔ میری اور مائرہ کی موت کے بعد۔
مصطفیٰ بھی خاموش ہو گئے تھے۔

"بابا جان! کچھ عرصے بعد احسان کا دل موم ہو جائے گا۔ ابھی تو سختی سے اپنی بات پر اڑا ہوا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ وہ ایسا کر بھی گزرے گا۔ یاد ہے نا بچپن میں اس نے ضد میں آکر ٹیرس سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی۔"
"لیکن کیوں، احسان ایسا کیوں کر رہا ہے مصطفیٰ؟"
"بابا جان! اس سلسلے میں وہ کچھ نہیں کہتا۔ ہمارے لیے اس وقت سب سے اہم احسان کی زندگی ہے۔ کچھ عرصہ بعد ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ حوصلہ رکھیں۔"
لیکن وہ کچھ عرصہ چھبیس سالوں پر محیط ہو گیا۔ انہوں نے اماں جان کی بیماری پر کتنی ہی بار مائرہ سے کہا تھا۔
"عمو کو فون کر دو۔ اسے ماں کی بیماری کا بتا دو۔ وہ بیٹی سے اپنے ان آخری لمحوں میں ملنا چاہتی ہے۔ وہ "الریان" نہیں آسکتی لیکن ہاسپٹل میں تو آسکتی ہے۔"
لیکن اماں جان جب بھی ہوش میں آتیں، عمارہ کا پوچھتیں۔ پتا نہیں مائرہ نے فون بھی کیا تھا یا نہیں۔ تب انہوں نے احسان شاہ سے کہا تھا۔
"شانی بیٹا! اپنی مرتی ہوئی ماں کی آخری خواہش پوری کر دو۔ عمارہ کو لے آؤ اپنی ماں سے ملانے کے لیے....." انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔
"یہ کیا کر رہے ہیں بابا جان!" احسان شاہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔
"میں مائرہ سے کہتا ہوں وہ بہاول پور فون کر کے عمارہ کو بتا دے۔ اماں جان کی بیماری کا اور کہہ دے آنے کو ہاسپٹل میں لیکن اکیلی آئے مومی ساتھ نہ ہو اس کے۔"
اور تب مائرہ نے انہیں بتایا تھا کہ اس نے دو بار عمارہ کو فون کیا تھا لیکن عمارہ نے بتایا ہے کہ اسے مومی نے اجازت نہیں دی آنے کی۔
"نہیں۔" وہ کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے مائرہ کو دیکھتے رہے تھے۔ "مومی ایسا نہیں ہے۔"
"وہ کیسا ہے بابا جان! آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"
احسان شاہ نے آہستگی سے کہا تھا لیکن انہوں نے سن لیا تھا۔
"اور عمارہ کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ مومی نے اسے اجازت نہیں دی ہوگی۔"
اور وہ خاموش ہو گئے تھے اور پھر جب وہ وفات پا گئی تھیں، تب بھی انہوں نے مائرہ کی منت کی تھی۔
"اسے اطلاع کر دو، اپنی ماں کا آخری بار منہ تو دیکھ لے۔"
اور مائرہ نے بتایا تھا کہ اس نے بتا دیا ہے لیکن وہ نہیں آئی تھی۔
جنازہ کی نماز پڑھتے ہوئے، قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے بھی انہیں انتظار تھا کہ وہ آجائیں گے۔ مومی اتنا شقی القلب نہیں ہو سکتا کہ عمارہ کو اس کی ماں کی موت پر بھی نہ آنے دے۔ مگر.....
اور پھر اس روز کے بعد انہوں نے احسان یا مائرہ سے کبھی مومی اور عمارہ کا ذکر نہیں کیا تھا۔ زارا ان سے آکر کتنا لڑی تھی۔
"اماں جان، عمو آپی اور میں بھی اس کے لیے آپ کو معاف نہیں کروں گی۔"
اماں جان کی حسرت بھری نظریں۔ دروازے کی طرف آخری لمحوں تک دیکھتی اور ان سے سوال کرتی نظریں۔
وہ کبھی بھلا نہیں پائے تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ مائرہ نے عمارہ کو فون نہیں کیا ہوگا۔ عمارہ کا اماں جان کی بیماری اور موت کا سن کر بھی نہ آنا۔ احسان شاہ کی حتمی بات انہوں نے بھی سوچ لیا تھا کہ شاید اب عمارہ اور مومی سے ملنا ناممکن ہی ہے۔ جب مصطفیٰ ہمیشہ کے لیے واپس پاکستان آگئے تھے تو ایک بار پھر انہوں نے چاہا تھا کہ احسان شاہ کے دل میں جو کدورت ہے فلک شاہ کے متعلق وہ ختم ہو جائے اور مصطفیٰ سے التجا کی تھی کہ وہ سمجھائے شانی کو..... خون کے رشتے ختم نہیں کیے جا سکتے۔ وہ اپنی فضول قسم کا کفارہ ادا کرے اور انہیں اجازت دے کہ وہ مصطفیٰ

کے ساتھ عمارہ اور اور موی سے جا کر مل آئیں۔
"جب موی نے عمو کو ماں کی بیماری اور موت پر نہیں آنے دیا تو اب آپ کا وہاں جانا کیسے پسند کرے گا۔" یہ مائرہ کا خیال تھا۔
"وہ پسند کرے یا نہ کرے لیکن میں آپ کو واضح طور پر بتا چکا ہوں کہ میری لاش پر سے گزر کر ہی آپ بہاول پور جا سکیں گے۔"
"شانی! اتنی نفرت کہاں سے تمہارے دل میں آکر جمع ہو گئی ہے بیٹا! وہ تو تمہارا یار تھا۔۔۔ تم اسے اپنا دل کہتے تھے۔ کیسے پتھر کر لیا ہے تم نے اپنے دل کو۔"
"اور آپ کے لیے بھی یہی بہتر ہے بابا جان کہ آپ بھی اپنا دل پتھر کر لیں۔ یہی سمجھ لیں کہ عمارہ کبھی تھی نہیں۔"
احسان شاہ سختی سے کہتا ہوا چلا گیا تھا۔
اور انہوں نے بظاہر اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ لیکن وہ اس باپ کے دل کو کیا کرتے جو ہمہ وقت عمارہ کی خوشگوار زندگی کی دعائیں کرتا اور اس سے ملنے کو تڑپتا تھا۔
اس روز کے بعد انہوں نے کبھی عمارہ کی طرف جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی اور چپ سادھ لی تھی۔ ایک بار مصطفیٰ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام کر کہا تھا۔
"بابا جان! میں نے آج مراد پیلس فون کیا تھا۔ عمو اور فلک شاہ ملک سے باہر چلے گئے ہیں۔ شاید انگلینڈ۔"
انہوں نے مصطفیٰ کی بات خاموشی سے سنی تھی اور کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ یہ تو اب عمارہ نے انہیں بتایا تھا کہ موی اور وہ موی کے علاج کی غرض سے انگلینڈ گئے تھے دو ماہ کے لیے کہ شاید ٹانگوں کے وہ ٹشو جو خراب ہو چکے تھے ٹھیک ہو جائیں۔
اس کے بعد جیسے "الریان" سے ان کا ناتا ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا تھا۔ اماں جان زندہ تھیں تو عمارہ اور موی کا ذکر ہوتا تھا۔ اب "الریان" میں وہ کس سے عمارہ اور موی کی بات کرتے۔
احسان شاہ اور مائرہ تو ان کا نام بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ زارا آتی تو بغیر خوف کے ذکر کرتی۔ پندرہ دنوں کے قیام میں بہت بار عمارہ کا ذکر ہوتا۔ وہ ہر بار ان سے "مراد پیلس" چلنے کو کہتی، وہ ہر بار منع کر دیتے۔ احسان شاہ کی بات بتائے بغیر وہ لڑتی ناراض ہوتی اور چلی جاتی تھی۔
انہوں نے کبھی احسان شاہ سے اس کی ایسی درجہ ناراضی کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی شاید وہ ڈرتے تھے کہ اس نے موی کے متعلق کچھ ایسا ویسا کہہ دیا تو وہ کیسے برداشت کریں گے۔
اور پھر ماں کی بیماری اور موت پر عمارہ کے نہ آنے کا انہیں دکھ تھا۔۔۔ جب زارا نے پاکستان آنے کے بعد انہیں بتایا تھا کہ عمارہ کو تو خبر ہی نہیں اماں جان کی وفات کی۔
مصطفیٰ طویل عرصہ بعد پاکستان آکر سیٹل ہوئے تھے۔ مرتضیٰ اور عثمان باہر ہی سیٹل ہو گئے تھے۔ "الریان" میں کون تھا جو عمارہ اور موی کی کمی کو محسوس کرتا اور ان فاصلوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتا۔ مصطفیٰ اپنے بزنس میں مصروف رہتے تھے ہاں شانی جب سے "الریان" میں واپس آئی تھی وہ عمارہ اور موی کا کوئی نہ کوئی ذکر لے کر بیٹھ جاتی تھی۔
وہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتے رہتے تھے۔ انہوں نے لب سی لیے تھے، وہ کچھ نہیں کہتے تھے۔ انہوں نے جیسے اس دکھ کو قبول کر لیا تھا اور حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ پھر زارا کی اچانک موت نے تو جیسے انہیں توڑ کر رکھ دیا تھا۔ زارا کے غم سے نڈھال ہونے کے باوجود ان کی نظروں نے موی کو کھوجا تھا لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا تھا۔
بہن کہتا تھا زارا کو لیکن کتنا سنگ دل ہو گیا کہ نہ بہن کے جنازے کو کندھا دیا اور نہ ہی قبر پر مٹی ڈالی۔
کتنے ہی دن ان کے دل میں یہ خیال آتا رہا تھا۔
انہوں نے سوچا تھا اتنے سالوں بعد وہ عمارہ کو دیکھیں گے۔ وہ باپ سے گلے لگ کر بہن کی موت پر روئے گی لیکن انہیں تو بس عمارہ کی ایک جھلک سی آئی تھی جب وہ زارا کا چہرہ دیکھنے کے لیے اندر آئی تھی۔ وہ زارا کی چارپائی پر جھکی رو رہی تھی۔۔۔ اور جب وہ اسے دفنا کر آئے تھے تو انہوں نے ادھر ادھر اسے کھوجنے کی کوشش کی تھی اور جب وہ کہیں نظر نہ آئی تھی تو انہوں نے شنا سے پوچھا تھا کیا عمارہ چلی گئی؟
"جی بابا جان! وہ تو جنازہ اٹھتے ہی چلی گئی۔"
"اور موی؟" ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
"وہ تو اپنی ملازمہ اور ڈرائیور کے ساتھ اکیلی آئی تھی۔"
اور اس روز انہوں نے سوچا تھا کہ اب شاید کبھی یہ دوریاں ختم نہیں ہوں گی۔۔۔ اور انہوں نے اس روز کے بعد پھر کسی سے تو کیا خود اپنے آپ سے بھی عمارہ اور موی کا ذکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔
واقعات کیسے تانا بانا بن کر غلط فہمیاں بڑھاتے چلے جا رہے تھے۔ یہ تو اب عمارہ نے انہیں بتایا تھا کہ اس روز پتا نہیں کیسے موی کی کرسی الٹ گئی تھی اور وہ فرسٹ فلور کی سیڑھیوں سے نیچے لاؤنج میں گر گئے تھے۔ بہت چوٹیں آئی تھیں انہیں اور کوئی گھنٹے تک انہیں ہوش نہیں آیا تھا۔ زارا کی اطلاع ملی تو وہ آئی سی یو میں تھے۔ ایبک کو ان کے پاس چھوڑ کر وہ پتا نہیں کیسے یہاں پہنچی تھیں اور وہاں پہنچتے ہی ایبک کا فون آ گیا تھا کہ ان کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ لیکن وہ یہ سب نہیں جانتے تھے "اسی لیے تو جب ہمدان "ایبک کو لے کر آیا تھا تو انہوں نے ایک بار بھی اس سے عمارہ اور موی کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ ایبک سے بھی وہ زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے لیکن اسے "الریان" میں دیکھ کر انہیں خوشی ہوتی تھی۔ جسے انہوں نے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔
"بابا جان! آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا۔ میں نے بڑی غلطی کی۔۔۔ بہت تکلیف دی آپ کو، اماں جان کو، عمارہ کو۔۔۔"
فلک شاہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔
"بیٹا! تمہارا کیا قصور۔ بس مقدر میں لکھی تھیں یہ جدائیاں۔"
"بابا جان! اب آپ یہاں رہیں گے نا ہمارے پاس بہت سارے دن۔"
انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
"اور مصطفیٰ بھائی۔ باقی لوگ۔۔۔ شانی۔۔۔ کیا وہ بھی آئیں گے یہاں۔" وہ بچوں کی طرح پوچھ رہے تھے۔
انہوں نے پھر سر ہلا دیا تھا۔
"شانی تو مجھ سے بہت ناراض تھا بہت خفا تھا بابا جان! کیا وہ ابھی تک۔۔۔؟"
"وہ تم سے اتنا کیوں ناراض تھا موی؟" بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
"کیا آپ کو اس نے کبھی نہیں بتایا بابا جان کہ۔۔۔؟"
"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"لیکن وہ تمہارا نام بھی سننا پسند نہیں کرتا۔ اور یہ وہی ہے جس کی وجہ سے عمارہ کی اماں جان اس سے ملنے کی حسرت لیے دنیا سے چلی گئیں۔ اسی نے سب کو زنجیر کر رکھا تھا، ورنہ ہم کیسے دور رہ سکتے تھے تم سے۔"
"ہاں۔۔۔ شانی نے کہا تھا کہ میں "الریان" میں دوبارہ قدم نہ رکھوں اور میں۔۔۔"
انہوں نے ایک گہری سانس لے کر نظریں جھکا لی تھیں۔
"لیکن کیوں۔۔۔ کیوں کی اس نے ایسی بات۔ اس نے مجھے آج تک نہیں بتایا۔ کیا تم بھی نہیں بتاؤ گے موی؟"
"بابا جان!" انہوں نے پرامید نظروں سے انہیں دیکھا۔ "کیا آپ میری بات کا یقین کریں گے؟"
"کیوں نہیں۔"
"میں نے آج تک عمارہ کو بھی کچھ نہیں بتایا۔"
ان کی نظریں جھک گئیں۔
اور انہوں نے سب کچھ کہہ دیا۔ مائرہ سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر اس رات کی بات تک اور بابا جان حیرت سے سب سن رہے تھے۔
"شیر دل اور مروہ پھپھو کو بھی پتا ہے سب۔"
"لیکن مروہ نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔" بابا جان سب جان کر از حد حیران ہوئے تھے۔ "اور اگر مروہ

مجھے بتا دیتیں تو میں ہرگز شانی کی شادی ادھر نہ کرتا لیکن مروہ...."

"سمجھ میں نہیں آتا اس رات عنایت بی بی نے کیوں جھوٹ بولا جبکہ عمارہ میرے کمرے میں تھی۔" وہ بڑبڑائے لیکن ایبک نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے شگفتگی سے کہا۔

"بس اب پرانی باتیں یاد کرکے ڈپریس نہ ہوں۔ جو ہونا تھا' وہ ہو چکا اور چلیں! آپ کو کمرے میں لے چلوں۔ کچھ دیر آرام کرلیں۔"

فلک شاہ نے عمارہ کی طرف دیکھا' جو شاکی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں اور انہوں نے جیسے اس کے دل میں جھانک کر دیکھ لیا تھا۔

"سوری عمو! صرف تمہاری پریشانی کے خیال سے تمہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔"

"اور خود تنہا اتنا بوجھ لیے پھرتے رہے؟"

"تو کیا کرتا' ڈر لگتا تھا کہ تمہیں دکھ ہوگا۔"

"اور مروہ پھپھو.... میں سوچ رہی ہوں' انہوں نے بھی کبھی آج تک نہ فون کیا۔ نہ آئیں سب ہی خفا تھے ہم سے۔"

فلک شاہ کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔ تب ہی انجی ٹرالی دھکیلتی ہوئی لاؤنج میں آگئی۔

"ادھر آؤ بیٹا! میرے پاس آکر بیٹھو۔ تمہیں جی بھر کر دیکھ لوں۔"

بابا جان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔

"زارا کہتی تھی۔ انجی بالکل عمارہ کی طرح ہے۔ تم تو عمو سے بھی زیادہ پیاری ہو۔" انجی کے لبوں پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بابا جان! یہ لیں نا چکن سموسے' میں نے بہت کم مرچیں ڈال کر بنائے ہیں۔"

"میری بیٹی نے بنائے ہیں تو ضرور لوں گا۔"

موضوع بدل گیا تھا۔ سب نے ہنسی مذاق کرتے ہوئے چائے پی اور پھر ایبک انہیں آرام کے لیے سلجوق والے کمرے میں لے گیا تھا۔

"بابا جان! بس اب آپ لیٹ جائیں۔" فلک شاہ اور عمارہ بھی ان کے ساتھ ہی آئے تھے۔

"کچھ دیر آرام کرلیں بلکہ لیٹنے سے پہلے اپنی دوا لے لیں۔"

ایبک کو یاد آیا تھا کہ یہ ان کی دوا کا وقت ہے اور دوا کھانے کے کچھ دیر بعد ہی وہ سو گئے تھے۔ تب ایبک نے فلک شاہ اور عمارہ سے بھی درخواست کی تھی کہ "کچھ دیر آرام کریں۔"

"بابا! آپ تو سکون کے لیے کوئی دوا لے کر سو جائیں۔ انجی نے بتایا ہے کہ آپ پوری رات نہیں سوئے۔ ڈاکٹر نے جو میڈیسن آپ کے لیے تجویز کی ہیں' وہی لے لیں۔"

"آبی!" ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ انہوں نے ایبک کے ہاتھ تھامتے ہوئے بھرائی آواز میں پوچھا۔

"شانی کی غلط فہمی کیسے دور ہوگی بیٹا!"

"بابا جان واپس جاکر ان سے بات کریں گے نا۔"

"لیکن وہ نہیں مانے گا۔ وہ بابا جان کی بات نہیں مانے گا۔ اسے مائرہ پر بہت یقین ہے اور ان چھبیس سالوں میں تو...."

"سب ٹھیک ہو جائے گا بابا جان! ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کی مروہ پھپھو بھی تو ہیں نا۔ آپ ان سے کہیے گا۔ احسان انکل ان کی بات تو سنیں گے نا۔"

"پتا نہیں۔" وہ کچھ مایوس سے تھے۔ جتنی شدید محبت احسان شاہ نے ان سے کی تھی' اتنی ہی شدید نفرت بھی کرلی۔ انہوں نے ان سے اس روز جب وہ ان کے آفس میں گئے تھے ملنے تو انہوں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا کہہ رہا تھا۔

"نفرت ہے مجھے اس شخص سے۔ کہہ دو وہ آئندہ میرے آفس میں قدم نہ رکھے۔"

اور جب انہوں نے فون کیا تھا تو کیا کہا تھا احسان نے۔ ان کی سماعتوں میں وہ لفظ جیسے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے تھے۔

"جتنی شدید محبت میں نے تم سے کی تھی موبی! اب اتنی ہی شدید نفرت کرتا ہوں۔ تمہاری شکل دیکھنا تو درکنار' میں تمہاری آواز سننا بھی نہیں چاہتا بلکہ تمہارا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا۔"

"شانی پلیز! ایک بار میری بات سن لو۔" انہوں نے التجا کی تھی لیکن احسان شاہ نے فون بند کردیا تھا۔

اتنی شدید محبت جب نفرت میں بدل جاتی ہے تو کیا وہ نفرت پھر محبت میں بدل سکتی ہے۔

انہوں نے سوچا تھا' شاید نہیں۔

"بابا! چلیں آپ کو کمرے میں لے جاؤں۔ سو کر اٹھیں گے تو فریش ہو جائیں گے۔"

اور پھر واقعی وہ سو کر اٹھے تو کافی فریش تھے۔ لنچ بہت خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ ان کے اور عمارہ کے بچپن کی۔ سلجوق کی۔ زارا کی باتیں.... چھبیس سال پہلے وہ اتنی زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ دوستانہ رویہ رکھنے کے باوجود وہ سب سے بہت زیادہ بے تکلف نہیں تھے اور ابھی وہ کھانا کھا کر قہوہ پی رہے تھے کہ مروہ پھپھو کا فون آگیا بابا جان پر وہ ناراض ہو رہی تھیں۔

"مجھے کسی نے آپ کی بیماری کا بتایا تک نہیں۔ وہ تو آج میں نے عبداللہ بھائی کو فون کیا تو انہوں نے بتایا۔ "الریان" سے کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ مجھے بھی بتا دیتے۔"

"میں اب ٹھیک ہوں چندا! تم پریشان نہ ہو۔"

"اور یہ آپ "مراد محل" کیسے آگئے۔ میں نے "الریان" میں فون کیا تو پتا چلا کہ آپ یہاں ہیں۔ کیا کوئی گنجائش نکل آئی یا پھر موبی اور عمارہ میں طلاق۔"

"نہیں نہیں مروہ گڑیا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے یہاں آنے میں تو کوئی ممانعت نہیں تھی۔ پہلے ہی بہت دیر کردی ہم نے۔ بہت بھول ہوگئی ہم سے.... بہت دکھ سہے ہیں میری عمو اور موبی نے اک ذرا سی غلطی سے۔"

"ہاں اک ذرا سی غلطی سے۔"

ایبک نے جو عمارہ کے گرد بازو حمائل کیے بیٹھا خاموشی سے سن رہا تھا سوچا۔

"زیست کے سفر میں کچھ
در بھی چھوٹ جاتے ہیں
گھر بھی چھوٹ جاتے ہیں
زیست کے سفر میں پھر
وہ کبھی نہیں ملتا
جو کہ چھوٹ جاتا ہے
ایک ہاتھ ہاتھوں سے
ہاں اک ذرا سی غلطی سے کیا کیا کچھ بکھر جاتا ہے۔"

اس نے سر جھٹک کر بابا جان کی طرف دیکھا' جو کہہ رہے تھے۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مروہ بچے! موبی نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ تم نہیں جانتیں احسان نے اسے "الریان" میں آئندہ قدم نہ رکھنے کو کہا تو غصے میں اس کے منہ سے وہ نکل گیا جس کی اذیت مرتے دم تک ہم سب کے دلوں کو کاٹتی رہے گی۔"

"لیکن بابا جان! مجھ سے تو مائرہ نے کہا تھا کہ موبی نے کہا ہے کہ اگر ہمارے خاندان کے کسی بھی فرد سے اس نے یا عمو نے بات کی یا ملے تو...."

"جھوٹ بولا تھا اس نے مروہ! یہ سارا کیا دھرا اسی کا تو ہے۔ کاش! تم شروع میں ہی سب کچھ بتا دیتیں۔"

ان کی آواز بلند ہوگئی تھی اور ہاتھ کانپنے لگے تھے' تب پاس ہی اپنی کرسی پر بیٹھے فلک شاہ نے ان کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا تھا۔

"مروہ پھپھو! آپ نے بھی اتنے سالوں میں ہماری خبر نہیں لی۔ پوچھا تک نہیں کیا گزری ہم پر' آپ کی عمارہ پر...."

"موبی.... ! موبی! یہ تم ہو نا۔" مروہ پھپھو بے قراری سے پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں پھپھو! میں ہی ہوں۔"

"یقین کرو موبی! کتنا دل چاہا جب میں پاکستان آئی اور اس سب کا پتا چلا تو کتنا تڑپی میں عمارہ کے لیے.... بہت پیار ہے مجھے اس سے۔

جب وہ پیدا ہوئی تھی تو بھابھی جان سے زیادہ میرے

پاس رہتی تھی۔ لیکن مائرہ ہم سے ملنے رحیم یار خان آئی تھی اور اس نے سختی سے منع کیا تھا' مجھے تم لوگوں سے ملنے اور فون کرنے سے کیونکہ اس طرح...... اور میں کیا نہیں جانتی تھی کہ عمارہ اور تم ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہو۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے تم دونوں میں علیحدگی ہو جائے۔ مجھے پتا تھا زارا تم سے ملتی ہے۔ لیکن مائرہ نے بتایا تھا کہ زارا کے علاوہ...... اور پھر تین منٹ کی کال میں خیر خیریت کے علاوہ کبھی لمبی بات ہی نہیں ہوئی۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی۔

"جو وقت گزر گیا وہ پلٹ نہیں سکتا مروہ پھپھو! ہماری غلطی کی بہت بڑی سزا ملی ہے ہمیں۔ آپ سب نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اکیلا کر دیا اور شانی تو نفرت کرنے لگا ہے مجھ سے۔"

"کیوں؟" مروہ کو حیرت ہوئی تھی۔

"مجھے بتاؤ تفصیل سے مومی! وہ تو تم سے بہت محبّت کرتا تھا اور پھر مائرہ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ شانی کے ساتھ بہت مخلص ہے اور بہت محبّت کرنے لگی ہے اس سے اور یہ کہ ماضی میں اس نے جو کچھ کہا تھا وہ سب بھول جاؤں اور کبھی ذکر نہ کروں کسی سے۔ وہ بہت روئی تھی اس روز اپنی بے وقوفی پر اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی کسی سے ذکر نہیں کروں گی...... پھر ایسا کیا ہو گیا مومی! کیا پھر وہ۔"

"نہیں پھپھو! اس نے کہا تھا کہ وہ میری زندگی جہنّم بنا دے گی۔ اپنی بے عزّتی کا انتقام لے گی اور اس نے لے لیا پھپھو!"

فون بند ہو گیا تھا۔ انہوں نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ یکدم ہی ماحول میں افسردگی چھا گئی تھی۔ ایک نے قریب آ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا اور مسکرایا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر وہ بھی زبردستی مسکرائے تھے اور خود کو کمپوز کرتے ہوئے وہ جواد کی طرف متوجہ ہو گئے تھے' جو جانے کی اجازت لے رہا تھا۔

"جواد بیٹا! فارغ ہو کر ادھر ہی آنا۔ تم سے مل کر جی نہیں بھرا۔ اللہ تمہیں اور انجی کو بہت ساری خوشیاں دے۔"

"آپ بے فکر رہیں۔ آپ جب تک یہاں ہیں۔ میں ادھر سے ہٹوں گا ہی نہیں۔"

بابا جان مسکرا دیے۔

یہ منظر خوابوں میں' خیالوں میں کتنی بار انہوں نے دیکھا تھا لیکن یہ ابھی نامکمل تھا۔ اس منظر کو بھرتا تھا۔ مصطفیٰ' احسان' عثمان' مرتضیٰ بھائی...... وہ تصور ہی تصور میں ان سب سے اس منظر کو بھرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور ان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

زور سے آنکھیں میچتے ہوئے انہوں نے ٹریگر پر انگلی دبا دی۔ انہیں لگا جیسے ان کا ہاتھ اکڑ گیا ہو اور انگلیاں پتھر کی ہوں' جنہیں وہ حرکت دینے سے قاصر ہوں۔ انہوں نے دانت پر دانت جما کر پوری قوت سے ٹریگر دبانے کی کوشش کی لیکن ان کی انگلی نے حرکت نہیں کی۔ گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سے چونک کر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ گاڑی زن سے کوڑے دان کے پاس سے گزر کر روڈ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ پستول پر ان کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ پستول ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ وہ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اپنے پاؤں کے پاس پڑے پستول کو دیکھتے رہے۔ ان کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے چہرے سے پسینہ پونچھا ...... اور جھک کر پستول اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے مرے مرے قدموں سے سر جھکائے چلتے ہوئے روڈ پر آ گئے۔ اسٹاپ پر رکھے بینچوں میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے جیب سے رومال نکال کر ایک بار پھر ماتھے سے بہتے پسینے کو پونچھا۔ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ تھوک نگل کر انھوں نے خشک حلق کو تر کرنے کی کوشش کی۔

دو لڑکیاں باتیں کرتی ہوئی ان کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ غالباً" کسی آفس میں کام کرتی ہوں گی اور اب چھٹی کے بعد واپس گھر جا رہی ہوں گی۔ ایک لڑکی کے ہاتھ میں تھرماس تھا۔ لڑکی نے اس میں سے پانی نکال کر پیا اور پھر پانی پیتے پیتے اس کی نظر ان پر پڑی تھی' جو بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر بہتے پسینے کو صاف کرتے۔

"انکل! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" لڑکی انہیں ہمدردانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے پھر اپنے خشک ہو جانے والے ہونٹوں پر زبان پھیری تو لڑکی نے تھرماس کے ڈھکن میں پانی ڈال کر ان کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے متشکر نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پانی لے لیا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے انکل!" خالی ڈھکن واپس لیتے ہوئے لڑکی نے پوچھا۔

"سمن آباد۔"

"پتا نہیں آپ کے روٹ کی وین یا بس کب آئے۔ آپ رکشا کیوں نہیں کر لیتے۔ مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ یہاں سے رکشے والا زیادہ پیسے نہیں لے گا۔"

لڑکی بات کر کے اپنا پرس کھولنے لگی تھی۔

"نہیں...... نہیں بیٹا! میرے پاس رقم ہے۔"

وہ اس کا ارادہ سمجھ کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب سے گزرتے ہوئے رکشے کو اشارے سے رکنے کے لیے کہا اور مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔

"جیتی رہو بیٹا! اللہ تمہارا نصیب اچھا کرے۔"

اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کے ہاتھ لرزنے لگے تھے اور آواز بھرّا گئی تھی۔

وہ اسے دعا دے کر تیزی سے رکشے کی طرف بڑھ گئے۔ رکشے والا آواز لگا رہا تھا۔

"میاں صاحب جلدی کریں۔" انہوں نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی وہیں کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"میاں صاحب!" رکشے والے نے پھر کہا تو وہ تیزی سے رکشے میں بیٹھتے ہوئے بولے۔

"سمن آباد" اور رکشا جھٹکا کھا کر ہوا ہو گیا۔

"کون کہتا ہے کہ ہماری نئی نسل سب ادب و آداب بھول بیٹھی ہے۔ پتا نہیں کیوں ہم اپنی نئی نسل سے مایوس ہو گئے ہیں اتنی جلدی حالانکہ...... میں...... میں بھی تو مایوس ہو گیا تھا......" وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔

"اگر اس روز میں اسے اپنے پاس بٹھا کر سمجھاتا' غلط اور صحیح کا ادراک دیتا تو شاید۔ ایک چانس تو مجھے اسے دینا چاہیے تھا۔ اگر نہ سمجھتا تو...... لیکن اب...... اب کیا فائدہ۔ اب تو پانی سر سے گزر چکا۔"

ایک بار پھر بہت سارے پچھتاووں نے انہیں گھیر لیا۔ ان کی خشک آنکھوں میں نمی اتر آئی اور آنسو ان کے اندر گرنے لگے۔

"میں بہت کمزور ہوں۔ بہت بزدل ہوں۔ میں اس پر گولی نہیں چلا سکا۔ میرے ہاتھوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔"

انہوں نے ہاتھ پھیلا کر اپنے ہاتھوں کو غور سے دیکھا اور پھر جیب تھپتھپا کر پستول کی موجودگی کو محسوس کیا۔

دو سال پہلے جب آس پاس کے ایک دو گھروں میں ڈاکا پڑا تھا۔ یہ پستول وہ ہی پشاور سے لایا تھا اور اسی نے بھاگ دوڑ کر لائسنس بنوایا تھا اور اب اسی پستول کی گولی وہ اس کے سینے میں اتارنے کے لیے آئے تھے۔ آج اس نے جھوٹے نبی کی گواہی دی تھی۔ ایک شخص کو نعوذ باللہ نبی تسلیم کیا تھا۔ کل کو وہ خود بھی نبوت کا دعوا کر سکتا تھا۔

"یا اللہ! مجھے ہمت عطا کر۔"

وہ یکدم دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگے۔ رکشے والے نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

"میاں صاحب...... خیریت ہے نا۔"

وہ پوچھ رہا تھا...... اور وہ ہچکیاں لے لے کر روتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ "میں بہت کمزور ہوں۔ میں کچھ

نہیں کر سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ اور لوگ ہوتے ہیں "قرطبہ کے قاضی" جیسے۔ اپنی ہی اولاد کے خلاف فیصلہ سنانے والے.... میرے جیسے کمزور دل تو....؟"

"ہاں!" انہوں نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

گھر آ گیا تھا۔ انہوں نے کرایہ ادا کیا۔

رکشہ سے اتر کر بیل پر ہاتھ رکھا لیکن فوراً" ہی اٹھا لیا۔ اب وہ پھر مڑ کر گلی سے باہر روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ روڈ پار کر کے وہ دوسرے روڈ پر آ گئے۔ یہاں انہوں نے کچھ ہی دن پہلے ایک پی سی او دیکھا تھا۔ دل ہی دل میں پختہ ارادہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنے والٹ سے ایک کارڈ نکالا.... یہ کارڈ بہت دن پہلے اس ایس ایچ او نے دیا تھا جو احمد رضا کو تفتیش کے لیے گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر کبھی اس کذاب کے ٹھکانے کا علم ہو تو اس نمبر پر فون کر دینا۔

کچھ دیر ہاتھ میں لیے وہ متذبذب سے کھڑے رہے پھر پی سی او کی طرف بڑھے۔

"ایک فون کرنا ہے جناب!"

"کیبن میں بیٹھے ہوئے شخص نے جو کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا' ناول سے نظریں ہٹا کر انہیں دیکھا۔

"فون خراب ہے۔ کمپلین کر رکھی ہے۔ کچھ دیر بعد آئے گا۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے سر ہلایا اور واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ مٹھی میں دبا ہوا کارڈ انہوں نے جیب میں رکھ لیا تھا۔ اندر کہیں گہرائی میں اطمینان سا پھیل گیا تھا۔ پولیس گولی بھی چلا سکتی تھی.... اور وہ گولی کسی کو بھی لگ سکتی تھی' احمد رضا کو بھی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھٹکے اور پھر تیز تیز چلنے لگے۔

وہ گھر سے بھی فون کر سکتے تھے' لیکن انہوں نے سوچا تھا کہ وہ گمنام آدمی کی حیثیت سے فون کر کے پولیس کو بتا دیں گے کہ وہ کذاب کہاں چھپا ہوا ہے اور احمد رضا....

احمد رضا تو محض اس کا مرید ہے۔ امید ہے پولیس اسے چھوڑ دے گی اور نہ بھی چھوڑا تو وہ وکیل کر لیں گے۔ اچھا ہے تھوڑی سزا ہو جائے گی تو اسے بھی عقل میں آ جائے گی۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ تین چار وکیلوں کے متعلق سوچ چکے تھے۔ جن سے کسی نہ کسی ذریعے سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔

"ابو! آج پھر آپ کو دیر ہو گئی۔" سمیرا برآمدے میں ہی بیٹھی تھی۔

"ہاں بیٹا! ان دنوں کام زیادہ ہے کچھ۔" وہ اس کے پاس تخت پر ہی بیٹھ گئے۔

"ابو! آپ ڈھونڈنے گئے تھے رضی کو؟" سمیرا انہیں دیکھ رہی تھی۔ "کچھ پتا چلا؟" وہ اس کی بات سن کر چونکے' پھر بے اختیار ان کا سر نفی میں ہل گیا۔

"آپ دو دن سے دفتر نہیں جا رہے۔ آپ کے دوست ہیں نا قاضی صاحب' ان کا فون آیا تھا۔ آپ کی طبیعت پوچھ رہے تھے۔"

سمیرا نے نظریں جھکا لی تھیں۔ حسن رضا خاموش ہی رہے تھے۔

"کیا کچھ اندازہ ہے آپ کو کہ وہ کہاں ہو گا؟"

"نہیں...." انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ اپنی پینٹ کی جیب کی طرف بڑھا۔

"ابو! یہ آپ کی پاکٹ میں کیا ہے؟" سمیرا کی نظریں ان کی ابھری ہوئی پاکٹ پر تھیں۔

"وہ.... یہ۔" بالکل غیر ارادی طور پر انہوں نے پستول جیب سے نکالا۔

"یہ...." سمیرا کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ "آپ.... ابو! آپ اس لیے رضی کو ڈھونڈ رہے ہیں کہ اسے...؟"

وہ ایک دم پیچھے ہٹی تھی اور بے حد خوفزدہ سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

"نہیں' نہیں.... میں بھلا کیسے.... نہیں' میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اسے نہیں مار سکتا۔ کبھی بھی نہیں.... میں ایک کمزور دل باپ ہوں۔ میرے سینے میں صرف ایک باپ کا دل دھڑکتا ہے۔ صرف باپ کا دل

جو اپنے مرتد بیٹے کو قتل نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ نبوت کا دعوا کر لے۔ چاہے وہ...."

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے۔

سمیرا نے جو خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی یکدم ان کے قریب ہوتے ہوئے ان کے بازو پر ہاتھ رکھے۔

"ابو پلیز روئیں نہیں پلیز ابو!" وہ ہولے ہولے ان کا بازو تھپتھپا رہی تھی۔ لیکن وہ روئے چلے جا رہے تھے۔ روتے روتے انہوں نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر سمیرا کی طرف دیکھا۔

"پتا ہے سمیرا! ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کے بیٹے نے کہا۔ اسلام لانے سے پہلے جب ایک جنگ میں میرا آپ کا سامنا ہوا تو میں نے تلوار نیچے کر لی اور وہاں سے ہٹ گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "بخدا! اگر تم میرے سامنے آتے تو میں ہرگز اپنی تلوار نیچے نہ کرتا۔"

یہ وہ قوت ایمانی ہے جو مجھ میں نہیں ہے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو بس دعا کر سکتا ہوں۔ رو سکتا ہوں۔ توبہ کر سکتا ہوں۔ شاید وہ سن لے۔ شاید وہ تائب ہو جائے' شاید اس کا دل پلٹ جائے۔"

"اس کا دل ضرور پلٹے گا ابو! مجھے یقین ہے۔ وہ ضرور تائب ہو گا۔ اس سے غلطی ضرور ہوئی ہے لیکن غلطیوں کی معافی مل جایا کرتی ہے۔ اللہ تو بہت رحیم و کریم ہے۔ وہ توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی توبہ قبول کرے گا۔"

"ہاں ضرور۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر سمیرا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ اب وہ دونوں رو رہے تھے' تب ہی زبیدہ نے کمرے کے دروازے سے جھانک کر انہیں دیکھا اور باہر آ گئیں۔

"یہ کیا مغرب کے وقت باپ بیٹی نے رونا دھونا مچایا ہوا ہے۔ اللہ خیر کرے میرا بیٹا سلامت رہے۔ خوش رہے۔ دونوں وقت مل رہے ہیں اور تم...."

وہ بات ادھوری چھوڑ کر واپس مڑ گئی تھیں۔ سمیرا نے الگ ہوتے ہوئے جلدی سے آنکھیں صاف کر لیں اور حسن رضا کی طرف دیکھا۔

"ابو! آپ وضو کر لیں۔ مغرب کی اذان ہونے ہی والی ہے۔ نماز پڑھ لیں' پھر کھانا لگا دیتی ہوں۔"

"نہیں' بھوک نہیں ہے بیٹا!"

"صبح سے بھوکے ہیں۔ مجھے پتا ہے آپ نے کچھ کھایا نہیں ہو گا۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے تخت پر پڑا پستول اٹھا لیا۔

"نہیں.... نہیں ادھر دو۔ بھرا ہوا ہے۔ احتیاط سے۔"

انہوں نے اس کے ہاتھ سے پستول لے لیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ سمیرا وہیں برآمدے میں حیران سی کھڑی تھی۔

"ابو بھرا ہوا پستول لے کر رضی کو ڈھونڈنے گئے تھے۔ اللہ کرے رضی کبھی نہ ملے ابو کو۔" اس نے زیر لب کہا تھا اور پھر ایک جھرجھری سی لے کر فوراً" ہی دعا مانگی تھی۔

"یا اللہ! نہیں.... رضی آ جائے۔ واپس آ جائے۔"

وہ پھر وہیں تخت پر بیٹھ کر دعا مانگنے لگی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی۔ مغرب کی اذانیں کب کی ہو چکی تھیں۔ دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ پورے وجود میں یکدم کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا.... اس کے لبوں سے ایسی غلط بات کیوں نکلی "یا اللہ! رضی آ جائے' ابھی آ جائے' آج ہی کل ہی...."

وہ بمشکل نماز کے لیے اٹھی تھی۔ نماز پڑھ کر اس نے چائے کے لیے پانی رکھا اور ساتھ ہی سالن گرم کرنے لگی۔ ابو صبح سے بھوکے ہیں۔ ناشتے میں بھی کچھ نہیں لیا تھا۔

جلدی جلدی ٹرے میں سب سامان لگایا اور کمرے میں آئی۔ حسن رضا آنکھیں موندے بیڈ پر نیم دراز تھے اور زبیدہ ابھی تک جاء نماز پر بیٹھی تھیں۔

"ابو! کھانا کھا لیں۔" اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی۔

"میں نے کہا تھا بیٹا! مجھے بھوک نہیں ہے۔"

"تھوڑا سا کھا لیں ابو! میں پھر چائے لے کر آ رہی

ہوں۔"

وہ ایک بار پھر انہیں کھانے کی تاکید کرتی ہوئی چلی گئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور سائیڈ ٹیبل سے ٹرے اٹھا کر بیڈ پر رکھی۔ ڈونگے کا ڈھکن اٹھایا۔ قیمہ کریلے پکے تھے۔

احمد رضا کو قیمہ کریلے بہت پسند تھے۔ فرمائش کر کر کے پکوایا کرتا تھا۔

"اماں جانی! آپ کے جیسے قیمہ کریلے پورے پاکستان میں کوئی بھی نہیں بنا سکتا۔" وہ موڈ میں ہوتا تو کہتا تو وہ اسے چڑانے کو کہتے تھے۔

"نہیں محترم! میری اماں جیسے قیمہ کریلے تو تمہاری اماں مر کر بھی نہیں پکا سکتیں۔"

"اف!" ان کے لبوں سے سسکی نکل گئی اور انہوں نے ڈونگے پر ڈھکن رکھ دیا۔

زبیدہ جو نماز پڑھ کر ان ہی کی طرف دیکھ رہی تھیں جاءنماز ایک طرف رکھ کر بیڈ کے قریب آئیں۔

"آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا؟" انہوں نے سر اٹھا کر زبیدہ کی طرف دیکھا۔

"تم نے یہ قیمہ کریلے......"

"مجھے لگا تھا جیسے وہ آج آجائے گا۔ اتنے بہت سارے دن وہ کہاں ہمارے بغیر رہ سکتا ہے۔" وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"یاد ہے نا جب آپ کے تایا جان کا انتقال ہوا تھا تو ہم رحیم یار خان گئے تھے۔ ہمیں وہاں کچھ زیادہ دن لگ گئے تھے اور رضی اپنے امتحان کی وجہ سے یہاں تھا پھر یاد ہے، جب ہم واپس آئے تھے تو وہ رو پڑا تھا حالانکہ دسویں میں پڑھتا تھا۔"

"ہاں۔۔۔ کہتا تھا میں آئندہ کبھی اتنے بہت سارے دن آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سن لیں اب آپ جب کبھی رحیم یار خان یا کہیں اور جائیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ امتحان بے شک ہوتے رہیں۔" انہوں نے ٹرے اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کرتے ہوئے زبیدہ کی طرف دیکھا۔

"تو کیا اس نے صبر کر لیا ہے۔ صبر آگیا ہے اسے؟" زبیدہ کے چہرے پر وہ پہلے جیسی بے چینی اور بے سکونی نہیں تھی۔

"جھوٹی امیدوں نے اسے بہلا لیا ہے۔"

زبیدہ کے چہرے سے نظریں ہٹا کر انہوں نے ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے آواز بلند کی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔

"آج شام ایک مخبری اطلاع پر ایک جگہ چھاپا مارا گیا۔ جہاں اسماعیل کذاب کے کارندے میٹنگ کر رہے تھے اور......"

وہ سانس روکے ٹی وی کی طرف دیکھ رہے تھے اور انہیں سوائے نیوز کاسٹر کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، جیسے ان کے اردگرد ساری آوازیں مر گئی تھیں۔ انہیں سمیرا کے دروازہ کھولنے کی آہٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔

"جس مکان پر چھاپا مارا گیا تھا وہاں کوئی تقریب ہو رہی تھی۔"

نیوز کاسٹر اب خبروں کی تفصیل بتا رہا تھا۔

"آج شام بوقت مغرب خفیہ اطلاع پر مکان کے گرد گھیرا ڈالا تاکہ اسماعیل کذاب اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کیا جا سکے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے فساد پھیلنے کا خطرہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے نبوت کے جھوٹے دعوے کی وجہ سے مذہبی حلقوں اور عام لوگوں میں سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے بلکہ شبہ ہے کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں بھی ملوث تھا۔ تاہم وہ لوگ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ غالباً کوئی خفیہ راستہ تھا۔"

انہوں نے بہت دیر سے رکی ہوئی سانس کو خارج کیا اور ان کی نظریں سمیرا سے ملیں، جن میں شکوک کے سائے لہراتے نظر آئے تھے انہیں۔ بے اختیار نفی میں ان کا سر ہلا۔

"ابو! چائے لے لیں۔"

سمیرا کی آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑا۔ انہوں نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور زبیدہ کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہت آہستگی کے ساتھ نکل نکل کر ان کے رخساروں پر سے ہوتے ہوئے گردن تک آرہے تھے۔

"تم نے اپنی امی کو چائے نہیں دی۔"

انہوں نے ریموٹ سے ٹی وی بند کرتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

"نہیں! انہوں نے منع کر دیا تھا۔"

"زبیدہ! مت رو۔ اس طرح اللہ رحم کرے گا اس پر بھی اور ہم پر بھی۔"

انہوں نے چائے کا کپ بھی ٹرے میں رکھ دیا اور زبیدہ کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔ زبیدہ اسی طرح بیٹھی تھیں اور آنسو یونہی خاموشی اور آہستگی سے بہہ رہے تھے۔ سمیرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"ابو! کیا رضی بھی...... رضی بھی ان کے ساتھ ہو گا؟"

"پتا نہیں......" انہوں نے سمیرا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ زبیدہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ابو! اگر پولیس والے کامیاب ہو جاتے تو کیا وہ رضی کو بھی پکڑ لیتے...... جیل میں ڈال دیتے؟"

سمیرا کے ذہن میں بہت سارے سوالوں کے بھنور بن اور ٹوٹ رہے تھے۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ابو سے کیا پوچھے۔ وہ کیا جاننا چاہتی تھی اسے ابھی یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کون سا اتنی بڑی ہو گئی تھی۔ فرسٹ ائیر کی طالبہ ہی تو تھی۔ بے شک زبیدہ کی تربیت اور گھر کے ماحول نے اسے اپنی ہم عمر لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ بردبار، زیادہ سمجھدار بنا دیا تھا۔ پھر بھی یہ سب، جو ان کے ساتھ ہوا تھا، وہ اسے سہہ نہیں پا رہی تھی۔

"ابو! کیا آپ کو پتا تھا کہ رضی اور وہ لوگ کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے اس گھر کا پتا تھا آپ کو؟"

بہت دیر سے وہ سوال جو اس کے ذہن میں کلبلا رہا تھا لبوں پر آگیا۔ آنکھوں کے سامنے تخت پوش پر پڑا ہوا پستول آگیا تھا۔

"نہیں! مجھے اس گھر کا علم نہیں تھا۔"

انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور ہاتھ بڑھا کر زبیدہ کے آنسو پونچھنے چاہے۔

سمیرا کھڑی ہو گئی۔

"ابو۔" اس نے ٹرے اٹھاتے ہوئے چائے کے کپ کو دیکھا جو اسی طرح بھرا پڑا تھا۔

"لے جاؤ بیٹا! کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا۔"

"ابو!" اس نے پھر کہا۔ "اگر کبھی رضی کے کسی ٹھکانے کا پتا چلے تو اکیلے جانے کے بجائے مجھے بھی ساتھ لے جائیے گا۔ وہ میری بات ضرور سنے گا اور سمجھے گا بھی۔"

اس کے لہجے میں یکدم ہی ایک یقین سا، مان سا آ گیا تھا۔ انہوں نے سر ہلا دیا اور وہ ٹرے اٹھائے کمرے سے باہر چلی گئی تو ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے زبیدہ کے بازو سے ہاتھ ہٹا لیا۔

"میں کچھ دیر لیٹوں گا زبیدہ! اگر آنکھ لگ گئی تو عشاء کے لیے جگا دینا۔"

زبیدہ نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے چہرہ صاف کیا اور دروازہ بھیڑ کر باہر چلی گئیں تو انہوں نے لیٹتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

"پتا نہیں کون تھا وہ، جس نے مخبری کی۔ جانتے تو وہ بھی تھے لیکن ہمت نہ کر پائے تھے۔ پتا نہیں اب کہاں گئے ہوں گے وہ لوگ۔"

یونہی سوچتے سوچتے جانے کب ان کی آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ وہ زبیدہ کے جگانے پر ہی اٹھے تھے اور عشاء پڑھ کر دعا مانگتے ہوئے انہوں نے عہد کیا تھا کہ آج کے بعد وہ رضی کے متعلق سوچیں گے بھی نہیں۔ یہی سمجھیں گے کہ ان کا کوئی بیٹا تھا ہی نہیں۔ وہ نہ تو اسے تلاش کریں گے اور نہ اس کے پیچھے بھاگیں گے لیکن یہ عہد کرتے ہوئے وہ ہرگز نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکیں گے۔ لوگ انہیں بھولنے نہیں دیں گے۔ نماز پڑھ کر وہ خاموشی سے بیڈ پر آکر لیٹ گئے اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگے تھے۔

اگلی صبح وہ معمول کے مطابق اٹھے تھے پچھلے کئی دنوں کی طرح انہوں نے گھر میں ہی نماز پڑھی اور جب تیار ہو کر دفتر جانے کے لیے باہر نکلے تو گلی کے نکڑ پر انہیں فیاض صاحب مل گئے۔

"ارے حسن رضا صاحب! آج کل کہاں ہوتے ہیں آپ۔ مسجد میں بھی نظر نہیں آتے۔"

"جی بس کچھ طبیعت خراب تھی۔"

"احمد بھی نظر نہیں آیا کئی دنوں سے۔ کہیں گیا ہوا ہے کیا؟"

"جی!" انہوں نے قدم آگے بڑھانا چاہا۔

"وہ میں نے سنا تھا۔" انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور رازدارانہ انداز میں بولے۔

"وہ جو ہے نا اپنا کریانے والے کا بیٹا علی ..... وہ کہہ رہا تھا کہ احمد رضا کی تصویر چھپی تھی اخبار میں۔ کسی جھوٹے نبی کے ہاتھ پر بیعت کرلی ہے۔ کیا سچ ہے یہ؟"

ایک لمحہ کے لیے انہیں اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا تھا لیکن انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے فیاض صاحب کی طرف دیکھا۔

"میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جب واپس آئے گا تو پتا چلے گا۔"

"کہاں گیا ہوا ہے؟"

فیاض صاحب کی متجسس نظریں جیسے انہیں اپنے وجود میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"رحیم یار خان گیا ہوا ہے۔" انہوں نے قدم آگے بڑھائے۔

"دفتر سے دیر ہو رہی ہے ان شاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔" وہ فیاض صاحب کی بات سنے بغیر آگے بڑھ گئے اب پتا نہیں فیاض صاحب نے ان کی بات کا یقین کیا تھا یا نہیں لیکن۔

یہ تو ہونا ہی تھا۔ ایسی باتیں بھی بھلا کبھی چھپی ہیں۔ آج فیاض صاحب نے پوچھا، کل ملک صاحب استفسار کریں گے، پھر کوئی اور، پھر محلے کی عورتیں آکر زبیدہ کو کریدیں گی۔

وہ سر تھام کر اسٹاپ پر موجود بینچ پر بیٹھ گئے۔

اب انہیں بہت ساری نظروں کا سامنا کرنا تھا۔ ترس کھاتی۔ ہمدردی جتاتی۔ طنز کرتی، مذاق اڑاتی، ہر طرح کی نظریں..... وہ چاہتے ہوئے بھی احمد رضا کو اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتے تھے۔ اس کی ولدیت کے خانے میں ہمیشہ ان ہی کا نام رہنا تھا۔

اگلے کئی دن تک خاموشی رہی۔ فیاض صاحب کے بعد کسی نے ان سے احمد رضا کے متعلق کچھ نہیں پوچھا تھا۔ یوں بھی انہوں نے خود کو گھر اور آفس تک محدود کرلیا تھا۔ اب وہ ساری نمازیں گھر میں ہی پڑھ رہے تھے۔ گھر میں اخبار نہیں آتا تھا اب لیکن دفتر میں وہ اخبار ضرور پڑھتے اور اسماعیل کے متعلق دی گئی چھوٹی سی خبر کو بھی وہ کئی کئی بار پڑھتے یوں ہی بلاوجہ۔

پھر پتا نہیں کہاں سے کچھ پاپارازی قسم کے صحافی ان کی کھوج لگا کر ان کے گھر تک پہنچ گئے۔

"احمد رضا آپ کا بیٹا ہے؟"

"جی!" وہ اس کی ولدیت سے انکار نہیں کرسکتے تھے۔

"کہاں ہے؟"

"مجھے علم نہیں۔"

"کیوں؟" صحافیوں کی متجسس نظریں انہیں کھوج رہی تھیں۔

"میں نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔"

ہم نے آس پڑوس سے سنا ہے وہ بڑا فرماں بردار اور مہذب بچہ تھا۔ پھر وجہ گھر سے نکالنے کی؟"

"ابلیس بھی پہلے اللہ کا بہت عبادت گزار اور برگزیدہ تھا۔"

"کیا آپ سے رابطہ ہے ان کا؟"

"نہیں۔" وہ ان سے جان چھڑانا چاہتے تھے لیکن وہ تو جیسے انہیں زچ کرنے پر تلے تھے۔

"یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ گھر والوں سے رابطہ نہ رکھے؟"

"میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں اسے گھر سے نکال چکا ہوں۔"

"اوہ ہاں!"

بڑی مشکل سے انہوں نے ان سے جان چھڑائی تھی۔

لیکن پھر تو جیسے سب کے لیے راستے کھل گئے تھے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی چلا آتا۔ کبھی دفتر میں کبھی گھر میں۔ ایک صحافی تو ان کا انٹرویو کرنا چاہتا تھا اور بار بار اصرار کر رہا تھا۔

"کیا یہ میرا گناہ ہے کہ اللہ نے مجھے اس کا باپ بنایا؟ ہر آدمی کو اپنے حصے کا بوجھ اٹھانا ہے۔ اسے ڈھونڈو، اس سے جا کر ملو۔ اس سے پوچھو جو پوچھنا ہے۔" وہ تلخ ہوئے تھے۔

"سر! وہ کہاں ملیں گے۔ کوئی پتا ٹھکانہ ہے تو لکھوا دیں۔"

"اللہ کا واسطہ! میری جان چھوڑ دو۔ ہمارے لیے وہ مر چکا ہے۔ اسی روز مر گیا تھا۔ جب اس نے اس ملعون کی تعریف کی تھی اور اسے سچا قرار دیا تھا۔"

انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے تھے اور اندر ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس کھڑی سمیرا کانپ گئی تھی۔

"نہیں! وہ ہمارے لیے کبھی نہیں مر سکتا۔ ہمارے لیے وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بھلے وہ جہاں بھی رہے۔"

اگلے بہت سارے دن وہ بہت زیادہ مصروف رہے تھے۔ آفس سے اٹھ کر وہ مختلف پراپرٹی ڈیلرز کے پاس جاتے رہتے تھے۔ گھر میں انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ اندھیرا پڑنے پر ہی وہ گلی میں قدم رکھتے تھے اور ادھر ادھر دیکھے بغیر سر جھکائے اپنے گھر کی طرف بڑھ جاتے۔ اگر کوئی سلام کرتا تو یونہی سر جھکائے سلام کا جواب دیتے۔ انہیں لگتا تھا جیسے محلے کا ہر فرد انہیں ہمدردی اور ترحم بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ کبھی لگتا جیسے سب کی نظروں میں ان کے لیے نفرت اور تمسخر ہے۔ کچھ پہلے تک گلی میں وہ سر اٹھا کر فخر سے چلتے اور لوگوں کی تحسین وصول کرتے تھے۔

"بہت لائق اور اچھے بچے ہیں۔ بہت خوش نصیب ہیں آپ۔ نیک اولاد بھی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے جناب!"

وہ ایسے ہی جملے اب تک سنتے رہے تھے۔ اور اب لوگ انہیں مشورہ دیتے کہ اخبار میں اشتہار دے دو کہ میں نے اپنے بیٹے کو عاق کر دیا ہے۔ وہ مشورہ دینے والوں کو حیرت سے دیکھتے۔

"میں اس کا مجاز نہیں ہوں۔ وارثوں کو ان کے حق سے محروم کرنے کا اختیار اللہ نے ہمیں نہیں دیا۔"

گھر میں اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

اس روز انہیں معمول سے بھی زیادہ دیر ہو گئی تھی۔ بیل ہوئی تو سمیرا بھاگ کر گیٹ تک آئی تھی اور حسن رضا کو دیکھ کر ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح دور تک گلی میں دیکھا تھا۔ گلی خالی تھی۔ گیٹ بند کر کے جب وہ برآمدے میں آئی تو حسن رضا تخت پر بیٹھ چکے تھے اور جھک کر جوتے اتار رہے تھے۔ سمیرا نے جلدی سے تخت کے نیچے سے ان کے چپل نکال کر سامنے رکھے۔

انہوں نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ان چند ماہ میں اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کی وہ شوخ چمک ماند پڑ گئی تھی۔

جب سے احمد رضا گیا تھا۔ انہوں نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہیں دیکھی تھی۔ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹائیں۔

بہت پہلے کی پڑھی ہوئی نظم کے چند مصرعے ان کے ذہن میں آئے تو انہوں نے زیر لب دہرایا۔

"یہ دنیا کب اجڑ جائے
ہوا مسرور کرتی ہے
مگر خطرے کی اک گھنٹی کہیں بجتی ہی رہتی ہے
کسے معلوم ہے لیکن
ذرا سی لغزش پا سے
توازن کب بگڑ جائے
یہ دنیا کب اجڑ جائے"

انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سارے گھر پر نظر

دوڑائی۔

یہ گھر۔۔۔۔ یہاں ان کی زندگی کے کتنے، بہت سارے سال گزرے تھے۔ زبیدہ نے کیسے کمیٹیاں ڈال ڈال کر اور اپنا زیور بیچ کر یہ گھر خریدا تھا۔ اسی گھر میں احمد رضا اور سمیرا پیدا ہوئے۔ اجڑ گئی تھی ان کی دنیا بھی۔

سمیرا نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"ابو کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟ رضی ٹھیک ہے نا؟ آپ نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟"

سمیرا کے اندر کا ڈر زبان پر آگیا اس نے ان کا بازو پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"اس نے اپنے ساتھ خود جو کچھ کرلیا ہے اس کے بعد اور کیا ہو سکتا تھا؟"

انہوں نے سر جھکا لیا اور تخت پر پڑی اس کی کتابوں کو دیکھا۔

"تم یہاں سردی میں بیٹھ کر پڑھ رہی تھیں۔ کل بھی تم سے کہا تھا۔ موسم بدل گیا ہے۔"

"جی ابو!" وہ خود کو سنبھال کر کتابیں سمیٹنے لگی۔

"کتنی ڈسٹرب ہو گئی ہے۔ پہلی بار اس کا دسمبر ٹیسٹ کا رزلٹ اس طرح آیا ہے۔ پچاس فیصد تو کبھی زندگی میں نمبر نہیں لیے تھے۔ ہمیشہ اسی فیصد سے زیادہ ہی لیتی تھی۔۔۔۔ تو میں نے جو فیصلہ کیا وہ صحیح ہے۔"

مشکل مرحلہ سمیرا اور زبیدہ کو اس فیصلے سے آگاہ کرنے کا تھا جو انہوں نے رات کے کھانے کے بعد کر لیا۔ زبیدہ اور سمیرا خاموش بیٹھی انہیں دیکھتی رہیں۔

"کیا اس کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں تھا؟" زبیدہ نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"نہیں۔" انہوں نے زبیدہ کے چہرے کی طرف نہیں دیکھا اور وہ دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ زبیدہ اس گھر کے لیے بہت خوار ہوئی تھیں۔ بہت بچتیں کی تھیں انہوں نے۔ جب فرسٹ فلور پر کمرا اور واش روم وغیرہ بن رہا تھا تو سمیرا اور احمد رضا کتنے خوش تھے۔

"اور اگر وہ واپس آیا اور ہم نہ ہوئے تو؟"

"وہ اب واپس نہیں آئے گا زبیدہ! اسے دولت کی ہوس اور لالچ کے سانپ نے ڈس لیا ہے۔"

"پھر بھی کبھی ہم اسے یاد آئے تو؟"

"تو۔۔۔۔ اللہ کو منظور ہوا تو کوئی سبب بنا دے گا۔"

انہوں نے اب بھی زبیدہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ سمیرا اس دوران ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی رہی۔ انہوں نے ذرا کی ذرا اس کے چہرے پر نظر ڈالی تھی۔ وہ پتھروں جیسی سنجیدگی چہرے پر سجائے اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہولے سے کھنکارے۔

"یہ ضروری تھا زبیدہ! بے حد ضروری۔ یہاں جینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن چلے آتے تھے احمد رضا کا پوچھنے۔۔۔۔ اور اب تو ایک بار پھر کالم نگاروں نے لکھنا شروع کر دیا ہے۔" سمیرا نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"کل کے ایک اخبار میں ایک کالم نویس نے صرف احمد رضا کے متعلق لکھا ہے۔"

"نہیں۔" اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"کیا وہ اتنا اہم ہو گیا ہے وہ تو ایک معمولی مرید ہے۔" اس نے سوچا۔

"کل دو صحافی میرے دفتر میں آئے تھے اور اب آتے رہیں گے۔۔۔۔ خبر رکھوں گا۔ تم فکر نہ کرو زبیدہ! جب بھی موقع ملا، پتا چلا۔۔۔۔ میں خود جا کر اسے لاؤں گا۔"

زبیدہ نے پھر کچھ نہیں کہا۔ وہ یونہی خاموش بیٹھی رہیں۔

"تم کل لیونگ سرٹیفکیٹ کے لیے درخواست دے دینا۔"

"ہم کہاں جائیں گے ابو!" سمیرا نے پہلی بار بات کی۔

"راولپنڈی یا اسلام آباد۔۔۔۔ تاکہ تمہاری پڑھائی اچھے اداروں میں ہو سکے۔"

سمیرا اپنا کچھ کھے کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ صرف کنیرڈ کالج میں ایڈمیشن لینے کے شوق میں اتنی محنت کرتی تھی کہ اس کا میرٹ بن جائے اور کسی سفارش کے بغیر اسے ایڈمیشن مل جائے اور یہ شوق اس وقت سے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ جب وہ ایک بار رحیم یار خان گئی ہوئی تھی اور ابو اسے لے کر اپنی پھوپھی زاد بہن کے گھر گئے تھے۔ وہاں اس نے ایک بہت باوقار سی عورت کو دیکھا تھا۔ جو اسے بے حد اداس سی لگی تھیں۔ وہ تب چھوٹی سی تھی، آٹھ نو سال کی شاید اور ابو نے اسے بتایا تھا کہ یہ آپا کی بیٹی ہیں۔ بہت لائق اور ذہین ہیں۔ انہوں نے میٹرک میں ٹاپ کیا تھا۔ ان کے ابا تب لاہور میں ملازمت کرتے تھے اور پھر انہوں نے کنیرڈ کالج سے ایف ایس سی کیا اور پھر ان کی شادی ہو گئی رحیم یار خان کے قریب ہی ایک گاؤں میں۔ ان کے تین بچے بھی تھے دو بیٹے ایک بیٹی۔۔۔۔ ابو جب ان کے متعلق بتا رہے تھے کہ وہ کنیرڈ میں پڑھتی تھیں تو ان کے لہجے میں بڑا فخر تھا اور تب ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی کنیرڈ میں پڑھے گی اور پھر ابو اس کے متعلق بھی فخر سے بتایا کریں گے کہ میری بیٹی نے کنیرڈ کالج سے پڑھا ہے۔

وہ کمرے سے چلی گئی تھی اور زبیدہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر حسن رضا نے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ وہ سر جھکائے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑے اسے رک رک کر سیڑھیاں چڑھتے دیکھتے رہے۔ وہ جب اوپر جا رہی تھی تو اس کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت میں بہہ رہے تھے۔

حسن رضا ایک آہ بھر کر واپس کمرے میں آگئے۔ انہوں نے اس کے پیچھے جانے کا سوچا تھا لیکن پھر نہیں گئے۔ اچھا ہے اکیلی رو کر بھڑاس نکال لے۔۔۔۔ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے زبیدہ کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی حسرت سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک زبیدہ کا حسرت بھرا چہرہ نہ دیکھ سکے اور ایک دم واپس مڑے۔

"میں ذرا مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔ صبح سمیرا نے انڈے اور ڈبل روٹی لانے کے لیے کہا تھا، یاد نہیں رہا۔ گیٹ باہر سے لاک کر جاؤں گا۔"

بہت دنوں سے وہ محلے کے اسٹور پر نہیں گئے تھے بلکہ دفتر سے نزدیکی مارکیٹ میں چلے جاتے اور وہاں سے سب کچھ لے آتے تھے۔ آج بھی اسٹور کی طرف جاتے جاتے وہ ٹھٹکے لیکن پھر سر جھکائے اسٹور پر آ گئے۔

"ایک درجن انڈے اور ڈبل روٹی دے دینا۔"

اسٹور کے مالک نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"ارے رضا صاحب! آپ بڑے دنوں بعد آئے۔ خدانخواستہ طبیعت تو خراب نہ تھی۔"

"طبیعت خراب نہ ہو تو کیا ہو بھئی!" ان کے پڑوسی قاضی صاحب بھی وہیں کھڑے تھے۔ "جوان بیٹا اس عمر میں چھوڑ کر چلا گیا اور وہ بھی ایک مرتد بے دین کافر شخص کے پیچھے۔ ہم تو شکر کرتے ہیں کہ ہمارے بیٹے نے ایک لڑکی کے لیے ہی گھر چھوڑا، کم از کم دین تو خراب نہیں کیا اپنا۔" انہوں نے بنا کچھ کہے پیسے ادا کیے اور ڈبل روٹی اور انڈے لے کر گھر کی طرف پلٹ گئے۔

"بے چارے رضا صاحب۔"

انہوں نے اپنے پیچھے اسٹور والے کی آواز سنی تو تیز تیز چلنے لگے۔

پھر مزید چند دن لگے تھے سب کچھ طے کرنے میں۔ گھر بک گیا اور جاب سے انہوں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ کچھ سال ہی رہ گئے تھے ریٹائرمنٹ میں بھی۔ دفتر کے ساتھیوں نے سمجھایا۔ باس نے کمرے میں بلا کر وجہ پوچھی۔

انہوں نے وجہ نہیں بتائی تھی۔ پھر راولپنڈی شفٹ ہونے سے پہلے انہوں نے دو دن مسلسل بانس بازار سے آگے والے اس مکان کا چکر لگایا تھا۔ جہاں احمد رضا رہتا تھا لیکن مکان کو تالا لگا ہوا تھا۔ وہ طیب خان کے ٹھکانے پر بھی گئے تھے لیکن وہاں بھی تالے کے ساتھ ایک نوٹ لگا ہوا تھا۔

"کرائے کے لیے خالی ہے۔"

وہ یہ شہر چھوڑنے سے پہلے ایک بار اس سے ملنا چاہتے تھے۔ زبیدہ اور سمیرا سے ملوانا چاہتے تھے۔ لیکن پتا نہیں کہاں گم ہو گئے تھے وہ سب۔

شاید ملک چھوڑ گئے ہوں' انہوں نے سوچا تھا۔

لیکن انہوں نے ملک نہیں چھوڑا تھا اور اس وقت بھی جب وہ اس مکان کے سامنے سے مایوس ہو کر واپس جا رہے تھے' اسی گلی کے ایک اور مکان کے بیسمنٹ میں وہ الوینا کے ساتھ بیٹھا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"کب تک الوینا کب تک ہم یوں انڈر گراؤنڈ رہیں گے؛ کم از کم مجھے تو جانے دو۔ مجھے اپنے گھر والوں سے ملنا ہے۔"

"تمہیں کیسے جانے دیں؛ پاگل ہو گئے ہو کیا؛ تمہارے ذریعے انہیں ہم تک پہنچنے میں تھوڑی دیر بھی نہیں لگے گی۔"

"میں رات میں کسی وقت یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"رات میں..... تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے گھر کی نگرانی نہیں کر رہے ہوں گے۔"

وہ ہولے سے ہنسی تھی۔

"تم لوگ فون بھی نہیں کرنے دیتے مجھے گھر میں تاکہ میں اپنے امی ابو کو اپنی خیریت بتا سکوں۔ تم اندازہ کر سکتی ہو۔ وہ میرے لیے کتنے پریشان ہوں گے۔"

"نہیں۔" الوینا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"اس لیے کہ میں نے ماں باپ کی محبت نہیں دیکھی۔ کسی بھی رشتے کی محبت نہیں دیکھی میں نے' پھر بھی تمہاری حالت سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے۔ اچھا تم فکر نہ کرو۔ آج میں رچی سے بات کرتی ہوں کہ تم فون کر سکو گھر۔"

اس نے ہولے سے اس کا بازو دبایا اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

"ہم حالات کا جائزہ لے رہے ہیں احمد! جیسے ہی حالات بہتر ہوتے ہیں' تم گھر جا سکو گے۔ یوں بھی تمہارا اور باقی سب کا پاسپورٹ بن گیا ہے۔ جلد ہی ہم کسی اور ملک میں چلے جائیں گے۔"

"لیکن مجھے کہیں نہیں جانا۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے مت جانا..... یہ تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ کیا خبر حالات کیا ہوں۔ جانا پڑے۔ اوکے! تم ٹی وی سے دل بہلاؤ۔ میں ذرا حضرت جی کی طرف جا رہی ہوں۔"

وہ چلی گئی تو وہ لیٹ گیا۔ اس کا ٹی وی دیکھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ کتنے سارے دن ہو گئے تھے یہاں بند ہوئے۔ اس روز اسے تقریب کے بعد گھر جانا تھا' جس میں رچی اور اس کے ساتھیوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اسماعیل خان نے اسلام کے حوالے سے تقریر کی تھی۔ بڑی پُر اثر تقریر کی تھی۔ وہ متاثر سا سُن رہا تھا' جب اسماعیل خان نے کہا۔

"دنیا گمراہی کے اندھیرے میں گھر چکی ہے اور یہ قانون قدرت ہے کہ جب کبھی گمراہی بہت زیادہ پھیل جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے اپنے پیارے بندوں کو پیغمبر بنا کر بھیجتا ہے اور وہ بنی نوع انسان کو گمراہی کے اندھیرے سے نکال لیتا ہے۔ اب ایک بار پھر دنیا گمراہی کے اندھیروں میں ڈوب چکی ہے۔ سو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کی اصلاح کے لیے بھیجا ہے کہ ہم انہیں سیدھا راستہ دکھائیں۔ صحیح اور غلط میں فرق بتائیں اور....."

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ نعوذ باللہ پیغمبر ہیں؟"

کسی نے کہا تھا۔ احمد رضا نے چونک کر کہنے والے کو دیکھا تھا۔

"نہیں۔" وہ یکدم کھڑا ہوا تھا۔ "آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور ان کے بعد نبیوں اور پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ احمد رضا!" پاس بیٹھے طیب خان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔ اس طرح حضرت صاحب کی گفتگو کے دوران انہیں ٹوکنا خلاف ادب ہے۔"

"لیکن وہ شخص۔" اس نے مڑ کر اس شخص کو دیکھنا چاہا تھا' جس نے بات کی تھی لیکن وہ محفل میں اسے نظر نہیں آیا۔ اسماعیل خان دونوں ہاتھ رخساروں پر ہولے ہولے مارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"توبہ..... توبہ! کہاں میرے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام و مرتبہ' کہاں مجھ جیسا ناچیز حقیر۔ ارے میں تو ان کے قدموں کی خاک' ان کی گلی کا کتا....."

"کیا یہ سب بہروپیے ہیں اور میں بہروپیوں میں پھنس گیا ہوں؟"

احمد رضا نے پہلی بار سوچا تھا اور تب ہی ایک دم ہال کا دروازہ زور سے کھلا۔ ایک شخص جو غالباً" گارڈ تھا اور دروازے پر ڈیوٹی دے رہا تھا' اندر آیا۔

"پولیس..... وہ گلی میں داخل ہو رہے ہیں اور مکان کو گھیرے میں لینا چاہتے ہیں۔" الوینا اور دوسری لڑکیاں جو اسماعیل خان کے پیچھے کھڑی تھیں تیزی سے اسماعیل خان کے ساتھ پردے کے پیچھے غائب ہو گئیں۔ طیب خان نے حیران بیٹھے احمد رضا کا ہاتھ پکڑا اور پھر وہ سب دوڑتے ہوئے مکان کے پچھلے حصے میں بنی ایک کوٹھری میں آ گئے تھے' جس میں سے ایک دروازہ باہر ایک تنگ سی گلی میں کھل رہا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے اس گلی میں آ گئے۔ یہ کل گیارہ افراد تھے۔ باقی شریک محفل افراد وہیں ہال میں رہ گئے تھے۔

"تیزی سے اس سامنے والے مکان میں چلو۔"

طیب خان نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا۔ مکان کا دروازہ ایک دستک سے کھل گیا تھا۔ یہ بھی اس مکان کا پچھلا دروازہ تھا۔ پھر وہ اس مکان کی بیسمنٹ میں چلے گئے تھے کیونکہ اس وقت تک پولیس نے مکان کا گھیراؤ کر لیا تھا اور گلیوں میں پھیل گئے تھے۔ پھر دو تین دن وہ اسی مکان کے تہہ خانے میں رہنے کے بعد ایک رات یہاں اس مکان میں منتقل ہوئے تھے اور اب تک یہیں تھے۔

زندگی نے یہ کیسا کھیل کھیلا تھا اس کے ساتھ۔

"کہیں کچھ غلط ہو رہا ہے میرے ساتھ۔"

وہ مسلسل سوچ رہا تھا۔

بہت غلط لیکن اب وہ اس غلط کو صحیح کرنے پر قادر نہیں رہا تھا۔ کم از کم اکیلے وہ اس غلط کو صحیح نہیں کر سکتا تھا۔ اسے کسی سہارے کی ضرورت تھی کسی اپنے کی..... ابو' سمیرا' امی۔

یہی تین افراد تھے' جن کے سہارے وہ اس غلط کو صحیح کر سکتا تھا۔ وہ اس کے اپنے تھے۔ اسے ہر قیمت پر گھر جانا تھا۔ وہ اٹھا اور چپل پہن کر باہر نکلا۔ اس تہہ خانے میں تین چار چھوٹے کمروں کے علاوہ ایک بڑا ہال بھی تھا۔ ان کمروں کے دروازے اس ہال میں کھلتے تھے۔ اوپر گراؤنڈ فلور پر جانے کے لیے سیڑھیاں اسی ہال سے گزرتی تھیں۔ ہال میں الوینا کھڑی تھی' اس نے مڑ کر احمد رضا کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

"آؤ..... گھر فون کر لو۔ میں نے رچی سے بات کی ہے۔ تسلی ہو جائے گی اور پتا بھی چل جائے گا کہ تمہارے گھر کی نگرانی ہو رہی ہے یا نہیں۔"

وہ الوینا کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے سرے پر دروازہ تھا۔ الوینا نے تین بار دروازے پر دستک دی تھی' تب دروازہ کھلا۔ اس نے اندر قدم رکھا۔ یہ ایک چھوٹی سی لابی تھی اور لابی کے اختتام پر لاؤنج تھا۔ سامنے ٹی وی لگا تھا اور صوفوں پر رچی اور اس کے ساتھی بیٹھے ڈرنک کر رہے تھے۔ جب سے وہ اس مکان میں چھپے تھے' پہلی بار وہ اوپر آیا تھا۔ رچی کا اسلامی نام اگرچہ عبداللہ رکھا گیا تھا لیکن وہاں سب ابھی تک اسے رچی ہی بلاتے تھے اور اس نے بھی منع نہیں کیا تھا۔ رچی نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہیلو۔" الوینا نے رچی کی طرف دیکھا۔

"احمد کو فون کرنا ہے۔"

"کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔" اس نے فون اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا' وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھا تھا۔ پھر اس کی انگلیاں بے تابی سے نمبر ملانے لگیں۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی لیکن کسی نے فون ریسیو نہیں کیا تھا۔

"بھلا اس وقت کہاں جا سکتے ہیں۔ ابو بھی دفتر سے آ چکے ہوں گے۔ سمیرا' امی....."

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ پھر نمبر ملا رہا تھا۔ شاید امی اور سمیرا کچن وغیرہ میں ہوں۔

"شاید ان کا فون خراب ہے۔"

الوینا نے اس کے چہرے پر پھیلی مایوسی کو دیکھ کر

تسلی دی۔

پھر وقفے وقفے سے اس نے کئی بار نمبر ملایا۔ کبھی بیل ہوتی کبھی انگیج کی بیل ہونے لگتی۔

"فون ہی خراب ہے۔"

اس نے مایوسی سے سوچا اور ایک بار پھر نمبر ملانے لگا لیکن اس بار وہ کمپلین کروا رہا تھا۔ رچی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"جی فون خراب ہے۔ پتا نہیں کب سے ......" وہ کہہ رہا تھا۔ "میں نے تو ابھی فون کیا ہے اس نمبر پر، اٹینڈ نہیں ہو رہا۔" وہ تینوں چاروں اس کی طرف متوجہ تھے۔

"جی تھینک یو۔ کب تک ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ ریسور کریڈل پر ڈال کر مڑا اور الوینا کی طرف دیکھا۔

"فون ہی خراب ہے۔ کہہ رہے ہیں جلد ٹھیک کر دیں گے۔ لیکن پتا نہیں کب کریں گے۔"

رچی نے الوینا کو اشارہ کیا۔

"ہو جائے گا گھبراؤ نہیں۔" الوینا نے اسے تسلی دی۔

"رچی! تمہارا اگر کوئی جاننے والا ہو تو تم فون کرو، ورنہ یہ لوگ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ کمپلین کرو ابھی دو دو ہفتہ ہفتہ نہیں آتے۔" وہ پھر احمد کی طرف مڑی۔

"چلو پھر نیچے ہی چلتے ہیں۔ میں چیک کرتی رہوں گی۔ ٹھیک ہوا تو تمہیں بتا دوں گی۔"

وہ الوینا کے ساتھ واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ لیکن اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ باہر کھلی فضا میں جانا چاہتا تھا۔

اپنا گھر، اپنا محلہ، اپنی گلیاں، اپنی یونیورسٹی..... سب یاد آ رہا تھا اسے، لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک ان کی مرضی نہ ہوئی، وہ یہاں سے نہیں جا سکتا۔ کوشش کرے تب بھی نہیں۔ سوائے انتظار کرنا تھا اس وقت کا جب یہ لوگ اسے اجازت دیں گے۔

ایک بار وہ یہاں سے چلا گیا تو پھر لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اس وقت آنے والے لمحوں سے بے خبر وہ سوچ رہا تھا۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا، فون ٹھیک نہیں ہو سکا تھا۔ وہ دن میں ایک بار ضرور کوشش کرتا تھا۔ پورے ایک ہفتے کے بعد الوینا نے اسے کہا تھا کہ "چلو آج تمہارے گھر چلتے ہیں۔"

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔

"میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔"

"ٹھیک ہے..... چلو۔"

اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے اور جلدی سے جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس گھسیٹا۔

"یہ سامان بعد میں لے جانا۔ ابھی دیکھو وہاں کے حالات کیا ہیں۔ تمہارے ابو تم سے بہت سخت ناراض تھے۔ انہوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا تھا۔"

"ہاں! لیکن ابو کا غصہ بہت جلد اتر بھی جاتا ہے۔ میں جب انہیں یقین دلاؤں گا کہ ایسا کچھ نہیں تھا، جو انہوں نے سمجھا تو وہ میری بات کا یقین کر لیں گے۔"

"اس روز بھی تو تم نے انہیں یقین دلایا ہو گا۔" الوینا دروازے کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"نہیں! اس روز میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں تو بس حیران رہ گیا تھا۔ خیر اب تو امی اور سمیرا بھی ہوں گی نا میری سفارش کرنے کو۔" وہ مسکرایا اور پھر ہاتھ اپنے اٹیچی کیس کے ہینڈل پر رکھا۔

"رہنے دو نا پھر لے جانا۔"

"میں اگر نہ آنا چاہوں تو؟" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"ایز یو وش۔" وہ بھی مسکرائی تھی۔ "اب جلدی کرو۔"

"میں خود ہی چلا جاتا ٹیکسی کر کے۔" سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے کہا۔

"اب تکلف مت کرو۔"

الوینا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی مسکرا دیا اور جب وہ پورچ میں آیا تھا تو ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ یوں جیسے مدتوں بعد اس نے سورج کی روشنی دیکھی ہو اور جب تک گاڑی روڈ پر نہیں آئی تھی، اسے یقین نہیں آیا تھا کہ

وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔ اس کا دل بار بار تیزی سے دھڑکنے لگتا تھا۔

امی، ابو، سمیرا..... ان کی شکلیں بار بار اس کے تصور میں آ رہی تھیں۔

سمیرا دوڑ کر دروازہ کھولے گی۔ اسے دیکھ کر چیخ پڑے گی۔ بھاگ کر برآمدے میں جائے گی یا پھر وہیں سے ہی امی کو آواز دے گی۔

"سب کچھ ویسا ہی ہو گا۔ وہی گیٹ، وہی صحن، برآمدہ، وہی برآمدے میں پڑا تخت۔ بھلا اتنے سارے دنوں میں کیا تبدیلی آ سکتی ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

اس نے الوینا کو خدا حافظ کہا۔

"میں یہیں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ کچھ دیر رکوں گی..... کیا پتا.....۔"

اس نے احمد رضا کی طرف دیکھا۔ "تمہارے ابو راضی نہ ہوں۔ اور تمہیں واپس آنا پڑے۔"

اس نے الوینا کی طرف دیکھا۔ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ ایسا نہیں ہو گا لیکن پھر کچھ کہے بنا آگے بڑھ گیا۔

اتفاق سے گلی میں کوئی بھی واقف کار نہیں ملا تھا۔ وہ سیدھا گیٹ تک آیا اور بیل پر انگلی رکھ دی تھی۔ اندر کہیں بیل ہوئی تھی۔ سمیرا کا تصور کر کے وہ مسکرایا۔ اتنی دیر تک بیل ہونے پر وہ ضرور جھنجلا رہی ہو گی پھر گیٹ کھلا اور ایک اجنبی صورت نظر آئی۔

"جی! کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"حسن رضا صاحب سے۔" وہ بوکھلا گیا۔

"وہ تو یہاں سے چلے گئے ہیں۔"

"کہاں؟" اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

"یہ تو اپنا..... ان کا اپنا گھر تھا۔"

"جی ہاں! فروخت کر دیا ہے انہوں نے..... ہم نے خریدا ہے۔" وہ شخص کہہ رہا تھا۔

"آپ کو ان کا ایڈریس پتا ہے کہاں گئے ہیں وہ؟" اس نے پرامید نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہیں..... ہمیں تو علم نہیں ہے۔ کہیں کسی دوسرے شہر چلے گئے ہیں شاید۔"

وہ شخص گیٹ بند کر کے چلا گیا تھا لیکن وہ وہیں کھڑا تھا۔ مایوس اور دل گرفتہ سا۔

کچھ دیر وہیں کھڑا رہنے کے بعد وہ پلٹا۔ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے وہ واپس جا رہا تھا۔ جب حسن رضا صاحب نے گلی میں قدم رکھا اور اسے گیٹ کے پاس سے مڑتے دیکھا..... اتنی دور سے بھی انہوں نے پہچان لیا تھا..... وہ احمد رضا تھا۔

"احمد رضا!" ان کے لب ہلے تھے اور دل سینے کے اندر زور سے پھڑپھڑایا۔ لمحہ بھر کے لیے انہوں نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کسی مکان کی دیوار سے ٹیک لگائی اور پھر یونہی دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ناولٹ

سیمرا شریف طور



ساری رات گھن گرج کے ساتھ بجلی چمکتی رہی اور پھر مینہ ایسے ٹوٹ کے برسا جیسے برسوں بعد اسے برسنے کا موقع ملا تھا اور اب وہ صبح سویرے نماز کے بعد صحن میں چہل قدمی کرتے ہوئے رات ہونے والی بارش کے بعد کے اثرات کا جائزہ لے رہی تھی۔

اسے ہمیشہ بارش کے بعد کے مناظر سے وحشت ہونے لگتی تھی۔ بارش کا موسم اکثر اس کے اندر کے کھنڈر اتار دیتا تھا اور اس کے اندر کا درد آنسوؤں کی صورت اس کے چہرے پر بکھر جاتا تھا' کیسا دردناک تھا یہ موسم۔۔۔ اس موسم سے اس کی اچھی بری بہت سی یادیں وابستہ تھیں' جنہیں وہ کوشش کے باوجود فراموش نہیں کر پا رہی تھی۔

بارش کے بعد اسے سب سے زیادہ وحشت اس حبس سے ہوتی تھی' جو اس کے اندر باہر اپنا بسیرا کر لیتا تھا۔ اب بھی ہر طرف بکھرے پتے' گرد اور مٹی سے اٹا صحن۔۔۔ اسے سخت الجھن ہو رہی تھی۔

"اسکول جانے میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے' اتنی دیر میں باہر کی صفائی ہو جائے گی۔"

اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے سوچا اور جھاڑو لے کر صحن کی تفصیلی صفائی میں جت گئی۔ صحن کی اچھی طرح صفائی کر کے فارغ ہو کر برآمدے اور ڈرائنگ روم کی ہر چیز کو کپڑے سے جھاڑ کر صاف کیا۔

"توبہ! بارش کے اثرات بھی کیسے ان مٹ ہوتے ہیں۔"

رگڑ رگڑ کر فرش پر پونچھا لگاتے وہ بڑبڑائی۔

"صباح' صباح بیٹا۔" ابھی پونچھا لگا کر فارغ ہوئی ہی تھی کہ تایا ابو کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی منہ پر چھپاکے مارے اور دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے اندر بھاگی۔ وہ بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ فوراً" آگے بڑھی۔ سہارا دے کر انہیں بٹھانے کی کوشش کی اور ان کی کمر کے پیچھے تکیہ درست کر کے سیدھی ہوئی۔

"اسد کہاں ہے؟" دوسری چارپائی کو خالی پا کر انہوں نے پوچھا تو وہ کمرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے چونکی۔

"میں نماز پڑھ رہی تھی' جب نکلے تھے۔ روز اس ٹائم تک آ جاتے ہیں' مگر۔۔۔ ابھی تک نہیں لوٹے۔"

اسد کے پلنگ کی چادر اٹھا کر جھاڑ کر دوبارہ بچھا دی۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی اس کی کتابیں ترتیب سے رکھ دیں۔

"تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں' آٹھ بج رہے ہیں۔" اسے مسلسل کمرے میں مصروف دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔ "کیا اسکول نہیں جانا؟"

"جی' جاؤں گی' مگر ذرا دیر سے۔ رات کی آندھی اور بارش سے سارا گھر گرد مٹی سے اٹا اور بکھرا پڑا ہے۔ ہر طرف اتنی گرد ہے' چھت پر بھی پانی جمع ہو گیا ہے' شاید پرنالے کے سوراخ میں کچھ کچرا اٹک گیا ہے' سارا پانی سیڑھیوں سے بہتا رہا ہے رات بھر برآمدے کی ہر چیز گیلی ہو گئی ہے۔ صحن کی بھی بڑی بری حالت ہو رہی تھی۔ اب فارغ ہوئی ہوں۔ ساڑھے نو بجے تک چلی جاؤں گی' کون سی اتنی اہم نوکری ہے' جو چلی گئی تو غم ہو گا۔ وقت گزاری کے لیے کر رہی ہوں' صرف آپ کی وجہ سے ورنہ دل نہیں کرتا۔"

پوری تفصیل بتا کر آخر میں اس نے اسکول کی نوکری کی طرف سے ہمیشہ کیا جانے والا شکوہ دہرایا۔

وہ خاموشی سے اس کے بلیج چہرے کو دیکھے گئے۔ پھرتی سے چلتے ہاتھ لمحوں میں سارے کمرے کی بے ترتیبی کو ایک ترتیب میں لے آئے تھے۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ ان سے بہتر بھلا کون جانتا تھا کہ وقت گزاری کس قدر کٹھن اور مشکل کام ہے۔

"آپ کو واش روم لے جاؤں؟" اس نے پوچھا تو وہ نفی میں سرہلا گئے۔

"نہیں' اسد آئے گا تو چلا جاؤں گا' مگر وہ گیا کہاں ہے؟ روز صبح نماز پڑھ کر تو فوراً" آجاتا تھا۔"

ان کے پوچھنے پر اس نے صرف کندھے اچکا دیے پھر کمرے سے نکل آئی' اپنے کمرے کو سمیٹ کر وہ واش روم چلی گئی۔

تیار ہو کر کچن میں آئی تو کھانے کو کچھ بھی دستیاب نہ تھا۔ اسے ایک دم یاد آیا' کھانے پینے کا سامان ختم ہو چکا تھا رات کو اس نے اسد سے کہا تھا کہ وہ صبح کھانے پینے کو کچھ لائے گا تو ناشتا تیار ہو پائے گا' مگر اب اسد ہی غائب تھا۔

"نہ جانے یہ اسد کہاں رہ گیا ہے۔" صبح صبح سارا گھر صاف کرنے کے بعد اسے اب زوروں کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ دودھ بھی نہیں تھا۔ رات کو اس نے آٹا گوندھ کر فریج میں رکھ دیا تھا۔ جلدی جلدی اس نے پراٹھے بنائے۔ ابھی پراٹھا قہوے کے ساتھ نگل ہی رہی تھی کہ اسد چلا آیا۔

"آئیم سوری۔۔۔ صبح صبح دکانیں کھلی ہوئی نہیں تھیں۔ رات ہونے والی بارش سے تمہیں سڑکوں کی حالت کا اندازہ تو ہو گا۔ اگر تم شام کو ہی بتا دیتیں' میں رات کو لے آتا۔ ابھی تو اتنا ہی سامان لایا ہوں' شام کو باقی بھی لا دوں گا۔"

اس نے تمام شاپرز کھانے والی ٹیبل پر رکھ دیے۔ دوسری طرف وہ پراٹھے اور قہوے کا ناشتا کر رہی تھی۔

"تم ابھی تک اسکول نہیں گئیں؟" اسد کو وقت گزرنے کا احساس ہوا تو پوچھنے لگا۔ وہ آخری لقمہ منہ میں ڈال کر قہوے کا ایک بڑا سا گھونٹ لے کر اٹھ گئی۔

"میں نے پراٹھے بنا دیے ہیں' انڈے ہوتے تو آملیٹ بھی بنا دیتی۔ رات والا سالن بھی گرم کر دیا ہے' میں نے لیٹ جانا تھا اس لیے ابھی تک ہوں۔ تایا ابو آپ کا پوچھ رہے تھے۔"

مگ دھو کر وہ پلٹی تو اسے اپنی طرف متوجہ پا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ پھر بھی خاموشی سے دیکھے گیا تو اسے کوفت ہوئی۔

وہ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے پہلے اپنے کمرے میں آئی' چادر اور بیگ لے کر وہ تایا ابو کے کمرے میں گئی۔

"اچھا۔ تایا ابو! میں جا رہی ہوں۔"

"اچھا بیٹا! اللہ حافظ۔" انہوں نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

ابھی وہ گیٹ سے نکل کر چند قدم ہی چلی تھی کہ اسد بھی گیٹ بند کر کے اس کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے قدم اٹھاتا چلنے لگا۔ صباح نے سر اٹھا کر ایک نظر اپنے ساتھ چلتے ہوئے اسد کو دیکھا اور پھر سیدھی چلنے لگی۔

اسد کا یہ روزانہ کا معمول تھا۔ وہ اسے اسکول کے گیٹ تک چھوڑنے جاتا تھا اور وہ ہر روز اس کے ساتھ چلتے چلتے الجھ جاتی تھی۔ یہ چند منٹ کا سفر صباح کے لیے بڑا دشوار ہوتا تھا۔ چلتے چلتے اچانک اسے یاد آیا تو سر اٹھا کر بولی۔

"تایا ابو کو آج ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے' آپ اکیلے مت لے جایئے گا' میں اسکول سے آجاؤں تو پھر ساتھ چلیں گے۔"

اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا تھا مگر اسد کے ہونٹ ایک دم مسکرا اٹھے تھے۔

"جی اچھا' اور کچھ؟"

"جی نہیں۔" بظاہر سادہ سی مسکراہٹ تھی مگر صباح کے دل پر بڑا برا اثر چھوڑا تھا۔ وہ جواب دے کر مزید تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ تب ہی بے دھیانی میں چلتے اچانک اسے ٹھوکر لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ گرتی' ساتھ چلتے اسد نے بروقت اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ صباح کو لگا' اس کے ہاتھ کو جیسے شعلہ سا چھو گیا ہو۔

"دھیان سے' آگے پتھر ہے' ابھی گر جاتیں تو۔"

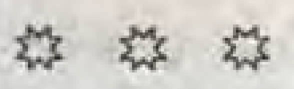
اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے انداز میں ایسی سرد مہری تھی کہ اسد ایک پل کو ساکت رہ گیا تھا۔

"صباح! ہمیں دو سال ہو گئے ہیں ایک گھر میں رہتے ہوئے' تمہارا میرے ساتھ یہ اجنبیوں والا رویّہ کیوں ہے؟ اتنا عرصہ ساتھ رہنے سے اجنبی' نا آشنا لوگوں میں بھی انسیت اور مروّت پیدا ہو جاتی ہے' ہم تو پھر بھی بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں' پھر اتنی بے اعتباری کیوں؟"

وہ ہمیشہ صباح کے سرد رویے کو نظر انداز کر جاتا تھا مگر آج جیسے اس کا ضبط چھن سا گیا تھا۔ اسے صباح کے یوں تنفر سے ہاتھ کھینچ لینے سے تکلیف ہوئی تھی۔

صباح خاموشی سے لب بھینچے بڑے بڑے قدم اٹھا رہی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا اسکول نزدیک تھا' وہ جلد از جلد اس ہم سفر سے جان چھڑا لینا چاہتی تھی۔ جیسے ہی اس کا اسکول آیا' وہ بغیر پلٹ کر دیکھے' اندر داخل ہو گئی۔

اسد اس کے اس رد عمل پر ششدر سا کھڑا رہ گیا۔



صباح کو دو سال ہو گئے تھے' تایا ابو کے ہاں آکر رہتے ہوئے اور ان دو سالوں میں اس کے اور اسد کے درمیان اس قدر مختصر گفتگو رہی تھی کہ وہ انگلیوں پر گن کر بتا سکتی تھی' اس کا اسد کے ساتھ رویہ ایسا ہی ہوتا تھا' بے لچک' سخت اور کھردرا۔

بہت کم ایسا ہوا تھا کہ اس نے اسے خود سے مخاطب کیا ہو۔ اگر کبھی وہ مخاطب کرتا تو اس کا رویّہ ہمیشہ خراب ہوتا۔

اس کی امی کا انتقال دو سال پہلے ہوا تھا' جب طوفانی موسم میں انہیں ابو اور حماد کی اچانک ناگہانی موت کی خبر ملی تھی۔ ان کے اعصاب پر یہ خبر بجلی بن کر ٹوٹی تھی۔ وہ تو ہوش و حواس ہی کھو چکی تھیں اور پھر کئی ماہ تک اسپتالوں میں خوار ہونے کے بعد وہ اس زندگی سے ہمیشہ کے لیے ناتا توڑ گئی تھیں۔

اور حماد۔۔۔ حماد کے ساتھ اس کی زندگی کے خوش گوار دن صرف چند ماہ پر محیط تھے' مگر صباح کو لگتا تھا کہ ان چند ماہ میں حماد کے ساتھ وہ اپنی ساری زندگی جی گئی تھی۔

حماد' تایا ابو کا بیٹا تھا۔ انتہائی ذمہ دار اور سلجھا ہوا۔ ڈھائی سال پہلے اس کی شادی حماد سے ہوئی تھی۔ وہ کراچی سے بیاہ کر لاہور آگئی تھی۔ بچپن سے ہی وہ تایا ابو اور ان کے گھر والوں سے بہت مانوس رہی تھی یہ ہی اسد تھا' جس کے ساتھ اس کی بڑی بے تکلفی تھی اور یہ سنجیدہ و بردبار شخص' اس کی ہر اوٹ پٹانگ بات کا جواب انتہائی سلجھے ہوئے طریقے سے دیا کرتا تھا۔

اس کی چھٹیاں ہر سال تایا ابو کے ہاں لاہور میں گزرتی تھیں۔ تایا ابو اسے چاہتے بھی تو بہت تھے۔

اس کے امی' ابو ہمیشہ ان سے شکوہ کرتے تھے کہ انہوں نے صباح کو بگاڑ دیا ہے' ضدی بنا دیا ہے' مگر وہ ہر بار اس کی ڈھال بن جاتے تھے۔

حماد سے اس کا تعلق بے تکلف ہونے کے ساتھ

ساتھ بڑا محبوبانہ سا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کو پا کر بے پناہ خوش تھے مگر یہ خوشی صرف چند ماہ تک رہی۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ اور حماد کراچی گئے تھے امی ابو سے ملنے۔ امی ابو بیٹی اور داماد کو خوش و خرم دیکھ کر بے حد خوش تھے۔ روز سیر و تفریح کے پروگرام بنتے تھے۔ صباح ماں، باپ کی اکلوتی اولاد تھی سو وہ خوش تھے۔ مگر اس خوشی کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی تھی۔ ابو اور حماد یوں ہی باہر گئے تھے گھومنے پھرنے، پھر وہ دونوں اپنے قدموں پر چل کر واپس نہ آسکے تھے۔ ایک شدید کار ایکسیڈنٹ نے ان کا ناتا زندگی سے ہمیشہ کے لیے توڑ دیا تھا۔

اگلے کئی ماہ تک وہ بے یقین رہی تھی۔ اوپر سے امی کا اچانک حواس کھو دینا، اس سانحے نے ان کے دماغ پر بڑا برا اثر چھوڑا تھا۔ کئی ماہ تک تایا ابو اپنا گھر بار چھوڑ کر اس کے پاس کراچی ٹھہرے رہے تھے۔

راجیہ باجی حماد کی جوان موت کی خبر سن کر پاکستان آگئی تھیں، انہوں نے بڑی مشکلوں سے اس کو سنبھالا تھا۔

امی کی روز بروز بگڑتی حالت نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد تو اسے لگتا تھا جیسے اس کے پاس جینے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا۔ وہ گھنٹوں خود فراموشی میں گزار دیتی تھی۔ پھر ہوش آتے ہی بلک بلک کر رونا شروع کر دیتی تھی۔ تایا ابو اسے اپنے ساتھ لاہور لے آئے تھے۔ راجیہ باجی واپس چلی گئی تھیں۔ اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اسے صبر آتا چلا گیا تھا۔ تایا ابو کے کہنے پر اس نے اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ اسے بھی اسکول کی ملازمت میں اپنے غم سے چھٹنے کا ایک آسرا مل گیا تھا۔ ورنہ حماد کو بھول جانا اس کے اختیار میں نہ تھا۔

اسد کا مجتبیٰ حسن سے کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ تقریباً پچیس سال پہلے کی بات ہے مجتبیٰ حسن کا شمالی علاقہ جات جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ تفریح کے دوران ایک جگہ انہیں انتہائی زخمی حالت میں تین، چار سال کا ایک بچہ ملا، نبض دیکھنے پر اس کے اندر زندگی کے آثار نظر آئے تو وہ اسے فوراً قریبی اسپتال لے گئے۔ اس کی زندگی تھی جو وہ موت کی سرحد سے لوٹ آیا تھا۔ اسے خطرے سے باہر آنے اور صحت یاب ہونے میں چند دن لگ گئے تھے۔

نہ جانے کس بدبخت نے اس خوب صورت سے بچے کو پہاڑوں کے دامن میں کسی درندے کا لقمہ بننے کو پھینک دیا تھا۔ اس پر اس حادثے کا اس قدر اثر تھا کہ وہ اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا پا رہا تھا۔ وہ خوف زدہ اور سہما ہوا بچہ ہر کسی کو دیکھ کر رونے لگتا تھا۔ اس کے لبوں پر صرف بابا جان اور بی بی جان کے الفاظ تھے۔

انہوں نے اس کے وارثوں کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی امید افزا راہ دکھائی نہ دی۔ انہوں نے اپنے تمام ذرائع استعمال کر لیے۔ حتیٰ کہ اخبارات میں بھی بچے کی تصویر اور گمشدگی کی اطلاع دی گئی، مسلسل کوشش کے باوجود بھی جب اسد کے اصل ورثا کا کوئی پتا نہ چل سکا تو وہ پولیس تھانے میں اطلاع کر کے اور اپنا ایڈریس وغیرہ دے کر ان کی اجازت سے بچے کو اپنے ساتھ لاہور لے آئے تھے۔

چار سالہ اسد نفسیاتی طور پر اس قدر خوف زدہ ہو چکا تھا کہ جس کو دیکھتا دہشت زدہ ہو جاتا تھا۔ مجتبیٰ حسن کی بیگم نے اسے بڑی محبت و شفقت سے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔ تایا ابو کا خیال تھا کہ اسد کے والدین ایک دن ضرور ان تک آئیں گے، مگر دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں بدلتے گئے تو وہ بھی ناامید ہو گئے۔ اسد کے وارثوں کا پتا لگانے میں تمام کوششیں ناکام ہو گئی تھیں۔ شاید قدرت نے اسد کی پرورش مجتبیٰ حسن کے ہاتھوں لکھی تھی۔

بچے کا اصل نام معلوم نہیں کیا تھا، مگر انہوں نے اسے "اسد مجتبیٰ حسن" کی حیثیت سے پہچان دی، بلکہ اسے معاشرے کا ایک فعال اور توانا مرد بنانے کے

لیے اپنی تمام کوششیں بھی صرف کر دیں۔

مجتبیٰ حسن صاحب نے کبھی اس سے اس کی اصلیت نہیں چھپائی۔ وہ اچھی طرح باخبر تھا کہ وہ مجتبیٰ حسن کا حقیقی بیٹا نہیں ہے، مگر اس نے ہر موقع پر حقیقی بیٹا ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اور وہ بھی برملا کہا کرتے تھے "میرے دو بیٹے ہیں، اسد اور حماد۔" انہوں نے بھی ایک باپ ہونے کے تمام فرائض نبھائے تھے۔

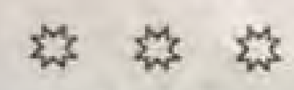
انہوں نے اسد اور حماد میں کبھی کوئی فرق نہ کیا۔ جب صباح حماد کے ہمراہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تو اسد سے بڑے خوش گوار تعلقات رہے تھے مگر جب اجڑ کر دوبارہ اس گھر میں آئی تو اس نے بہت سی حدود اپنے اور اسد کے درمیان قائم کر لی تھیں۔

مجتبیٰ صاحب جب بھی اسے دیکھتے، ان کے اندر اپنے بیٹے کی جدائی کا صدمہ اور گہرا ہونے لگتا۔ اب وہ اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ اٹھنے بیٹھنے میں اب انہیں دقت ہونے لگی تھی۔ چند قدم چلتے ہی ہلکان ہو جاتے تھے۔ یہ اعصابی و جسمانی تھکاوٹ انہیں دن بدن کمزور بناتی جا رہی تھی۔

صباح دوبارہ اس گھر میں آنے کے بعد ذہنی طور پر بہت مضطرب ہو چکی تھی۔ جب ہی تایا ابو کے اصرار پر بلکہ مجبور کرنے پر اس نے قریبی اسکول میں ملازمت کر لی، اس کی توجہ کا ارتکاز بٹنے لگا تو اس کی ذہنی حالت بھی بہتر ہونے لگی۔ آدھا دن اسکول میں گزار کر آنے کے بعد گھر کی مصروفیات نے اسے بڑا سنبھالا دیا تھا۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات تھی کہ اسے اسد کی طرف سے عجیب سا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کے محسوسات اسے اسد کی طرف سے مشکوک کر چکے تھے۔ بے شک اسد نے کبھی کوئی نازیبا حرکت تو ایک طرف کوئی ناپسندیدہ لفظ بھی نہ کہا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں وہ اپنے دل میں اس کے لیے اچھے جذبات برقرار نہ رکھ پا رہی تھی۔ وہ یہ یقین کرنے پر بھی راضی نہ تھی کہ اسد جو حماد کو سگا بھائی سمجھتا تھا، اب اس کی بیوہ کے لیے بدل رہا ہے، پھر بھی وہ اس کی طرف سے خاصی محتاط ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر تلخ نہیں ہوتی تھی، مگر اسد کو دیکھتے ہی اس کو اپنے احساسات و جذبات پر قابو نہیں رہتا تھا۔

وہ کوشش کرتی تھی کہ کم سے کم اسد سے مخاطب ہو، مگر کبھی کبھار مخاطب کرنے پر اس کے لب و لہجے میں خود بخود تلخی سی سمٹ آتی تھی۔ جسے ابھی تک مجتبیٰ صاحب نے محسوس نہیں کیا تھا۔ مگر وہ نہ صرف بہت اچھی طرح محسوس کر گیا تھا، بلکہ اس کا پس منظر بھی جان گیا تھا اور شاید آج اس کا اس طرح سختی سے ٹوک دینا بھی اسی زمرے میں آتا تھا۔ مگر وہ خود کو پھر بھی حق بجانب سمجھ رہی تھی۔



"خان آگئے۔" خان ذکاء اللہ خان نے جیسے ہی حویلی میں قدم رکھا، خبر یہاں سے وہاں تک پھیلتی بی بی جان کے کمرے میں بھی پہنچ گئی۔

"بی بی جان! بابا جان آگئے ہیں۔"

پشمینہ نے کمرے میں داخل ہو کر بستر پر دراز بی بی جان کو اطلاع دی تو ان کے چہرے پر ایک دم سکون سا سرایت کر گیا۔ خان جی دو دن کے لیے شہر سے باہر گئے تو بی بی جان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ وہ بہت وہمی ہو گئی تھیں۔ کوئی ان کی نظروں سے ذرا بھی اوجھل ہوتا تو ان کو طرح طرح کے وہم ستانے لگتے تھے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ انہیں دمے کا مرض بھی لاحق ہو گیا۔

"السلام علیکم!" ذکاء اللہ خان نے جیسے ہی کمرے میں قدم رکھا، بی بی جان اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"وعلیکم السلام!" انہیں اپنے سامنے دیکھ کر وہ بالکل مطمئن ہو گئی تھیں۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟" انہوں نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں بابا جان! رات سے بی بی جان کو پھر سانس کا پرابلم شروع ہو گیا تھا۔ بی بی جان دن بدن وہمی ہوتی

جا رہی ہیں۔ نہ جانے کیوں ان کے دل میں یہ شک جڑ پکڑ چکا ہے کہ جو بھی گھر سے نکلے گا واپس نہیں آئے گا۔ زرمینہ آپی اور بھائی جان رات کو آ گئے تھے' ابھی گئے ہیں۔"

پشمینہ نے اپنے بابا جان سے ادب سے سر جھکا کر پیار لیا اور فوراً "بی بی جان کی شکایت کی تو وہ مسکرا دیں۔

خان صاحب نے ایک سنجیدہ نگاہ اپنی شریک حیات پر ڈالی تو وہ خفت سے مسکرا کر سر جھکا گئیں۔

"پشمینہ بیٹا! میراں سے کہو کھانا لگائے' تمہارے بابا جان سفر سے لوٹے ہیں' کچھ پینے کو بھی لاؤ۔" بی بی جان نے پشمینہ سے کہا تو وہ فوراً" سر ہلاتی کمرے سے نکل گئی۔

"کتنی دفعہ آپ سے کہا ہے کہ بھول جائیں اس واقعے کو' اپنے آپ کو مطمئن اور پر سکون رکھا کریں' مگر آپ۔"

"کیا آپ بھول گئے ہیں اس سانحے کو؟" انہوں نے تڑپ کر کہا۔ اور خان ذکاء اللہ کو لگا' ان کے زخموں سے خون رسنے لگا ہو' وہ ایسا ہی گہرا زخم تھا جو بھرتا ہی نہ تھا' بلکہ اب تو ناسور بن گیا تھا۔

"کوئی حادثہ ہو جاتا تو دل کو قرار بھی آ جاتا' مگر اس طرح نہیں خان صاحب! اس کی جدائی تو میرے دل کا ناسور بن گئی ہے۔ وہ بھولتا ہی نہیں' آج وہ ہوتا تو اس کی شادی ہو چکی ہوتی۔ بیوی بچے ہوتے۔ میرے آس پاس میری سب اولادیں ہیں' بچے ہیں' مگر وہ نہیں ہے۔ میرا دل روتا ہے خان صاحب! اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے میں نے اسے باہر کھیلنے کو بھیجا تھا۔ پھر وہ کبھی واپس ہی نہیں آیا۔ میں تو اس کی صورت دیکھنے کو ترس گئی ہوں۔۔۔

لوگ کہتے ہیں کوئی بھیڑیا' کوئی جانور کھا گیا ہو گا' مگر۔۔۔ مگر کوئی نشان تو ملتا؟"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔ انہیں تو اپنے بیٹے کو یاد کر کے رونے کا بہانہ چاہیے ہوتا تھا۔

"بس کریں بیگم! بس کریں' میرا دل بھی خون خون ہو جاتا ہے' وہ میرا بازو تھا' میرے وجود کا حصہ' میری طاقت تھا' میرا اکلوتا بیٹا تھا' سب کچھ آپ کے سامنے ہے' کیا کچھ نہ کیا میں نے۔ پولیس' ٹی وی' اخبار' کھوجی' ہر ذریعہ اختیار کیا' مگر اس کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔"

وہ بی بی جان کے پاس صوفے پر ڈھے سے گئے تھے۔ اب تو ان کی بھی ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔ اپنے تمام بچوں کے درمیان اپنے صارم کو نہ پا کر ان کے دل سے ہوک اٹھتی تھی۔ دل غم سے بھر جاتا تھا۔ مگر صبر و ضبط سے سب سہہ جاتے تھے کہ یہ ہی رب کی مرضی تھی۔ مگر اس پاگل' دیوانی ماں کو کیسے سمجھاتے جو آج بھی آس لگائے بیٹھی تھیں کہ وہ زندہ ہو گا اور انہیں ملے گا۔

"خان صاحب! پتا نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے وہ زندہ ہے۔ مجھے راتوں کو خواب آتے ہیں' وہ مجھے پکارتا ہے' بی بی جان' بی بی جان۔۔۔ اس کے ننھے منے ہاتھ میرے قریب آتے ہیں اور جب میں اسے پکڑنے لگتی ہوں تو وہ غائب ہو جاتا ہے' وہ یقیناً" زندہ ہے' کہیں موجود ہے۔ میرا صارم' میری زندگی' میری آنکھوں کا نور۔ وہ زندہ ہو گا۔"

اتنا وقت گزر گیا تھا' مگر ان کی آس نہ ٹوٹی تھی۔ خان صاحب کی آنکھوں میں بھی نمی سی اتر آئی تھی۔

پشمینہ شربت کا جگ اور گلاس ٹرے میں رکھے کمرے میں دستک دے کر داخل ہوئی تو بی بی جان کی سسکیاں اسے اذیت دے گئیں۔ اس نے خاموشی سے گلاس بھر کر بابا جان کو تھمایا۔

"جیتی رہو۔" انہوں نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا' بی بی جان کو بھی ایک گلاس تھما کر وہ ان کی دوسری طرف بیٹھ گئی۔

"بی بی جان! پھوپھی گل خانم کا فون آیا ہے' وہ لوگ شام کو آ رہے ہیں آپ کی عیادت کے لیے۔" بی بی جان کی بھیگی آنکھوں سے اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی اور یہ تکلیف اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھی۔

"اچھا' میراں سے کہو کھانے پینے کا اچھا سا انتظام کر لے۔ میں بھی آتی ہوں اور ابھی دوپہر کا کھانا لگواؤ۔" آنسو صاف کر کے انہوں نے کہا۔

"جی' میں میراں سے کہتی ہوں۔" اثبات میں سر ہلاتی وہ کمرے سے نکل گئی۔

کھانے کی میز پر وہ تینوں ہی تھے۔ پلوشے اور زرمینے کی شادی کے بعد اب گھر میں صرف وہ ہی تھی۔ خان ذکاء اللہ خان دیگر خانوں کی طرح روایتی نہ تھے۔ انہوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کی شادیاں بے شک خاندان میں ہی کی تھیں' مگر تعلیم انہیں وقت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق دلوائی تھی۔ ان کی تینوں بیٹیاں یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ تھیں۔ پشمینہ ایم اے کے امتحان دے کر چند ماہ قبل ہی فارغ ہوئی تھی۔

شام ہوتے ہی گل خانم اپنی شہری بہو راشدہ اور دونوں بیٹوں کے ہمراہ چلی آئیں۔ آتے ہی انہوں نے حسب عادت پشمینہ کو لپٹا کر پیار کیا۔ زوار' سجاول بھائی اور راشدہ بھابھی کے سامنے وہ پھوپھی بیگم کے اس مظاہرے پر سرخ سی ہو گئی تھی' پھر اسے چھوڑ کر وہ بی بی جان سے ان کی طبیعت کا احوال دریافت کرنے لگیں۔

"کیا کر رہی ہو آج کل۔" ذکاء اللہ' سجاول اور زوار تینوں باہر بیٹھک میں چلے گئے تھے۔ وہ راشدہ بھابھی کے پاس بیٹھی تو اس نے اپنائیت سے پوچھا۔

سجاول لالہ کو یونیورسٹی میں دوران تعلیم راشدہ پسند آ گئی تھی۔ سب کی بے پناہ مخالفت کے باوجود سجاول لالہ نے راشدہ سے شادی کر لی۔ خوش قسمتی سے راشدہ ایک اچھی اور سلجھی ہوئی بہو ثابت ہوئی' سو سب کی مخالفت دم توڑ گئی' مگر گل خانم کا ملال نہیں جاتا تھا۔ وہ سجاول کے لیے پشمینہ کو سوچے بیٹھی تھیں مگر جب سجاول نے راشدہ سے شادی کر لی تو انہوں نے زوار کو پکڑ لیا۔ وہ اپنے بھائی کی بیٹی کو کسی طور چھوڑنے پر راضی نہ تھیں اور اپنی اس چاہت کا وہ برملا اظہار بھی کرتی رہتی تھیں۔

"کچھ خاص نہیں' ایگزیمز کے بعد فارغ ہی ہوں' بس رزلٹ کا انتظار ہے' اور بابا جان کا تو آپ کو علم ہے

ماسٹر انہوں نے کروادیا ہے' مزید کچھ کرنے کی اجازت نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"زرمینے اور پلوشے کیسی ہیں؟" راشدہ بھابھی نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں' زرمینے رات کو آئی تھی' دوپہر کو چلی گئی اور پلوشے تو روز فون کرتی ہے' خوش ہے۔"

کھانا سب نے اکٹھے ہی کھایا۔

کھانے کے بعد وہ راشدہ کے ساتھ لان میں چلی آئی۔ چاندنی رات میں تالاب کے پاس بیٹھے ہوئے ماحول میں اک عجیب سا فسوں طاری تھا' جس سے وہ دونوں محظوظ ہو رہی تھیں۔

"تم تو ایگزیمز کے بعد ایسے غائب ہوئی ہو کہ تمہیں ڈھونڈنے کے لیے لگتا ہے شہر میں منادی کروانا پڑے گی۔"

اپنے عقب میں زوار کی بھاری دلکش آواز پر وہ فوراً" پلٹی۔ راشدہ بھابھی مسکراتی ہوئی دونوں کو دیکھنے لگی۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" اس نے تیوریاں چڑھا کر زوار کو گھورا تو وہ مسکراتا ہوا راشدہ اور اس کے درمیان خالی جگہ پر ٹک گیا۔ دونوں تالاب کی دیوار پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

"تمہیں دیکھنے۔ بڑے دن ہو گئے ہیں' تمہاری کڑوی کسیلی سنے۔" اس نے جواباً" اسے گھور کر جواب دیا۔

"دیکھ رہی ہیں بھابھی! یہ ہمیشہ لڑائی کی ابتدا کرتا ہے اور اگر میں کچھ کہتی ہوں تو بابا جان تک شکایات پہنچ جاتی ہے۔ میں تو دن رات شکرانے کے نفل پڑھتی ہوں کہ تم جیسے باڈی گارڈ سے جان چھوٹی۔ یونیورسٹی میں برداشت کرنا تو مجبوری تھی کہ بابا جان اکیلے آنے جانے نہیں دیتے تھے۔" اس نے بھی فوراً" حساب چکایا تھا۔

"تمہیں اتنا ہینڈسم' وجیہہ اور خوب صورت لڑکا باڈی گارڈ لگتا ہے۔" اس نے فوراً" اس کے الفاظ پر گرفت کی تھی۔

"میرے لیے تو باڈی گارڈ ہی تھے۔ بابا جان نے تمہیں یہ ہی تو بنایا تھا۔"

"خیر! باڈی گارڈ کا بڑا خوب صورت مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے' کیوں بھابھی جان!؟"

اس نے فوراً" راشدہ کو ساتھ ملایا' اس نے فوراً" مسکراتے ہوئے گردن ہلادی۔

"بکواس نہیں کرو' میں گل بی بی سے شکایت کردوں گی۔" وہ جل کر بولی۔

"بصد شوق! اس طرح تو میرا کام اور آسان ہوجائے گا۔" سرخ سرخ چہرے والی پشمینہ اسے شروع سے ہی بڑی پسند تھی۔

سجاول کی شادی کے بعد زوار کی راہ کھل گئی تھی۔ پہلے پشمینہ سے متعلق وہ اپنی ہر سوچ چھپا کر رکھتا تھا' مگر اب کھلے عام اظہار کرتا تھا اور پشمینہ اسی بات سے بدکتی تھی۔ اب بھی اسے گھور اتھا۔

"ظالم نظروں سے تم نہ مجھ کو دیکھو' مر جاؤں گا' او جان جاناں۔" وہ بڑی شوخی سے گنگنایا۔

"بھابھی!" اس نے بے اختیار ہنستی ہوئی راشدہ کو پکارا۔

"بری بات زوار! تم خوامخوا بے چاری کو تنگ کررہے ہو۔"

"خوامخوا؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"میں تمہیں تالاب میں دھکا دے دوں گی' خبردار! اب تم ایک لفظ بھی بولے تو۔" اس نے دھمکی دی تھی۔

زوار اور وہ یونیورسٹی میں اکٹھے ہی تھے۔ بابا جان نے ان سب بہنوں کے تعلیمی سلسلے میں کہیں بھی آنے جانے کی تمام تر ذمہ داری سجاول اور زوار پر ہی ڈالی ہوئی تھی۔ بلکہ صارم کی گمشدگی کے بعد پھوپھی بیگم نے بی بی جان کی حالت دیکھتے ہوئے زوار کو ہمیشہ کے لیے ادھر ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک طرح سے بابا جان کا منہ بولا بیٹا بنا ہوا تھا۔ اسی لیے اس کی سب کے ساتھ ایسی ہی بے تکلفی تھی۔ وہ تو اب گل بی بی نے رشتے کا جو شوشہ چھوڑا تھا' اس وجہ سے پشمینہ اس سے جھجکنے لگی تھی' ورنہ ہم عمر ہونے اور ایک جیسے مشاغل رکھنے کی وجہ سے دونوں کی خوب بنتی تھی۔ جتنا لڑتے تھے' پیار بھی اتنا ہی تھا' مگر جوں ہی زوار کے تیور بدلے' وہ اس سے پہلو بچانے لگی تھی۔

"توبہ! لڑتے ہی رہتے ہو تم دونوں' میں اندر ممانی جان کے پاس جارہی ہوں' لڑو آرام سے۔" راشدہ دونوں کو ٹوک کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ بھی منہ پھلا کر اسے کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے جانے لگی تو زوار نے تیزی سے اس کا ہاتھ تھام کر روک لیا۔

"کیا ہے؟" وہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

"کبھی پیار سے بھی پوچھ لیا کرو' ہر وقت لڑاکا طیارہ بنی رہتی ہو۔" الفاظ کے برعکس زوار کی آنکھوں کے تیور ایسے تھے کہ وہ ایک دم سٹپٹا گئی۔

"ہاتھ تو چھوڑو۔" اسے گھبراتے دیکھ کر وہ محظوظ ہوا تھا۔

"بی بی جان آج ماموں جان سے ہمارے رشتے کی باقاعدہ بات کرنے آئی ہیں۔" اس نے بڑے آرام سے انکشاف کیا تو وہ گھبرا گئی۔

"ماموں جان تم سے پوچھیں تو منہ پھاڑ کر اعتراض کرنے مت بیٹھ جانا۔" اس نے ڈپٹ کر تنبیہہ کی۔

"وہ مجھ سے پوچھیں گے تو میں صاف صاف منع کردوں گی' تم میں تو کوئی خوبی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملنے والی' تو کیا بابا جان اپنی لاڈلی بیٹی کی قسمت پھوڑ دیں گے۔" وہ آنکھوں میں شرارت لیے کہہ رہی تھی۔

"اچھا' یہ ہی بات ذرا میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنا۔" اس نے مصنوعی غصہ سے کہا' پھر اس کے گھبرا جانے پر ہنس دیا۔

"خبردار! اگر تم نے کوئی الٹی سیدھی بکواس کی؟" تمہیں کیا پتا میری برسوں کی خواہش پوری ہونے جارہی ہے' کتنی منتیں مرادیں مانی ہوئی ہیں میں نے۔" اسے بھاگنے کو پر تولتے دیکھ کر اس نے دوبارہ تنبیہہ کی تھی۔ پشمینہ کے ہونٹوں پہ بڑی پیاری سی مسکان ابھری تھی۔

"سب جانتی ہوں میں۔" جلدی سے کہہ کر وہ ایک دم اندر کی طرف بھاگی تھی۔ زوار مسکرا کر ادھر ہی دیکھے گیا۔



وہ جو اسد سے کہہ کر گئی تھی کہ وہ اس کے ساتھ تایا ابو کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جائے' مگر اسد کا رویہ دیکھ کر گھر جلدی نہ آسکی تھی۔ چھٹی کے بعد اسے گھر آتے ہوئے ڈھائی بج گئے تھے۔ دیکھا تو دروازہ مقفل تھا۔ اس کے پاس اضافی چابی تھی' گھر کی ایک چابی اسد کے پاس ہوتی تھی اور ایک اس کے پاس۔ دروازہ کھول کر وہ اندر آگئی۔ کپڑے بدل کر نماز ادا کی' پھر کچن میں گھس گئی۔ اسد اس کی غیر موجودگی میں کچن کا باقی سامان بھی لے آیا تھا۔ فریج بھرا ہوا تھا۔

سالن بھی تیار تھا۔ صباح نے دیکھا' ذائقہ اچھا تھا۔ اسد اکثر کوئی نہ کوئی سالن بنا کر رکھ دیتا تھا۔ صباح نے دل ہی دل میں اسد کے سگھڑاپے اور ہاتھ کے ذائقے کی داد دی تھی۔

تائی بیگم کا انتقال کافی سال پہلے ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد راجیہ باجی نے گھر سنبھالا ہوا تھا۔ مگر تایا ابو نے ان کی شادی بھی بڑی کم عمری میں کردی تھی۔ راجیہ کے بعد ساری ذمہ داریاں ان تینوں مردوں پر آگئی تھی۔ حماد اور اسد کسی سلیقہ مند عورت کی طرح گھریلو امور میں ماہر تھے۔ پھر بھی اس گھر کو ایک عورت کی ہر حال میں ضرورت تھی اور یہ کمی صباح نے پوری کردی تھی۔

کتنے دنوں سے ایک ایک کرکے کچن کا سامان ختم ہو رہا تھا' مگر وہ اپنی انا کی وجہ سے اسد کو بتا نہیں پارہی تھی۔ اب فریج بھرا ہوا تھا۔ اسے اندر ہی اندر شرمندگی بھی ہو رہی تھی کہ خوامخوا اتنے دن چپ رہی' اس سے قبل تو اس کے کہنے سے پہلے ہی اسد سب سامان لا کر دے دیا کرتا تھا۔ پتا نہیں اس دفعہ اس نے ایسا کیوں کیا تھا' شاید بھول گیا تھا یا شاید جان بوجھ کر۔

روٹیاں پکا کر وہ دونوں کا انتظار کرنے لگی۔ تقریباً"

ساڑھے تین بجے وہ دونوں لوٹے۔

"اتنی دیر کردی تایا ابو آپ نے، مجھے فکر ہو رہی تھی۔"

دروازہ کھولتے ہی اسد کو نظر انداز کرکے اس نے فوراً" تایا ابو سے کہا تھا۔ اسد اس کے یوں راستہ روکنے پر خفا ہوا تھا۔

"اندر تو آنے دو، یہ بازپرس اندر جاکر بھی ہوسکتی ہے۔"

سنجیدہ اور بے مروت انداز میں اس نے ٹوکا تو وہ فوراً" سامنے سے ہٹ گئی۔

اسد تایا ابو کو ان کے کمرے میں لے گیا تو وہ بھی پیچھے پیچھے چلی آئی۔ اسد نے ان کو بستر پر لٹا دیا تھا۔

"کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر؟" وہ بھی تایا ابو کے بستر پر ٹک گئی۔ وہ جتنے نڈھال لگ رہے تھے، اُسے تشویش لاحق ہوگئی تھی، تاہم اسد چپ ہی رہا تھا۔

"اسد بیٹے سے ہی کچھ نہ کچھ کہتا رہا تھا۔ مجھے تو صرف اتنا ہی کہا کہ میں روزانہ کم از کم آدھا گھنٹہ ضرور ورزش کروں بلکہ واک کیا کروں، دوائیاں اور پھل بھی استعمال کروں۔" انہوں نے تکیے سے ٹیک لگالی۔

"میں کھانا لاتی ہوں۔"

"ابو کو کھلا دو، مجھے بھوک نہیں ہے، مجھے آفس بھی پہنچنا ہے۔"

صباح کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس نے کہا تو وہ پلٹ کر اسد کو دیکھنے لگی۔ سنجیدہ انداز لیے وہ کافی روکھا پھیکا سا لگ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے بڑی مروت سے مخاطب ہوتا تھا۔ آج شاید اس کے احساس کو کچھ زیادہ ہی بے دردی سے اس نے کچلا تھا کہ اس کے لہجے میں کچھ تلخی در آئی تھی۔ وہ صباح کے دیکھنے پر اٹھ کھڑا ہوا۔

صباح خاموشی سے پلٹ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

کھانا نکال رہی تھی کہ آہٹ پر پلٹ کر دیکھا، اسد دروازے کی دہلیز پر کھڑا ہوا تھا۔

"یہ میڈیسن لے لو، ڈاکٹر بہت تشویش کا اظہار کررہا تھا، ابو نے تو جیسے زندہ رہنے کی خواہش ہی اپنے اندر سے ختم کرلی ہے، تم ان کو سمجھانے کی کوشش کرو، ساری ہدایات اور میڈیسن کے اوقات اس پرچے پر درج ہیں۔ تم دیکھ لینا۔"

اس کے قریب ہی میز پر دوائیاں رکھ کر وہ پلٹ گیا تھا۔

صباح ایک گہرا سانس لے کر کھانا اور دوائی لیے تایا ابو کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

رات کو اسد گھر لوٹا تو صباح تایا ابو کے کمرے میں تھی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

وہ سو رہے تھے۔ چہرے پر نقاہت و تکلیف کے آثار واضح تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ ان کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگائے وہ جس اذیت سے گزر رہی تھی، یہ صرف وہ ہی جانتی تھی۔

"ٹیک اٹ ایزی صباح! ان شاء اللہ ابو جلد ٹھیک ہوجائیں گے۔"

اسے یوں بے آواز روتے دیکھ کر اسد کا دل پسیجا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی تھی۔ وہ اور شدت سے سسک اٹھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ امی، ابو اور حماد کے بعد اب تایا ابو بھی اسے چھوڑ جائیں گے۔ پھر وہ کہاں رہے گی؟ کیا کرے گی؟ کون تھا اس کا؟ کسی طور بھی اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔

تایا اس کے لیے ایک مضبوط تناور درخت کی مانند تھے۔ اگر انہیں کچھ ہوجائے تو وہ کدھر جائے گی، جبکہ راجیہ باجی بھی پاکستان میں نہیں ہیں۔

"صباح پلیز! صحت و تندرستی، زندگی و موت سب عمر کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اگر انسان یوں ایک دم حوصلہ ہارنے لگے تو زندگی گزارنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔"

اسد اسے سمجھا رہا تھا۔ اس نے بمشکل خود پر ضبط کیا۔

"تایا ابو ٹھیک تو ہوجائیں گے نا اسد!"

اس وقت اس کی کیفیت ایک چھوٹے سے بچے کی طرح ہو رہی تھی۔ آس و نراس میں ڈوبا وہ بچہ جس کا بہو بے یارو مددگار رہ جانے کے خوف سے زرد پڑ گیا ہو۔ وہ بے یقین سی تھی۔ آنکھوں میں بے پناہ پانی لیے اس نے اسد کو دیکھا تھا۔ اس کے دل میں اس کے آنسوؤں نے ایک تلاطم برپا کیا تھا۔ وہ ان آنکھوں میں کبھی بھی نمی نہ دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔

"یقین مضبوط رکھو، ابو ٹھیک ہوجائیں گے۔ مگر ان کو ٹھیک کرنے کے لیے ہم دونوں کو ہی کوشش کرنا ہوگی۔ اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا۔ اگر ہم ہی ہمت ہار گئے تو ان کو کون سنبھالے گا۔ یہ زندگی کی چاہ بھول گئے ہیں اور ہمیں مل کر ان کو زندگی کی طرف لانا ہے۔"

وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ صباح نے اپنے تمام آنسو سمیٹ کر سرہلاتے ہوئے اسے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

اسد سے اس کا رویہ خود بخود بہتر ہوگیا تھا۔

گزرنے والے دنوں میں اسے بخوبی احساس ہوگیا تھا کہ تایا ابو کے علاوہ اسد کا وجود اس کے لیے ایک مضبوط پناہ گاہ ہے۔ اس کی یہ سوچ دنیا داری کی حد تک تھی، اس سے بڑھ کر اس نے نہ کچھ سوچا تھا اور نہ ہی وہ سوچنا چاہتی تھی۔ اسد اور اس کے اندر ایک محسوس کیا جانے والا خلا اب بھی تھا۔ بے شک وہ اب اسے برائے ضرورت مخاطب کرنے لگی تھی۔

وہ تایا ابو کا ہاتھ تھامے باہر لے آئی تھی۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ عصر کے بعد کا وقت تھا۔ دھوپ ڈھل چکی تھی۔ مغرب کی طرف پھیلی سرخی کو بغور دیکھتے اس نے محسوس کیا کہ ہلکی ہلکی ہوا چلنے کی وجہ سے موسم خوش گوار ہوگیا تھا۔

"تایا ابو! موسم کتنا اچھا ہوگیا ہے نا۔" یوں ہی ادھر ادھر دیکھتے اس نے پوچھا آسمان پر آہستہ آہستہ ہلکی ہلکی بدلیاں چھارہی تھیں، وہ مسکرائے۔

"ہوں۔" ان کے جھریوں زدہ چہرے پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"تایا ابو! چھٹیوں میں جب بھی میں چھٹیاں گزارنے یہاں آتی تھی نا تو مجھے یہ گھر بہت متاثر کرتا تھا۔ اور ہر بار یہاں آنے کے بعد میرا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔" وہ ماضی کو یاد کرتے ہوئے کھو سی گئی تھی۔

"اور پھر ہم تمہیں ہمیشہ کے لیے اس گھر میں لے آئے تھے۔ مگر جس کے ساتھ لے کر آئے تھے وہ ہی چھوڑ گیا ہمیشہ کے لیے۔" ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے یہ موضوع ہی کیوں چھیڑا؟

تایا ابو نے اپنا لرزتا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

"تم میری ایک بات مانو گی صباح!" کچھ سوچتے، اس کا سر تھپتھپاتے انہوں نے کہا تو اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"آپ کہیے؟" تایا ابو کے چہرے پر گہری سوچ اور تفکر کا عکس واضح تھا، وہ الجھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم اب شادی کرلو، ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ صرف چوبیس سال، تمہاری عمر کی لڑکیاں تو ہر غم، ہر ذمہ داری سے بے نیاز، آزاد ہیں اور تم۔" ایک دفعہ پہلے بھی انہوں نے اس سے یہ ذکر چھیڑا تھا اور اب پھر... وہ خاموش رہی۔

"میں آج ہوں کل نہیں، مجھے اپنی زندگی کا اب کوئی بھروسا نہیں، مرتے مرتے زندگی نے ایک دفعہ پھر مہلت دے دی ہے۔ حماد زندہ رہتا تو تم ہی سے میرے گھر کی ساری رونقیں تھیں۔ اب بھی تم میرے گھر کی رونق ہو، مگر وہ نہیں تو مجھے بھی کوئی حق نہیں کہ میں تمہیں بٹھائے رکھوں، تمہارے ماں، باپ زندہ ہوتے تو یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ تمہارے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ راجیہ کا بھی فون آیا تھا وہ بھی خاصی پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔" وہ اسے بتا رہے تھے، وہ اب بھی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔

"یہ مستقل بیماری... اب دل بہت گھبرا گیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے... جلد از جلد

تمہارے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔"

"پلیز تایا ابو! میں اب دوبارہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ حماد زندہ تھا تو سب کچھ تھا اب وہ نہیں تو ایسی کوئی حسرت نہیں رہی' میں اس کی بیوی ہوں اور اسی کے نام پر ساری زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ مجھے دوبارہ شادی نہیں کرنا' آپ یہ ٹاپک میرے سامنے مت چھیڑا کریں پلیز۔" وہ بات کرتے کرتے رو دی۔

"دیکھو صباح بیٹی! مجھ بوڑھے کو اب مزید مت لٹکاؤ۔ ورنہ مرتے دم تک یہ دکھ رہے گا کہ تمہیں کس کے سہارے چھوڑے جا رہا ہوں۔" وہ دلگرفتہ سے خاموش ہو گئے تھے۔ دونوں کے درمیان خاموشی کے یہ پل طویل ہوتے جا رہے تھے۔

"اندر چلیں۔۔۔ آندھی آنے والی ہے' کتنی تیز ہوا ہو گئی ہے۔"

آسمان پر بدلیاں گہری ہو گئی تھیں۔ مغرب میں ڈوبتا سورج مزید اوجھل ہو گیا تھا۔ ہوا کا زور تیز تر ہوا تو اس نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ انہوں نے بڑی اذیت و بے بسی سے اسے دیکھا تو وہ چپ چاپ سر جھکا گئی۔

انہیں کمرے میں پہنچا کر وہ کچن میں آ گئی تھی۔ چیزوں کو ادھر ادھر کرتے ہوئے بھی ذہن تایا کی باتوں میں الجھ رہا تھا۔

"یہ ممکن نہیں تایا ابو۔۔۔ پلیز مجھے معاف کر دیں' جو آپ چاہ رہے ہیں' ایسا اب ممکن نہیں' میں حماد کی سنگت میں ساری خوشیاں حاصل کر چکی ہوں' اب اس تار تار دل میں کسی اور کے لیے قطعی کوئی گنجائش نہیں۔"

اس خیال سے ہی کہ اس کی زندگی میں حماد کی جگہ کوئی اور بھی لے سکتا ہے' وہ بے پناہ اذیت کا شکار ہو گئی تھی۔

اسد آیا تو اسے کھانا دے کر وہ عشاء کی نماز پڑھنے کمرے میں چلی آئی۔ نماز پڑھ کے واپس کچن میں آئی تو اسد کھانا کھانے کے بعد برتن بھی دھو کر جا چکا تھا۔ اس کی آواز تایا ابو کے کمرے سے آ رہی تھی۔ دونوں کسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ اس نے کچن سمیٹ کر چائے بنالی تھی۔

"میں نے اس سے پھر بات کی تھی' مگر وہ انکار کر رہی ہے۔" چائے بنا کر وہ تایا ابو کے کمرے میں آئی تو دروازے پر ہی رک گئی۔ موضوع بحث شاید اس کی ذات تھی۔

"تو پھر اب آپ کیا چاہتے ہیں؟" یہ اسد کی آواز تھی۔ وہ پوری طرح متوجہ ہوئی۔

"تم جانتے ہو کہ میں کیوں تم دونوں پر بار بار زور دے رہا ہوں۔" تایا ابو کی نروٹھی آواز سنائی دی۔

"صباح ایسا کبھی نہیں چاہے گی۔" اسد نے پرسکون انداز میں کہا تھا۔ صباح الجھی۔

"حماد کو گزرے دو سال ہو گئے ہیں' سنبھل گئی ہے وہ کافی۔ آہستہ آہستہ حالات سے سمجھوتا کر لے گی۔ تھوڑی جذباتی ہو رہی ہے اور کچھ نہیں۔"

"پھر بھی میرا خیال ہے وہ ایسا کبھی نہیں چاہے گی' میں اسے اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"اسد! میں سمجھوں کہ تمہارے نزدیک میری خواہش کی کوئی اہمیت نہیں؟" تایا ابو کی بھیگی آواز پر اسد تڑپ اٹھا۔

"پلیز ابو جان! کیوں مجھے گناہ گار کرتے ہیں' ساری صورت حال آپ کے سامنے ہے۔ حماد اور صباح کی اینجمنٹ سے آپ بے خبر تو نہیں۔ حماد کو اللہ نے عمر ہی اتنی دی تھی ورنہ میں تو ایسا سوچنا بھی اپنے لیے گناہ تصور کرتا ہوں۔"

"اسد بیٹے! یہ میری خواہش ہے اور جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے' یہ شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ میں دل سے چاہتا ہوں تم صباح سے شادی کر لو' اسے تحفظ دو۔" انہوں نے ذرا توقف کیا۔

"حماد کی اگر خواہش نہ ہوتی تو تب بھی میں نے سوچ رکھا تھا کہ صباح کو تمہارے لیے اس گھر میں لاؤں گا' مگر پھر حماد نے خواہش کا اظہار کر دیا پھر صباح کا رجحان دیکھتے میں نے بھی چپ سادھ لی' وہ اب نہیں مگر تم تو ہو نا؟ تم سے بہتر صباح کو کوئی اور نہیں مجھ

سکتا' وہ خاموش طبع' سنجیدہ مزاج' جذباتی سی لڑکی ہے۔ مجھے خوف آتا ہے کہ کہیں اسے ایسی ویسی جگہ بیاہ کر اس کے ساتھ زیادتی نہ کر بیٹھوں۔ میں اسے تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ وہ حماد کو نہیں بھولی' اب بھی ذکر کرتا ہوں تو رو دیتی ہے' مجھے تم پر بھروسا ہے' تمہارے ساتھ بیاہتے ہوئے مجھے یہ تکلیف نہیں ہوگی کہ تم اسے اس کی پچھلی زندگی کا حوالہ دو گے۔ مجھے یقین ہے تم دونوں بہت خوش رہو گے۔ تم اسے اسی طرح عزت اور مان دو گے جیسے حماد دیتا تھا۔"

ٹرے صباح کے ہاتھوں میں لرز گئی تھی۔

اسے لگا کسی نے اس کا دل مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں اسد! اگر ہے تو کہہ دو' جو بھی دل میں ہے بتا دو۔"

اس سے پہلے کہ اسد کچھ کہتا وہ واپس پلٹ گئی' ٹرے کچن کی سلیب پر رکھ کر وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

حویلی بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ دلہن کی طرح سجی حویلی دور سے ہی دیکھنے سے نمایاں ہو رہی تھی۔

آج خان ذکاء اللہ خان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی پشمینہ خان کی منگنی زوار خان سے ہو رہی تھی۔ بی بی جان مطمئن سی ادھر سے اُدھر ملازماؤں کو ہدایات دیتی خاصی مصروف تھیں۔ پلوشے اور زرمینے تو ہفتہ پہلے ہی حویلی میں ڈیرا جما چکی تھیں۔ ان کے ہاں شادی بیاہ کی رسمیں بڑی روایتی سی تھیں۔ خان ذکاء اللہ نے بے شک تینوں بیٹوں کو اعلا تعلیم سے آراستہ کیا تھا۔ مگر اپنی اقدار نہ بھولے تھے۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔" زرمینے نے اسے مسکرا کر دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔

"لگنا بھی چاہیے' آخر میرے پیارے جیلے بھیا کے نام کا سنگھار ہے۔" زوار کی بہن لیلیٰ سے رہا نہ گیا۔

بھاری خوب صورت لباس اور زیورات میں وہ کوئی اپسرا ہی لگ رہی تھی۔

بی بی جان کی اجازت سے گل بیگم نے اسے خاندانی انگوٹھی پہنا کر رسم کا آغاز کیا تھا۔

"تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔ ذرا دل تھام کے رکھنا۔" لیلیٰ نے ہنس کر کہا تو اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ مگر لیلیٰ ہنستے ہوئے نکل گئی۔ کچھ دیر بعد جب خان ذکاء اللہ نکاح خواں کو لیے ہوئے آئے تو وہ حیران ہی رہ گئی۔

پشمینہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ منگنی کے ساتھ نکاح بھی ہو جائے گا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے دستخط کیے تھے۔ لیلیٰ خوب چہکتی پھر رہی تھی۔

"میں نے تمہیں کہا تھا ناکہ دل تھام کے رکھنا' یہ تمہارے لیے سرپرائز تھا۔ کہو کیسا لگا ہمارا سرپرائز؟"

وہ ابھی تک حیرت زدہ تھی' محض مسکرا کر سر جھکا گئی تھی۔

کچھ دیر بعد مہمانوں کا رش کم ہوا تو پلوشے اور لیلیٰ کی ہمراہی میں وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

"میں نے زوار بھیا سے وعدہ کیا تھا کہ تم دونوں کی ملاقات کا بندوبست کر دوں گی۔ تم بس کچھ دیر ایسے ہی رہنا' میں بھیا کو اطلاع کرتی ہوں۔"

وہ پریشان ہو اٹھی۔

"نہیں لیلیٰ۔۔۔ سنو تو۔۔۔ کسی کو خبر ہو گئی تو؟"

"جناب! میں نے انتظام کر رکھا ہے' تم آرام سے ادھر بیٹھو' پلوشے اور بھابھی ہمارے ساتھ ہیں بس دو منٹ کی تو بات ہو گی۔" وہ گھبرائی سی اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو اس کا دل کانپا۔

"السلام علیکم!" پرجوش' کھنکھناتی' جذبات سے بھرپور آواز پر وہ سمٹ سی گئی۔

"کیا حال ہیں؟ ماشاء اللہ بڑی خوب صورت لگ رہی ہو۔ خیر ہے نا۔" بڑے والہانہ انداز میں اس کے بنے سنورے سراپے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے گھورنے کو سر اٹھایا' مگر اس کے تیور دیکھ کر گھبرا کر پھر سر جھکا لیا۔

"کیسا لگا سرپرائز؟" پشمینہ کو اپنے جذبات ریشم کی طرح نرم محسوس ہوئے' سر اٹھا کر اسے دیکھا جس کی آنکھوں میں جذبوں کا ایک جہاں آباد تھا۔

"اچھا تو یہ ساری کارستانی آپ کی تھی؟"

"کیا کارستانی؟" اس کی محبت کے اس انداز کو اس نے کارستانی کہا تو وہ چیخ پڑا۔

وہ ہنسنے لگی' اسے مسکراتے دیکھ کر وہ بے خود سا آگے بڑھا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی خوشنما سی حرکت کرتا' پشمینہ نے پکارا۔

"زوار! میں ہمیشہ اسی حویلی میں رہنا چاہتی ہوں۔ میں بی بی جان اور بابا جان کو اکیلے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔"

زوار نے اسے ایک پل بغور دیکھا۔

"بی بی جان نے تمہیں اپنا بیٹا بنایا ہوا ہے۔ تم شروع سے ہی اس حویلی میں رہے ہو۔ بابا جان اور بی بی جان نے تم سے بہت سی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ بابا قبیلے کی وجہ سے ایسا نہیں سوچتے' مگر تم ہمیشہ اس حویلی میں رہو' یہ ان کی بھی خواہش ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"ویسے ہے تو یہ مردانگی کے خلاف کہ میں گھر داماد بن کر رہوں مگر گھر داماد سے پہلے میں اس حویلی کا بیٹا ہوں' اور بیٹے ہمیشہ اپنے گھروں میں ہی سجتے ہیں بیگم!" اس کی سنجیدگی کو اس نے ہنسی میں اڑا لیا تو اس کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت سی مسکان سمٹ آئی تھی۔ "زوار تم۔۔۔ تم بہت اچھے ہو۔"

"بس! ٹائم از اوور' بی بی جان اور دیگر لوگ ادھر آ رہے ہیں۔ زوار لالہ! جلدی سے بھاگنے کی راہ لیں۔" اس سے پہلے کہ زوار جواباً کوئی خوب صورت سی کارروائی کرتا لیلیٰ کی آمد نے اسے گڑبڑا دیا تھا۔ زوار لیلیٰ کی بات کا خیال کرتے ہوئے جلدی سے باہر کی طرف لپکا اور پشمینہ نے سکھ کا سانس لیا کہ زوار نے اس کی اتنی بڑی خواہش کو اتنی آسانی سے پورا کر دیا۔ اگر وہ بھی بیاہ کر اس حویلی سے چلی جاتی تو بی بی جان اور بابا جان کو صارم کی جدائی مزید تڑپانے لگتی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح وہ نو بجے تک بھی کمرے سے نہ نکلی تو اسد کو تشویش لاحق ہوئی۔

رات کو وہ جب مجتبیٰ حسن سے بات کر کے کمرے سے نکلا تو کچن میں پانی پینے کی غرض سے گیا تھا' مگر وہاں سلیب پر ٹرے میں چائے کے تین کپ دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے لیے یہ انکشاف ہی بڑا اذیت ناک تھا کہ وہ ان کی گفتگو سن چکی ہے اور اس کے بعد اس نے کیا کیا اندازہ لگایا ہو گا۔۔۔ وہ سوچ سوچ کر الجھتا رہا۔ دل تو چاہا کہ ابھی جا کر صورت حال واضح کر دے۔ مگر پھر اس کے مزاج اور تیوروں کا خیال کر کے رک گیا تھا' لیکن اب نو بجے تو وہ صبر نہ کر سکا۔

"صباح۔۔۔" اس نے دروازے پر دستک دی۔

"صباح۔۔۔" اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ قدرے پریشان ہو گیا۔

وہ مسلسل اسے آوازیں دیتے دروازہ بجاتا چلا گیا تھا۔

"صباح۔۔۔" اس کا نام ہونٹوں میں ہی اٹک گیا۔ جب ایک دم دروازہ کھل گیا تھا۔ اسد کا دستک کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا۔

"دستک دینے کا یہ کون سا انداز ہے۔ بہری نہیں ہوں میں۔" اس نے اسد کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا تھا۔ چہرے سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ابھی منہ دھو کر باتھ روم سے نکلی ہے۔

"تم ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلیں تو۔۔۔" اس کا غصے سے سرخ چہرہ اور بدلحاظی دیکھتے اسد نے وضاحت کرنا چاہی تھی مگر اس نے درشتی سے بات کاٹ دی تھی۔

"مر نہیں گئی تھی میں۔"

"ابو تمہیں بلا رہے ہیں۔" وہ مزید کچھ کہے بغیر اس کے گیلے چہرے پر ایک نگاہ ڈالتے سامنے سے ہٹ گیا۔ صباح لب بھینچے اس کی چوڑی پشت دیکھے گئی۔

وہ تایا ابو کے پاس جانے کی بجائے گھر کی صفائی

ستھرائی میں لگ گئی۔ دو گھنٹے بعد جب بھوک لگی تو ہاتھ دھو کر وہ کچن میں آئی اسد کو چولہے کے سامنے کھڑے دیکھ کر رک گئی۔

تو ابھی تک اس نے اور تایا ابو نے ناشتا نہیں کیا تھا ایسا پہلے بھی ایک بار ہوا تھا۔ وہ بیمار تھی تو اسد نے خود ہی ناشتا تیار کرلیا تھا اور پھر آج۔۔۔ اسے رات کی تمام گفتگو یاد آئی تو پھر اس کا غصہ بڑھنے لگا۔

اسد روٹی بیلنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ دونوں توس کھالیتے تھے، مگر تایا ابو صرف روٹی کا ہی ناشتا کرتے تھے۔ صباح کو شرمندگی سی محسوس ہوئی۔

"پیچھے ہٹیں، میں بناتی ہوں۔" وہ اپنے غصے کو پس پشت ڈالے آگے بڑھی تھی۔

اسد نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر روٹی بیل کر توے پر ڈال دی۔ صباح کو بڑی سبکی کا احساس ہوا۔ اگر تایا ابو کی بھوک کا خیال نہ ہوتا تو پلٹ جاتی مگر۔۔۔

"میں نے کہا نا کہ ہٹیں پیچھے، میں بنالیتی ہوں۔" اسد کو دوبارہ آٹے کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ کر اس نے فوراً" آٹے والا برتن اٹھالیا۔ اسد نے ایک سنجیدہ نگاہ اس پر ڈالی۔

"رہنے دیں، آپ جائیں یہاں سے، ہمیں عادت ہے یہ سب کرنے کی۔ خوامخواہ ہماری عادتیں خراب مت کریں۔" اس کے لہجے میں پل بھر میں اجنبیت در آئی تھی۔

"تو پھر اپنے لیے بنالیں، میں اپنے اور تایا ابو کے لیے بنالوں گی۔" اس نے بھی اجنبیت سے کہا تو وہ خاموشی سے روٹی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اپنے لیے روٹی بنا کر پلیٹ میں رکھ کر چولہا بند کرکے توا ایک طرف رکھنے کے بعد وہ آملیٹ، جو وہ شاید پہلے ہی تیار کرچکا تھا، لے کر کھانے کی میز پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگ گیا۔

اس کا یہ روپ پہلی بار صباح کے سامنے آیا تھا، وہ ایک پل کو حیران کھڑی رہ گئی تھی۔ اسے ناشتا کرتے دیکھ کر اس نے سر جھٹکا پھر دوبارہ چولہا جلا کر توا رکھا، اپنے لیے پراٹھا اور تایا ابو کے لیے سادہ پھلکا بنایا، پھر ٹرے لے کر تایا ابو کے کمرے میں چلی آئی۔

وہ قرآنی تفسیر سے متعلق کسی کتاب کا مطالعہ کررہے تھے، اسے دیکھ کر سر اٹھایا۔

"آج بہت سوئیں تم؟" اس نے جیسے ہی میز پر ٹرے رکھی تو انہوں نے کتاب بند کرکے تپائی پر رکھ دی۔

"بس، رات اچھی طرح نیند نہیں آئی، اس لیے صبح جلد آنکھ نہیں کھل سکی۔"

ان کے سامنے کھانا رکھتے اس نے بتایا تو وہ مسکرا دیے۔

"رات نیند کیوں نہیں آئی تھی" وہ خوش دلی سے پوچھ رہے تھے، جبکہ صباح کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

"بس پچھلی زندگی کی باتیں یاد آتی رہیں، امی، ابو، حماد۔"

تایا ابو نے اب کے بغور دیکھا تو اس کی آنکھوں کے سوجے پپوٹے واضح دکھائی دیے۔

"کیا تم حماد کو بھول نہیں سکتیں؟" ان کے لہجے میں آزردگی سی سمٹ آئی تھی۔

اس کے سامنے ناشتا رکھا ہوا تھا، مگر ابھی تک اس نے ایک لقمہ بھی نہ لیا تھا۔ تایا ابو اس کا چہرہ دیکھتے رہ گئے۔

"مگر میں تمہیں ساری زندگی یوں گزارنے کی حماقت بھی نہیں کرنے دوں گا۔" انہوں نے ٹرے کھسکا کر خاصی برہمی سے کہا تو وہ بے بسی سے انہیں دیکھنے لگی۔

"تایا ابو! یہ دل کے معاملات ہیں، آپ زبردستی مت کریں پلیز۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ مجتبیٰ حسن صاحب دکھ سے اسے دیکھے گئے۔

"صباح بیٹے! یہ زبردستی نہیں ہے، تم ابھی کم عمر ہو، جذباتی ہو، تم نہیں سمجھ سکتیں کہ تمہیں مستقبل میں کن مسائل اور حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ فیصلہ تنہا زندگی گزارنے سے ہزار درجے بہتر ہے، میں نے اسد سے بات کرلی ہے۔ وہ راضی ہے، میں نے سوچ لیا ہے کہ اس سے پہلے کہ موت آپہنچے، میں تم دونوں کے فرض سے سبکدوش ہوجاؤں۔" ان کا انداز و لہجہ فیصلہ کن تھا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھے گئی۔

"تمہارے ماں، باپ زندہ ہوتے تو میں کبھی زبردستی نہ کرتا، راجیہ یہاں ہوتی تو بھی کوئی پریشانی نہ ہوتی کہ میرے بعد وہ تمہارا اچھا برا سوچنے والی ہے۔ اسد تمہارے لیے ایک غیر محرم ہے۔ وہ کب تک تمہیں تحفظ فراہم کرسکتا ہے۔ کل کو اس نے بھی شادی کرنا ہے اور آنے والی نہ جانے کیسی ہو، وہ تمہیں برداشت کرے یا نہیں اور سچ تو یہ ہے کہ تمہیں کہیں اور بیاہتے ہوئے مجھے خود بھی خوف آتا ہے۔ اسد اچھا انسان ہے۔ کوئی کمی، خامی نہیں، میں نے راجیہ سے رات فون پر تفصیلی بات کی تھی، اسے میرے فیصلے سے خوشی ہوئی ہے۔" وہ لب بھینچے بیٹھی رہی۔

"صباح بیٹے! یقین کرو اسد بہت اچھا انسان ہے، ان دو سالوں میں تم نے اسے اچھی طرح دیکھا ہے، اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اگر تم اس وجہ سے خوف زدہ ہو کہ نہ جانے وہ کس خاندان کا خون ہے تو بیٹا اس چھوٹی سی بات کو ذہن میں جگہ مت دو۔ اس کے انداز و اطوار، مزاج و شباہت سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی عام گھرانے کا چشم و چراغ نہیں ہے۔ نہ جانے کیا حالات تھے کہ وہ مجھے اس حالت میں ملا۔ نہ جانے کس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور کس کے دل کا ٹکڑا ہے۔ خدانخواستہ غلط ہاتھوں میں پڑ جاتا تو کیا مستقبل ہوتا۔ میں نے اسے اپنا نام دیا۔ لکھایا، پڑھایا، معاشرے میں ایک مقام دیا۔ لوگ اسے میرا بیٹا ہی کہتے ہیں۔ وہ میرے لیے دوسرا حماد ہے۔ اور ایک باپ اپنی بیٹی کے لیے ایسا ہی بر چاہتا ہے۔"

وہ نہ جانے اسے کیا کیا سمجھا رہے تھے، وہ ایک دم اٹھی اور ان کے کمرے سے نکل آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کے اور تایا جان کے درمیان اک خاموشی سی جنگ جاری تھی، اسد کو صورت حال کا اندازہ تھا۔ مگر وہ خاموش تھا۔ مجتبیٰ حسن صاحب نے اپنا فیصلہ منوانے کے لیے اس سے بات چیت بند کردی تھی۔ انہیں لگتا تھا کہ اس طرح وہ صباح کو قائل کرلیں گے۔ مگر اندر ہی اندر اس خاموش پالیسی پر تینوں ہی دلگرفتہ اور پریشان تھے۔

صباح عجب آزردگی کی کیفیت میں گھری ہوئی تھی۔ رات میں اسے نیند نہیں آرہی تھی تو باہر نکل آئی تھی، کچھ دیر تو برآمدے کی سیڑھیوں پر گم صم بیٹھی رہی، پھر اچانک تایا ابو کے کمرے سے دھڑام سے کوئی چیز گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی تو وہ چونک گئی، اٹھ کر کمرے کی طرف بھاگی۔ دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو اوسان خطا ہوگئے۔ تایا ابو شاید پانی پینے کے لیے اٹھے تھے، سنبھل نہ سکے اور گر پڑے۔ گلاس ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

اس نے دوسرے بستر کی طرف دیکھا، وہ خالی تھا، اسد بستر پر نہ تھا۔ تایا ابو کی طبیعت کی وجہ سے اسد زیادہ تر اسی کمرے میں سوتا تھا۔ مگر جس دن اس کے آفس کا کام ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا تاکہ مجتبیٰ حسن ڈسٹرب نہ ہوں۔

وہ دوڑ کر ان کے قریب پہنچی اور پوری قوت لگا کر ان کو اٹھانے کی کوشش کی، مگر جب وہ انہیں سنبھال نہ پائی تو اسد کے کمرے کی طرف بھاگی۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ تیزی سے اندر داخل ہوتے ہی اس نے بستر پر دراز اسد کے اوپر سے چادر کھینچ لی۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ کبھی بھی اس کے کمرے میں داخل نہیں ہوئی تھی اور اب رات کے اس پہر، اس کی حیرت یقینی تھی۔

"وہ اسد! تایا ابو۔" باقی کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ کام نپٹا کر لیٹا تھا۔ فوراً" بستر سے اترا اور تایا ابو کے کمرے کی طرف بھاگا۔

تایا ابو بے ہوش ہوچکے تھے۔

"ابو۔۔۔" اس نے سیدھا کیا، مگر کوئی حرکت نہ ہوئی تھی۔ ان کی حالت دیکھ کر وہ رو پڑی تھی۔

"اسد پلیز ڈاکٹر کو بلوائیں، یا ان کو اسپتال لے

جائیں۔" اس نے وحشت سے اسد کا بازو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ اسد نے انہیں بستر پر لٹا دیا تھا۔

"میں انکل امتیاز کی طرف جاتا ہوں۔ اس وقت ڈاکٹرز کا تو ملنا مشکل ہی ہے۔ میں ان کے ساتھ ابو کو لے کر جاتا ہوں۔"

وہ عجلت میں کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ساتھ انکل امتیاز تھے۔

وہ انکل امتیاز کے ساتھ مجتبیٰ حسن کو لے کر ہسپتال چلا گیا۔ ساری رات وہ پریشانی میں ٹہلتی رہی۔ صبح اس نے ہسپتال سے صباح کو خیریت کا فون کر دیا۔

دوپہر میں اسد اسے لینے گھر آیا تو کافی تھکا ہوا اور نڈھال لگ رہا تھا۔ ساری رات کی بھاگ دوڑ اور بے آرامی نے اسے کافی متاثر کیا تھا۔ اسد کو اس حالت میں دیکھ کر صباح شرمندہ سی ہو گئی۔

"بہت تھک گئے ہیں۔ کھانا کھائیں گے۔" اس نے بالوں میں انگلیاں چلاتے چلاتے رک کر اسے دیکھا۔ تھکے تھکے اعصاب لیے اس نے آنکھیں موند لیں۔

"ہوں۔" کچھ توقف کے بعد اس نے کہا تھا۔

وہ کچن میں آگئی' اس کے لیے کھانا بناتے ہوئے وہ عجب سے احساسات کا شکار ہوئی۔ کھانے کی ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھی۔ آواز پر اسد نے آنکھیں کھولیں۔ ٹرے اپنی طرف کھسکاتے اس نے صباح سے بھی کھانے کو کہا تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"صباح۔۔۔! ابو جان کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ ڈاکٹرز مکمل طور پر ناامید ہیں' کہہ رہے ہیں کہ اس اٹیک کے بعد ان کی حالت سنبھلنے کی بجائے مزید بگڑنے کا خدشہ ہے۔ دراصل وہ خود بھی اپنی ول پاور ختم کر چکے ہیں۔ ڈاکٹرز کہہ رہے تھے کہ گھر میں ان پر خصوصی توجہ دیں۔ انہیں ایسا ماحول فراہم کریں کہ یہ ٹینشن سے دور رہیں۔" انہیں انجائنا کا دورہ پڑا تھا۔

کھانا کھاتے دھیمے لب و لہجے میں اس نے ساری صورت حال بتائی۔ صباح کا ضبط بکھر کر رہ گیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"رونے کا کوئی فائدہ نہیں صباح! آپ کو یہ ساری صورت حال اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کا ان سے دُہرا رشتہ ہے۔ میرا بے شک ان سے خون کا کوئی رشتہ نہیں' مگر میں نے انہیں ہمیشہ باپ ہی تسلیم کیا ہے۔ جتنا آپ ان کے قریب رہی ہیں' اتنا میں بھی نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں' آپ ان سے بہت محبت کرتی ہیں' مگر پلیز آپ ان کو اس ٹینشن سے نکال دیں۔ اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر لیں۔ زندگی کبھی تنہا نہیں گزرتی' آپ کو زندگی میں ابھی نہیں تو آگے ضرور سہارے کی ضرورت پڑے گی۔ میں اپنے لیے فورس نہیں کر رہا۔ آپ بے شک کسی اور کے لیے ہی سہی' ہاں کہہ دیں' وہ اس دنیا سے جانے سے پہلے آپ کی فکر سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ آپ کو اپنے گھر میں پھر سے آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔"

دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ساری صورت حال واضح کر دی تھی۔ وہ گم صم سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ وہ جتنا مرضی جھٹلاتی لیکن تایا ابو کے اس اٹیک کی وجہ وہ خود بھی تھی' جس طرح وہ ان سے قطع تعلق کیے ہوئے تھی' یہ صورت حال تو پیش آنا ہی تھی۔

"آپ اچھی طرح سوچ لیں' آپ پر کوئی زبردستی' کوئی دباؤ نہیں' خاص طور پر میری طرف سے تو قطعی نہیں۔ شادی بیاہ بچوں کا کھیل نہیں' یہ عمر بھر کی بات ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دل آمادہ نہ ہوں تو ایسا بندھن باندھنے کی بالکل ضرورت نہیں۔"

اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اسد یوں اسے یہ سب سمجھا رہا ہوگا۔

"میں ذرا چینج کر لوں' آپ بھی تیار ہو جائیں' پھر اسپتال چلتے ہیں۔"

وہ کھانا ختم کر چکا تھا۔ برتن سمیٹتے ہوئے' تایا ابو کے لیے پرہیزی کھانا بناتے ہوئے تیار ہوتے ہوئے وہ عجب کشمکش کا شکار تھی۔

امتیاز انکل اسپتال میں تایا ابو کے پاس ہی تھے۔ اسد ان کی ہی گاڑی لے کر آیا تھا۔ صباح اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔

اسد نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بغور دیکھا۔ اس کی آنکھیں مزید سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پھر خوب روئی ہے۔

"اسد! آپ اچھی طرح جانتے ہیں' میری اور حماد کی اٹیچمنٹ ایک دو دن کی بات نہ تھی۔ اس کی محبت' توجہ اور پیار نے مجھے کبھی کچھ اور سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میں حماد کے ساتھ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی اور حماد کے بعد کسی اور کا تصور۔۔۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔۔۔"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر سسک اٹھی تھی۔ اسد لب بھینچے گاڑی چلاتا رہا تھا۔

"آپ تایا ابو سے کہہ دیجیے کہ میں آپ سے نکاح کے لیے تیار ہوں۔" روتے روتے اس نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا تھا اور اسد بس اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔



مجتبیٰ حسن چند دن اسپتال میں رہے تھے۔ ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو ڈسچارج کر دیے گئے تھے۔ وہ گھر لوٹے تو بہت زیادہ لاغر ہو چکے تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر صباح مزید وحشت زدہ ہو جاتی تھی۔ اسد کے کیا جذبات تھے۔ وہ بے خبر تھی' اس روز کے بعد براہ راست ان دونوں کی کوئی بات چیت نہیں ہو سکی تھی۔

وہ رات کو انہیں دوا کھلانے آئی تھی۔ دوا کھلا کر اس نے تایا جان کے ہاتھ تھام لیے۔ آج ان کی طبیعت گزشتہ دنوں سے قدرے بہتر تھی۔

"تایا ابو مجھے آپ کا فیصلہ قبول ہے' میں اسد سے نکاح کے لیے راضی ہوں۔" ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے کہا تو اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

پہلے تو وہ حیران ہوئے' پھر خوش ہو کر انہوں نے اسے والہانہ انداز میں اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور صباح کو لگا اسے دل کھول کر رونے کا موقع مل گیا ہے۔

"تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔ تم میری ہی بہو رہو گی' چاہے حماد کی صورت یا اسد کی۔ یقین رکھنا بیٹا! اسد تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ کوئی اور نہ جانے کیسا ہوتا۔ میرا باہر دل ہی نہیں مانتا۔ بہت عقل مندی کا فیصلہ کیا تم نے۔ اللہ تم دونوں کو سدا خوش رکھے۔" وہ اسے سینے سے لگائے مسلسل دعائیں دے رہے تھے۔

اس کی خواہش تھی کہ نکاح وغیرہ کی تقریب سادگی سے ہو' خود اسد بھی شور ہنگامے کا قائل نہ تھا۔ مگر تایا ابو تو ہر طرح سے خوشی منانا چاہتے تھے دل کھول کر۔ نہ' نہ کرتے بھی اچھا خاصا انتظام کر لیا گیا تھا۔ وہ نکاح کے دن بہت خوش تھے۔ بغیر کسی سہارے کے وہ مہمانوں میں چل پھر' اٹھ بیٹھ رہے تھے۔ زندگی سے بھرپور قہقہے لگا رہے تھے۔

نکاح کے بعد اسد پہلے مجتبیٰ حسن کے پاس ان کے کمرے میں آیا۔

"تم ادھر؟" اسد کو اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران ہوئے تو اسد جھینپ گیا۔

"آج تو مجھ بوڑھے کو تنہا چھوڑ دو' جاؤ بیٹا! صباح انتظار کر رہی ہوگی۔ تم میری فکر نہ کرو' مجھے بس تم دونوں کی فکر تھی' بڑے عرصے بعد سکون محسوس کیا ہے' اب اگر موت بھی آجائے تو کوئی غم نہیں۔ ایک خلش تھی دل میں کہ میں دونوں بیٹوں میں انصاف نہیں کر پایا' تم بے شک منہ سے نہ کہو مگر باپ ہوں تمہارا' تمہارے دل کی خواہش مجھ پر آشکار نہ ہوتی تو کس پر ہوتی۔ آج میں سرخرو ہو گیا ہوں۔ جاؤ بیٹا! اپنی خوشیاں سمیٹو' میری ساری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

انہوں نے اسد کا چہرہ تھام کر پیشانی چومی' پھر اسے اپنے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا تو وہ باہر نکل آیا تھا۔

اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اسد کے عجب سے احساسات ہو رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھی روتی صباح کی وہ ہاں اور الفاظ۔۔۔ وہ بھولا تو نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ صباح نے صرف مجتبیٰ حسن کی خاطر ہاں کی ہے۔ اور کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا اس کی سرشت میں نہ تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو صباح کہیں بھی نظر نہ

آئی' البتہ باتھ روم کا دروازہ بند تھا' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

صباح باتھ روم سے نکلی تو اس نے دیکھا وہ سادہ سوتی لباس میں ملبوس تھی۔ اس نے نظریں چرائیں۔

اسد نے صباح کو چند پل بغور دیکھا اور ایک گہری سانس خارج کی۔

"صباح! یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔ پہن لینا۔" اسد اس کے قریب آیا۔ پینٹ کی جیب سے ایک ڈبیہ نکال کر اس کی طرف بڑھائی تھی۔ "کیا ہے؟" ہاتھ بڑھا کر لینے کی بجائے اس نے صرف پوچھا تھا۔ اسد کے اندر سارے لطیف احساسات سرد سے ہو گئے تھے۔

"دیکھ لیں۔" اسد نے ڈبیہ اس کے قریب رکھ دی۔ "ابو ضرور پوچھیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں کسی بھی قسم کی تکلیف ہو۔ تمہارا دل نہ بھی چاہے' تب بھی ضرور پہن لینا۔ مجبوراً" ہی سہی' جہاں تک بات ہے تمہارے احساسات کی' میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں تکلیف نہ ہو۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم نے کن حالات میں اور کیونکر اس رشتے کے لیے رضامندی دی ہے۔ کم از کم میری طرف سے تمہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔" اسے کہہ کر وہ الماری سے لباس لے کر باتھ روم میں گھس گیا اور وہ لباس اور زیور وغیرہ لیے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر بعد وہ اسد کے کمرے میں آئی تو وہ لیٹا ہوا تھا۔ ایک لمحہ کو دونوں کی نگاہ ملی وہ نظر جھکا گئی۔ خاموشی سے بستر پر آکر لیٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

تایا ابو کا یوں چلے جانا اگرچہ اچانک نہیں تھا' مگر بہت بڑا صدمہ تھا۔ کتنے دنوں تک تو صباح سنبھل ہی نہ سکی تھی۔ راحیلہ باجی باپ کی وفات کی خبر سن کر فوراً" پاکستان آگئیں۔ چند ہفتے ٹھہریں' مگر کب تک اپنا گھر بار چھوڑ کر وہ یہاں ٹھہری رہتیں۔ وہ صباح کو آنے والی زندگی سے متعلق ہزاروں نصیحتیں کرتے ہوئے روانہ ہو گئیں۔ صباح کے آنسوؤں میں آہستہ آہستہ کمی آنے لگی۔

اسد صباح کا خیال رکھنے کی پوری کوشش کرتا رہا۔ اس کے احساسات و جذبات کا خصوصی خیال رکھتا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اسد پر انحصار کرنے لگی تھی۔ اسد کی موجودگی ڈھارس دیتی تھی' اور جب اسد نے تایا کی وفات کے بعد دوبارہ سے آفس جانا شروع کیا تو صباح تنہائی کے احساس میں گھرتی چلی گئی تھی۔ وہ جتنی دیر تک گھر سے باہر رہتا وہ مختلف اوہام و تفکرات کا شکار ہو کر ہولتی رہتی' جب وہ گھر آتا تو اسے لگتا وہ کسی مضبوط سائبان کے سائے میں آگئی ہے۔

وہ ایک ذمہ دار منصب پر فائز تھا اور اس کے ذمے آفس کی طرف سے ایک خاص پروجیکٹ تھا۔ جس کی کامیابی کی صورت میں اسے کراچی کمپنی کی برانچ کا انچارج بنا کر بھیجے جانے کے بہت امکانات تھے۔ اس میں اسے کافی مراعات ملنے کی توقع تھی۔ اس کا پروجیکٹ پاس ہو گیا اور اسے کراچی شفٹ ہونے کے احکامات مل گئے۔

مجتبیٰ حسن کی وفات کے بعد یہ پہلی خوش خبری تھی' وہ خاصا مسرور سا گھر لوٹا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ صباح سو گئی ہوگی' مگر جب وہ اندر آیا تو صباح کو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے دیکھ کر رک گیا۔

"السلام علیکم!" صباح نے خاموشی سے اسے دیکھ کر سر ہلا دیا۔

پہلے پہل تو صباح اس کی آمد سے قطعی بے پروا رہتی تھی' مگر تایا ابو کی وفات کے بعد وہ ہمیشہ گھر آنے پر اسے اپنی منتظر ملی تھی۔

"کھانا کھائیں گے؟" وہ کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔۔۔ سوری میں صبح بتانا بھول گیا تھا کہ آج میٹنگ تھی۔ اسی لیے لیٹ ہو گیا اور ڈنر بھی وہیں کر لیا تھا۔" صباح کے چہرے پر اک تاریک سا سایہ لہرا گیا تھا۔

"اگر چائے مل جائے تو۔" وہ خاموشی سے سر ہلا کر کچن کی طرف چلی آئی۔

اسد کے لیے چائے بناتے ہوئے وہیں کھڑے کھڑے عجلت میں چند لقمے لینے لگی۔ چائے دم پر تھی' جب اس نے آخری لقمہ لیا تھا۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا تھا؟ مائی گاڈ! رات کے بارہ بج رہے ہیں اور تم ابھی تک بھوکی بیٹھی ہوئی تھیں۔" وہ برتن سنک میں رکھ رہی تھی کہ اسد کی آواز پر چونک کر پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ نہ جانے کب آکھڑا ہوا تھا اور اب شرمندگی سے بول رہا تھا۔

"بس یوں ہی' پہلے بھوک نہیں تھی' ابھی لگی تو کھا لیا۔" وہ جس انداز میں کھڑا تشویش زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا' وہ صرف یہ ہی کہہ سکی تھی۔ اسد کو اتنا لیٹ ہونے پر ملال ہوا تھا۔

"ایم سوری' مجھے تمہیں بتا دینا چاہیے تھا کہ میں لیٹ ہو جاؤں گا' بس! یاد نہیں رہا۔" وہ خاموشی سے مگ میں چائے ڈالنے لگی تو اسد کو اس کا انداز خاصا مضطرب لگا۔

"کمرے میں ہی لے آؤ۔" وہ کہہ کر پلٹ گیا تو وہ مگ لیے کمرے میں چلی آئی۔ اسد کپڑے بدل کر آستین کہنیوں تک لپیٹتے ہوئے بستر پر آبیٹھا۔

"مجھے اندازہ ہے کہ میں کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا ہوں۔ تمہیں زیادہ وقت نہیں دے پا رہا' ایم سوری! آئندہ ایسا نہیں ہوگا' میں کوشش کروں گا کہ وقت پر گھر آجایا کروں۔"

"مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ میں آپ کے فرائض اور جاب کے مسائل سمجھ سکتی ہوں۔ بے فکر رہیں' میں مطمئن ہوں۔" بظاہر صباح کے الفاظ سادہ تھے' مگر اسد کو ان میں خود اذیتی کی کیفیت محسوس ہوئی تھی۔

"ایک خبر ہے' میرے لیے تو یہ ایک اہم نیوز ہے۔ مجھے کراچی کی نئی برانچ کے انچارج کے طور پر وہاں شفٹ کیا جا رہا ہے۔" کچھ توقف کے بعد اسد نے کہا تو وہ چونک کر اسد کو دیکھنے لگی۔ ایک دم تکلیف کے گہرے آثار صباح کے چہرے پر واضح پڑھے جا سکتے تھے' وہ لب بھینچ گئی۔

"میں نے اس پروجیکٹ کے لیے بے پناہ کوشش کی ہے' دن رات کی تمیز کیے بغیر تمام صلاحیتیں استعمال کی ہیں' اگر میں یہ کہوں کہ یہ میری زندگی کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے تو غلط نہ ہوگا۔ میں خود بھی کراچی شفٹ ہونا چاہتا تھا۔"

وہ بتا رہا تھا اور صباح کے اندر صدمے سے نڈھال ہو جانے والی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ یعنی وہ اسے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ گم صم سی خالی مگ لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسد نے دزدیدہ نظروں سے صباح کے چہرے کے تاثرات جانچنا چاہے' مگر وہ اس کے ہاتھ سے بھی خالی مگ لیے باہر نکل گئی تھی۔

اس کے جواب نہ دینے پر وہ کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اس کے اور صباح کے درمیان اجنبیت کی دیوار رشتہ' ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد بھی بدستور قائم تھی۔

وہ کیسے اسے اپنے وجود' اپنے ہونے کا احساس دلاتا' جبکہ اول روز سے صباح کا رویہ اس کے ساتھ ایک اجنبی کا سا تھا۔ اس نے اپنے اور اس کے درمیان اونچی اونچی دیواریں قائم کر رکھی تھیں۔ وہ اس کی ناراضی کی وجہ سمجھ رہا تھا۔ وہ بستر پر آکر لیٹی تو اس نے مخاطب کیے بغیر کہا۔

"ٹھیک ہے میں نے لاپروائی برتی' مگر تمہاری ذمہ داری سے کب انکار کیا ہے میں نے۔" صباح بغیر جواب دیے کروٹ بدلے رو رہی تھی' اس نے بے چین ہو کر پکارا۔

"صباح۔۔۔" اسد نے ایک دم اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

"صبی!" اس کی پکار میں دل کے سارے جذبے بندھ آئے تھے۔ دائیں بائیں ہاتھ رکھ کر وہ اس پر جھکا اور صباح کے آنسو اس کے رخساروں پر ہی ٹھہر گئے تھے۔

"میں نے اگر بحالت مجبوری آپ کو قبول کیا تھا تو آپ نے بھی مجبوراً" یہ زہر کا پیالہ بھرا تھا۔ ہم دونوں کے اپنے اپنے مفادات تھے۔ آپ تایا ابو کو خوش کرنا

چاہتے تھے اور مجھے بہر حال سر چھپانے کے لیے چھت چاہیے تھی۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے اپنی غرض میں آپ کو قبول کیا ہے تو آپ کوئی حتمی فیصلہ کرلیں۔ چھوڑ دیں مجھے۔"

وہ اس وقت جذباتیت کی انتہا پر تھی جو منہ میں آیا کہتی چلی گئی۔

"پلیز صباح! چپ ہو جاؤ، تمہیں اندازہ ہے، تم کیا کہہ رہی ہو؟ یہ رشتہ میں نے صرف ابو کی خواہش پر نہیں باندھا، دل کی پوری رضامندی سے تمہیں اپنایا ہے۔ تم میری اولین خواہش تھیں صباح۔۔۔"

وہ آج اس کے سامنے ہار گیا تھا۔ جو جذبے برسوں دل کے نہاں خانوں میں چھپا کر رکھے تھے، آج اس پر آشکار کر دیے تھے۔ مگر دوسری طرف وہ متوجہ ہی نہیں تھی۔ اس قدر خوب صورت اظہار پر بھی اس کی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔

"صباح۔۔۔" بڑی محبت و لگاوٹ سے اسے پکارتے ہوئے اسد نے دونوں کے درمیان قائم خود ساختہ انا کی دیوار کو گرانے میں پہل کرنا چاہی تھی۔ اس کے وجود کو اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لیا تھا۔

"آپ مجھے چھوڑ کے چلے جائیں گے؟" اس نے بہت کرب سے پوچھا تھا اور جواباً" اسد حیران رہ گیا۔

"ہرگز نہیں، میں بھلا تمہیں کیوں چھوڑ کر جاؤں گا، تم ہر جگہ میرے ساتھ رہو گی۔" اس نے بے یقینی سے دیکھا۔

"وہاں مجھے رہائش مل رہی ہے، تم بس پیکنگ کرو، تم میرے ساتھ چلو گی۔"

اسد نے اسے بھرپور الفاظ اور انداز میں یقین دلانے کی کوشش کی، مگر اس نے کچھ نہ کہا، بس تھوڑی دیر تک دیکھتی رہی، پھر کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔



پشمینہ اور زوار خان کی شادی۔۔۔ ہو گئی تھی۔ بی بی جان مطمئن تھیں۔ پشمینہ اور زوار ان کے پاس تھے۔ دونوں کو بے پناہ خوش دیکھ کر بی بی جان کے دل کے اندر اطمینان سرایت کرتا جا رہا تھا۔ صارم کے دکھ کے بعد ان کی ساری امیدیں تینوں بیٹیوں کی خوشیوں سے ہی وابستہ تھیں۔

سب لوگ کہتے تھے کہ صارم اس دنیا میں نہیں، مگر ان کا دل اس حقیقت کو نہیں مانتا تھا۔ حتیٰ کہ خان ذکاء اللہ خان بھی اس حقیقت کو مان چکے تھے کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے، مگر ان کی ممتا کو ایک یقین تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں ضرور ہے۔ دنیا کے کسی گوشے، کسی کونے میں وہ سانس لے رہا ہے۔ وہ اس کے وجود کی حرکت ابھی بھی اپنے وجود میں محسوس کرتی تھیں۔

بی بی جان ملازمہ سے اپنی الماری کی صفائی کروا رہی تھیں۔ جب ان کی نگاہ سرخ مخملیں البم پر پڑی۔

"میراں! یہ البم نکال دو ذرا۔" میراں نے البم نکال دیا۔ وہ اسے لے کر بستر پر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ ان کے بچوں کی تصاویر پر مشتمل پرانا البم تھا۔ کئی تصویروں کو دیکھتے ہوئے ایک تصویر پر ان کی نظر جم گئی تھی۔

خان صاحب نے صارم کو گود میں اٹھایا ہوا تھا، جبکہ پلوشے ان کی گود میں تھی۔ زرمینے بڑی تھی، وہ ان کے پہلو میں کھڑی تھی۔ البتہ پشمینہ بعد میں پیدا ہوئی تھی، اس لیے وہ تصویر میں نہیں تھی۔

ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو انہوں نے اگلی تصویر پر نگاہ ڈالی۔ موٹی موٹی آنکھوں والا دو سالہ صارم واکر میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے بے اختیار تصویر کو ہونٹوں سے چھو لیا۔

"بی بی جان۔۔۔ زوار، سجاول لالہ کے پاس جا رہے ہیں، مجھے بھی ساتھ لے جا رہے ہیں۔"

پشمینہ ایک دم کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ روانی میں کہتے ہوئے وہ اچانک رک گئی۔

"بی بی جان! آپ رو رہی تھیں؟" اس کی نگاہ ان کے چہرے سے ہوتی سامنے کھلے البم پر پڑی تو پل میں سارا ماجرا سمجھ گئی۔

"کتنی بار کہا ہے آپ کو، بی بی جان! کہ مت رویا کریں اور یہ البم آپ کو کس نے نکال کر دیا ہے، میں نے سب سے اوپر دراز میں چھپا کر رکھا تھا۔"

وہ بی بی جان کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

"تم کیا کہہ رہی تھیں۔" انہوں نے خود کو سنبھالا تھا۔

"زوار کا بتا رہی تھی۔ وہ سجاول لالہ کے ہاں ساتھ چلنے کی ضد کر رہے ہیں، کہہ رہے ہیں چند دن کی بات ہے، آؤٹنگ ہو جائے گی۔"

"ضرور جاؤ، یہ ہی دن تو ہوتے ہیں گھومنے پھرنے کے۔"

"پھر میں زوار سے کہہ دیتی ہوں کہ وہ انتظامات کرلیں؟" انہوں نے خاموشی سے سر ہلا دیا تھا۔

"بی بی جان! یہ البم میں اپنے کمرے میں لے کر جا رہی ہوں۔ اب آپ کو ہاتھ نہیں لگانے دوں گی۔ خواہ مخواہ آپ طبیعت خراب کر لیتی ہیں اپنی۔" اس نے البم اپنے قبضے میں کر لیا۔ بی بی جان نے کچھ کہنا چاہا، مگر پھر خاموش ہو گئیں۔

تصویریں نظروں سے اوجھل ہو سکتی تھیں، مگر جو تصویر دل پہ نقش تھی، اس کو وہ کیونکر دور کر سکتی تھیں۔



کراچی شفٹ ہونے کے بعد اسد نے صباح کا بھرپور خیال رکھنے کی کوشش کی تھی۔ آفس کے بعد سارا وقت وہ گھر پر ہی گزارتا تھا۔ اس کا رویہ اسد کے ساتھ قدرے بہتر ہوا تھا۔ مگر درمیان میں ایک ان دیکھی دیوار اب بھی حائل تھی جسے نہ اس نے عبور کیا تھا اور نہ ہی اسد نے ایسی کوشش کی تھی۔ صباح کی ایک بار کی بے یقینی کے بعد اس نے آہستہ آہستہ صباح کے ساتھ اپنے سلوک کو اس قدر نرم کر لیا تھا کہ صباح خود اس کی محبت، اس کے احساسات و جذبات کو سمجھ جائے۔ شاید اسی طرح اس کے دل تک رسائی ممکن ہو سکتی تھی۔ اس وقت بھی وہ دوپہر کو لوٹا تو وہ گھر پر نہیں تھی، آج اسے کوئی کام تھا، جسے نپٹا کر وہ دوبارہ آفس جانے کی بجائے گھر آگیا تھا۔

"کہاں گئی ہیں بیگم صاحبہ؟" اس نے ملازمہ سے دریافت کیا تھا، صباح کی تنہائی کا احساس کرتے ہوئے اس نے یہاں شفٹ ہونے کے فوراً" بعد ایک کل وقتی ملازمہ کا انتظام کیا تھا کہ صباح کو اکیلے پن کا احساس نہ ہو۔

"وہ جی ساتھ والے بنگلے کی راشدہ باجی آئی تھیں، وہ انہیں اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔"

ملازمہ بتا کر چلی گئی تھی۔ اسد کو خوشی ہوئی کہ یہاں آکر گھر کی چار دیواری میں مقید ہونے کی بجائے صباح نے باہر کی دنیا میں بھی دلچسپی لینا شروع کی تھی۔

وہ وقت گزاری کے لیے ٹی وی دیکھنے لگا تھا جب صباح کے ہمراہ راشدہ (جسے اسد بارہا اپنے گھر دیکھ چکا تھا) اور ایک اجنبی چہرے کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ سیدھا ہوا۔

"السلام علیکم!" صباح اسے خلاف معمول گھر میں دیکھ کر چونکی۔

"وعلیکم السلام!" راشدہ اور دوسری لڑکی دروازے پر ہی رک گئی تھیں۔

اسد احتراماً" کھڑا ہو گیا تھا۔ پشمینہ نے اپنی چادر اپنے چہرے پر درست کی۔ وہ کوئی باقاعدہ شرعی پردہ نہیں کرتی تھی۔ یونیورسٹی میں بھی اس نے پردہ نہیں کیا تھا۔ مگر چادر اس نے ہمیشہ اس انداز میں لی تھی کہ اس کا آدھے سے زیادہ چہرہ چادر کی اوٹ میں آجاتا تھا۔ یہ ہی ان کی بی بی جان کی تعلیم تھی۔

"راشدہ اور پشمینہ آؤ پلیز بیٹھو نا۔" صباح کے کہنے پر پشمینہ اسد کی طرف دوسری نظر ڈالے بغیر صوفے پر راشدہ کے ہمراہ ٹک گئی تھی۔

"پشمینہ! یہ اسد ہیں میرے ہزبینڈ اور اسد! یہ پشمینہ ہے۔ راشدہ کی دیورانی اور راشدہ کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔" صباح نے اسد کو اسی طرح کھڑے دیکھ کر تعارف کروایا۔ اسد سلام کر کے وہاں سے نکل گیا۔

"بڑا پیارا گھر سجایا ہوا ہے۔" پشمینہ کی نگاہوں میں ستائش تھی۔ اسد کے چلے جانے کے بعد وہ آرام سے بیٹھ گئی تھی۔

کراچی میں اسد کو راشدہ کے برابر میں گھر ملا تھا۔ پہلی بار راشدہ ان کے گھر آئی تھی دوسری بار وہ خود آکر صباح کو ساتھ لے گئی تھی۔ راشدہ سے صباح کی کافی دوستی ہوگئی تھی۔ اب اسے پشمینہ بھی بہت پسند آئی تھی۔

پشمینہ ستائشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہ ٹیلی فون اسٹینڈ پر رکھی بڑی سی تصویر پر ٹھہر گئی تھی۔

مجتبیٰ حسن کے ساتھ کھڑے دائیں بائیں بھرپور دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے اسد اور حماد کا بڑا خوب صورت انداز تھا۔ اسد کو یہ تصویر بہت پسند تھی۔ لاہور میں بھی یہ تصویر اس کے کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر سجی ہوئی تھی اور اب یہاں بھی۔

"یہ کون ہیں؟" پشمینہ نے تصویر ہاتھ میں لے لی تھی' نہ جانے تصویر میں ایسی کون سی بات تھی کہ پوچھ بیٹھی۔

"یہ میرے تایا ابو ہیں' ساتھ میں یہ حماد اور یہ اسد ہیں۔ اسد سے تو تم ابھی ملی ہو نا۔ تایا ابو اور حماد اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" وہ اب بھی اس ذکر پر آزردہ سی ہوجاتی تھی۔ دکھ خود بخود آواز میں گھل گیا تھا۔

"اوہ... ایم سوری۔" وہ شرمندہ سی ہوگئی' مگر نظریں تصویر پر جیسے جم سی گئی تھیں۔ تصویر میں اسد اور حماد دونوں تھے' مگر پشمینہ کی نظریں اسد کے مسکراتے چہرے میں الجھ گئی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نے پہلے بھی یہ چہرہ کہیں دیکھا ہے' یہ چہرہ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

"صباح! کیا تمہیں ایسا لگتا ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں ملے ہیں؟" اس نے صباح سے ہی پوچھ لیا تھا۔

"ہوسکتا ہے ہمیں کراچی میں ہی پلی بڑھی ہوں' شادی کے بعد لاہور شفٹ ہوگئی تھی۔ مگر اب اسد کی پھر یہاں شفٹنگ ہوگئی ہے۔"

"لیکن میں پہلی دفعہ کراچی آئی ہوں' تمہیں تو میں نے پہلی بار ہی دیکھا ہے' مگر لگتا ہے تمہارے شوہر کو کہیں دیکھا ہوا ہے' مگر کہاں؟ یاد نہیں آرہا ہے۔"

صباح نے حیران ہو کر دیکھا۔

"ہوسکتا ہے تمہیں وہم ہوا ہو' اسد اور صباح ابھی چند دن پہلے ہی یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔" راشدہ نے ٹوکا تو اس نے مزید کچھ کہنے کی بجائے تصویر دوبارہ اسٹینڈ پر رکھ دی تھی۔ مگر اس کا ذہن الجھ چکا تھا۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد راشدہ اور پشمینہ چلی گئیں تو وہ اسد کے پاس آئی۔

اسد کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"اسد! کھانا لگاؤں؟" راشدہ کے ہاں جانے سے قبل وہ کھانا تیار کرچکی تھی۔ اس نے کہا تو اسد نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسد کا انداز کچھ ایسا تھا کہ صباح کو لگا وہ اس ماحول سے بالکل کٹا ہوا ہے۔

"تم کھانے کا پوچھ رہی تھی؟" اس کی کیفیت پر حیران ہوتے اس نے پھر سوال دہرایا تھا۔ پہلے تو نہیں' مگر اب وہ اسد پر توجہ دینے لگی تھی۔ وہ اس پر غور کرنے لگی تھی۔ جہاں اس کی شخصیت کے بہت سے راز اس پر عیاں ہوئے تھے۔ وہاں اسے یہ احساس بھی شدت سے ہونے لگا تھا کہ اکثر وہ سوچتے سوچتے کہیں کھو جاتا ہے۔ وہ اس کیفیت کا محرک نہیں جانتی تھی' سو الجھ جاتی تھی۔ اپنی کنپٹیاں مسلتے اس نے سر ہلا دیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" ایک تو اس کا جلدی آجانا اور اوپر سے یہ گم صم انداز' وہ متفکر سی پوچھ رہی تھی۔

"ہاں... ٹھیک ہوں۔" وہی الجھا انداز۔

"مگر مجھے لگتا ہے کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سارا دن آفس میں بزی رہتے ہیں اسی لیے تھکن ہوجاتی ہے۔ اتنا کام کا لوڈ کیوں ڈالتے ہیں خود پر' اس طرح تو آپ کی صحت خراب ہوجائے گی۔"

وہ سمجھی تھی کہ شاید کام کی زیادتی ہے۔ اس نے ہلکے سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اسد نے حیران ہوکر صباح کا متفکر انداز دیکھا۔ خاص طور پر یوں پیشانی چھونا' اس کے اندر خوش گوار سا احساس جاگا تھا۔ ایسے لگا' جیسے حبس زدہ ماحول میں دل کو معطر کرنے والا ایک

[illegible]
احساسات لیے ہوتی تھی' مگر اب یہ مہربانی...

"میں ٹھیک ہوں۔" اس نے دل کی خواہش پر اس کے سبک نرم ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

صباح کی گردن میں اپنا دیا گیا لاکٹ دیکھ کر اسد کے اندر عجب سرمستی سی چھائی تھی۔ شادی کے بعد اس نے بظاہر یہ لاکٹ پہن لیا تھا' مگر تایا کی وفات کے بعد اس نے اتار دیا تھا اور اب پھر یہ اس کی گردن میں تھا۔ یعنی وہ بدل رہی تھی۔ یہ خوش گوار احساس تھا۔

اسد نے تو صرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ مگر صباح کو لگا وہ لمحوں کی قید میں جکڑی گئی ہے۔ اسد کی نظروں کا ارتکاز تھا یا اس کے ہاتھ کا لمس' جو اس کی گردن پر لپٹے لاکٹ کو چھیڑ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ سی گئی۔ ہمیشہ کی طرح وہ اس کا ہاتھ جھٹک نہ سکی تھی۔

اسد کی نظروں میں ایسی لپک تھی کہ اس کا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔ اسد کی موجودگی میں اس پر ایسی کیفیت پہلے کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔

"صباح!" اس نے اس کے مقابل کھڑے ہوتے بڑی محبت سے پکارا۔ اس نے چہرہ موڑنا چاہا' مگر اسد نے ایسا نہ کرنے دیا۔

"پلیز صباح! تم نہیں جانتیں' تم میرے لیے کیا ہو؟ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو زندگی کا مقصد یاد آنے لگتا ہے اور تم ایک پل کو نظر نہ آؤ تو لگتا ہے میں اندر سے خالی ہوگیا ہوں۔"

بے حد جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پورے استحقاق سے اسد نے اسے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

اسد کی نظروں کا والہانہ پن اور مسلسل تنگ ہوتی گرفت... ہر چیز چیخ چیخ کر اعتراف کر رہی تھی کہ وہ اس کے لیے کس قدر خاص ہے۔ وہ اس کی زندگی میں کیا مقام رکھتی ہے۔ صباح کو اپنا آپ پگھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ دل تھا کہ سینہ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ مزاحمت کرنا چاہی' مگر سارے حوصلے بھربھری مٹی کی طرح ڈھے گئے۔

[illegible]
بے نام ونشان وجود ہوں۔ مگر حالات کیسے بھی ہوں پلیز مجھے کبھی تنہا نہ چھوڑنا۔ میری ذات کو نہ جھٹلانا۔ مجھے کبھی خود سے دور نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمہاری محبت نہیں' ترجیح بھی نہیں ہوں' پھر بھی میرا ساتھ دینا' میں برسوں تڑپا ہوں۔ صرف تمہارے وجود کا سہارا ہے ورنہ..."

اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ آواز رندھ گئی تھی' جبکہ بازوؤں کی گرفت لحظہ بہ لحظہ تنگ ہو رہی تھی۔ اس کے حصار میں مقید صباح کو اپنا سانس بند ہوتا محسوس ہوا۔

"اسد! پلیز ہوش کریں' کوئی آجائے گا۔" وہ روہانسی ہوگئی تھی۔ سانس تک لینا محال تھا۔ وہ بمشکل کہہ پائی تھی' اسد چونک گیا۔ وہ دونوں ٹی وی لاؤنج میں تھے۔ ایک دم اسے اپنے بازوؤں کے حصار سے الگ کیا۔ وہ اس قدر پرجوش اور بے باک پہلے کبھی بھی نہیں ہوا تھا۔

"ایم سوری صباح! رئیلی سوری۔" وہ رخ موڑ گیا تھا۔ صباح خود حیران تھی۔ ایک نگاہ اس کی چوڑی پشت پر ڈالی۔

"آپ بیٹھیں... میں کھانا لاتی ہوں۔" اپنی لڑکھڑاتی ٹانگوں سمیت لرزتی آواز میں کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ کئی دنوں سے اس کی کیفیت نوٹ کر رہا تھا۔ جب سے وہ لوگ کراچی سے آئے تھے' تب سے اسے لگ رہا تھا کہ پشمینہ کچھ کہنا چاہتی ہے' مگر کہہ نہیں پاتی۔ اب بھی رات کے اس پہر وہ بظاہر کتاب پڑھ رہا تھا۔ مگر بستر پر دراز پشمینہ کو ہی نوٹ کر رہا تھا۔

"پشمینہ! کیا بات ہے' پریشان ہو؟" پشمینہ نے ایک نظر اس پر ڈالی' پھر سر نفی میں ہلا گئی۔

"اگر راشدہ بھابھی نے کوئی بات کہہ دی ہے تو مجھ سے کہو۔"

"کوئی بات نہیں ہے' آپ کو خوامخواہ فیل ہو رہا

ہے۔" اس نے پھر ٹال دیا تھا۔

"مرضی ہے تمہاری... ویسے کہتے ہیں کہ کہنے سننے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔"

کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے مکمل توجہ سے پشمینہ کو بازو کے حصار میں لے لیا تھا۔

"کہا نا' کوئی بات نہیں ہے' آپ کو تو بس موقع چاہیے۔" اپنے بالوں میں چلتا زوار کا ہاتھ روکتے اس نے چڑ کر کہا اور زوار خان ہنس پڑا۔

"تمہاری پیاری سی بیگم صاحبہ خوامخواہ ڈسٹرب نہیں ہو رہیں' کوئی بات ہوئی ضرور ہے' شاباش جو بھی مسئلہ ہے مجھ سے کہو۔" پشمینہ نے لب دانتوں میں دبا لیے' وہ بھلا زوار سے کیا کہتی اور کیونکر' وہ تو خود بھی تو نہیں جانتی تھی کہ اسے کیا چیز الجھا رہی ہے۔

"زوار! میں بہت الجھی ہوئی ہوں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ سے کس طرح شیئر کروں۔ وعدہ کریں' مجھے غلط نہیں سمجھیں گے۔"

زوار نے بڑی سنجیدگی سے اسے دیکھا اور پھر گردن ہلا دی۔

"اس کا نام اسد ہے' اسد مجتبیٰ حسن مکمل نام ہے۔ اس کی بیوی کا نام صباح ہے۔ بہت پیاری لڑکی ہے۔ راشدہ بھابھی کے ساتھ والا گھر ہے ان کا۔ وہ اصل میں لاہور کا رہنے والا ہے' مگر کمپنی کی وجہ سے کراچی شفٹ ہو چکا ہے۔ میں نے پہلی بار اسے اس کے گھر میں دیکھا تھا۔ اور پھر میں جتنے دن وہاں رہی لاشعوری طور پر میں اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ بہت پیارا اور اچھا انسان ہے۔ براہ راست گفتگو نہیں ہوئی' مگر میں ہر روز اس کے گھر خصوصاً" اسے دیکھنے جاتی رہی۔ نہ جانے اس کے اندر کون سی کشش تھی کہ میرے قدم خود بخود اس کے گھر کی طرف اٹھنے لگتے تھے اور یہاں آکر مجھے لگ رہا ہے کہ نہ جانے میں کیا کچھ کھو آئی ہوں۔"

زوار کے چہرے کا رنگ بدل گیا' پشمینہ فوراً" بولی۔

"زوار! مجھے غلط نہ سمجھے گا' بس اس کو دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی چیز ہے' جو مجھے اس کی طرف کھینچتی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں زوار! بہت۔"

وہ بتاتے بتاتے آخر میں ایک دم رو پڑی تھی۔ اس کے سینے پر سر رکھے آنسو بہاتے ہوئے وہ زوار خان کو پتھر کر گئی تھی۔

"پشمینہ۔" زوار کو اپنی آواز بھی اجنبی لگی تھی۔

"زوار! میں صرف آپ سے محبت کرتی ہوں' میں نے ہر پہلو سے سوچا کہ وہ میرے دل کو کیوں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مگر ہر بار خاموشی ملتی ہے۔ مگر اتنا جانتی ہوں یہ کشش بہت مقدس جذبات میں لپٹی ہوئی ہے۔

وہ بہت اچھا ہے' آپ اس سے ملیں گے تو آپ کو بھی اچھا لگے گا۔" زوار کچھ نہ بولا۔ اگر میرے دل میں کوئی غلط بات ہوتی تو کبھی آپ سے شیئر نہ کرتی۔"

وہ یقین دلا رہی تھی۔ زوار نے بمشکل خود پر قابو پایا۔

"ہوتے ہیں بعض انسان ایسے جن کو دیکھ کر دل خود بخود ان کی طرف کھینچنے لگتا ہے۔ ڈونٹ وری یار! پریشان نہیں ہوتے۔" وہ مسکرا کر اسے دلاسا دے رہا تھا۔

"گل بی بی کچھ دنوں کے لیے راشدہ بھابھی کی طرف جا رہی ہیں... میں بھی ساتھ چلی جاؤں؟ بلکہ آپ بھی چلیے' اس سے مل لیجیے گا۔"

"او کے... کوئی مضائقہ نہیں چلیں گے۔"

پشمینہ عام طور پر یوں کسی سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔ وہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس شخص میں ایسی کیا بات ہے' جو پشمینہ جیسی لڑکی گھائل ہو گئی ہے۔ وہ اس سے مل کر ہی کوئی حتمی رائے قائم کر سکتا تھا۔

"اچھا' اب آرام سے سونے کی کوشش کرو۔ صبح میں گل بی بی سے ساتھ چلنے کی بات کر لوں گا۔" اس نے اسے بھرپور تسلی دی اور لائٹ بند کر دی۔



گل بی بی سے بات کی تو انہوں نے فوراً" ساتھ چلنے کی ہامی بھر لی تھی۔ اس طرح وہ پھر کراچی پہنچ گئے تھے۔ راشدہ بھابھی دوبارہ پشمینہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ دوپہر کے کھانے کے بعد جب گل بی بی آرام کرنے لیٹ گئی تھیں وہ زوار کو لے کر صباح کے گھر چلی گئی۔

صباح بھی پشمینہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اسے بھی پشمینہ بہت اچھی لگی تھی۔ زوار کو دیکھنے کے بعد اسے ان کی جوڑی بہت بھائی تھی۔

"معاف کیجیے گا زوار بھائی! اسد کراچی میں نہیں ہیں' وہ صبح ہی لاہور کے لیے نکلے ہیں۔ کل رات تک واپس آجائیں گے۔"

زوار نے جب اسد سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو صباح نے بتایا۔

زوار کے ساتھ ساتھ پشمینہ کے چہرے کی بھی جوت بجھ گئی تھی۔

"میں چائے لے کر آئی ہوں۔" وہ اٹھ کر چلی گئی تو پشمینہ نے اسٹینڈ پر رکھی تصویر تھام کر زوار کو تھمائی۔

"یہ ہیں صباح کے شوہر اسد مجتبیٰ حسن' یہ سسر ہیں اور یہ اسد کے بھائی۔"

زوار نے اسد کی تصویر پر نگاہیں جما دیں۔ وہ کئی ثانیے بغیر پلک جھپکائے دیکھے گیا۔

وہ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر واپس آگئے تھے۔

"پشمینہ! مجھے اس کو دیکھ کر ایسا لگا کہ میں اس سے پہلے کہیں مل چکا ہوں' دیکھ چکا ہوں۔ مگر کہاں' یاد نہیں آرہا۔" اپنی کنپٹیاں مسلتے وہ کہہ رہا تھا اور پشمینہ ایک دم پرجوش ہو گئی۔

"بالکل میرے جیسی کیفیت ہے۔ سچ زوار! مجھے بھی یہی لگا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہوا ہے' ملی ہوئی ہوں۔ اس سے۔"

زوار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "پشمینہ! مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے اس شخص کی شکل ماموں جان سے ملتی جلتی ہے۔ شاید یہی اٹریکشن ہے' جو ہمیں اس کی طرف کھینچتی ہے۔" وہ چونک گئی تھی۔

"اگر اس کے چہرے پر بھی داڑھی ہو اور چہرے پر کچھ بڑھتی عمر کا' عکس ہو تو بالکل ماموں جان کا چہرہ لگے۔"

وہ پرسوچ انداز میں کہہ رہا تھا اور پشمینہ کو لگا اس کے ذہن میں کوئی دھماکہ سا ہوا ہے۔

"صارم لالہ!" وہ سرسراتی آواز میں بولی اور زوار چونک پڑا۔

"زوار! وہ صارم لالہ تو نہیں۔ ہمارے لالہ۔ یہ ہمارے خون کی کشش تو نہیں جو مجھے ان کی طرف کھینچ رہی ہے۔"

"مگر ان کا نام تو اسد ہے۔ مجتبیٰ حسن کے بیٹے حماد حسن کے بھائی' وہ لاہور سے آئے ہیں' پھر وہ ہمارے لالہ کیسے ہو سکتے ہیں۔" زوار نے الجھ کر کہا۔

"زوار! دعا کریں یہ ہمارے صارم لالہ ہی ہوں۔ ہمارے لالہ کی بی جان نے ایک عمر انتظار کیا ہے۔ وہ ساری ساری رات سجدے میں گزار دیتی ہیں اس امید پر کہ ان کا صارم زندہ ہے۔"

وہ شدت سے رو پڑی تھی۔



زوار خان نے بڑے سبھاؤ سے گل بی بی کو ساری بات بتائی۔ وہ فوراً" صباح کے ہاں جانے کے لیے اٹھیں۔

پشمینہ گل بی بی کو ہمراہ لیے صباح کے ہاں چل پڑی۔

صباح بڑے تپاک سے گل بی بی سے ملی۔

اس نے انہیں ٹی وی لاؤنج میں بٹھایا تو پشمینہ کے اشارہ کرنے پر انہوں نے موقع محل کا انتظار کیے بغیر فوراً" تصویر اٹھالی۔

"صارم!" اسد پر نگاہ پڑتے ہی وہ پکاریں۔ صباح نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔

"یہ... یہ... کون ہے؟" انہوں نے تصویر پر انگلی رکھی۔

"میرے شوہر ہیں' اسد۔" اس نے سادگی سے بتایا تو گل بی بی فوراً" بول اٹھیں۔

"نہیں' یہ صارم ہے۔ میرے لالہ کی جوانی۔ میں تو ایک نظر میں پہچان گئی ہوں۔ آج وہ ہمارے پاس ہوتا

توبالکل ایسا ہی ہوتا۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ صارم ہے۔اس کے رخسار کا یہ تل ٹھوڑی کا یہ نشان ۔۔۔ ہمارے صارم کا ہی تو ہے۔بتاؤ اس کے والدین کون ہیں کہاں ہیں۔"

ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور صباح حیران د ششدر سی کھڑی تھی۔

"اس کے والدین کون ہیں۔ کیا نام ہے اس کے باپ کا؟" وہ پوچھ رہی تھیں اور صباح کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا بتائے۔ اپنے باپ کا نام تو اب شاید اسد کو بھی یاد نہ ہو۔ سب اسے مجتبیٰ حسن کے بیٹے کے نام سے ہی جانتے تھے۔

"اسد۔ اسد مجتبیٰ حسن۔" اس کی زبان سے پھسلا "دراصل۔۔۔" اس نے کچھ کہنے کو لب وا کیے۔

"نہیں۔ یہ صارم ہے۔ صارم کے والد کا نام خان ذکاء اللہ خان ہے۔ یہ پشمینہ کا بھائی ہے۔ میرے لالہ علاقے کے سردار ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ ہمارا بچپن کا کھویا ہوا صارم ہے۔ بھابھی جان کو یقین ہے کہ صارم زندہ ہے۔ انہوں نے اس کے انتظار میں سالوں گزارے ہیں۔

میں کیسے مان لوں کہ یہ اسد ہے۔ میں پہلی نگاہ ڈال کر ہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ میرا صارم ہے۔ ادھر علاقے میں لے جا کر کھڑا کروں تو لوگ قسم کھا کر کہہ دیں گے کہ یہ صارم ہے۔ ہو بہو میرے لالہ کی جوانی ہے۔"

وہ رو رہی تھیں اور صباح کا دماغ اس انکشاف پر سائیں سائیں کر رہا تھا۔

"اس کی ٹھوڑی کا یہ نشان تب پڑا تھا' جب ایک دن لالہ' صارم کو اپنے ساتھ گھوڑے کی سواری کروانے لے گئے تھے اور یہ گر پڑا تھا۔ ٹانکے لگے تھے وقت کے ساتھ ساتھ داغ مدھم ہو گیا ہے مگر نشان برقرار ہے۔"

وہ صباح کو بتاتے بتاتے آنکھیں صاف کر رہی تھیں۔

"ہمارا مخالف قبیلے سے شروع سے ہی جھگڑا چل رہا تھا۔ اب تو یہ قصہ ہی ختم ہو گیا ہے' مگر اس وقت دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ہمارے ایک ہی لالہ تھے اور صارم ان کا ایک ہی لخت جگر۔۔۔ انہوں نے سازش سے ہمارا صارم ہم سے چھین لیا۔ وہ ہمارے خاندانی ملازم کے ساتھ حویلی سے نکلا تھا۔ بھابھی جان نے اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے بھیجا تھا۔ پہاڑوں پہ دشمن نے حملہ کر دیا۔ ملازم کو مار ڈالا اور ہمارا صارم۔۔۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ پہاڑ سے نیچے جا گرا ہے۔

ہم نے بہت کوشش کی مگر ہمارا صارم نہ ملا' لوگ کہتے ہیں کہ وہ اس دنیا میں نہیں مگر ہمیں یقین نہیں آتا تھا۔۔۔"

وہ صوفے پر بیٹھی سب بتا رہی تھیں۔ پشمینہ کی آنکھیں بھی سرخ ہو چکی تھیں' صباح بے دم بیٹھی تھی۔

"آنٹی! اسد آپ کا صارم ہی ہے۔" اس کی زبان سے کیا نکلا' پشمینہ اور گل بی بی شدت سے رو دیں۔

"تم سچ کہہ رہی ہو نا؟ یہ صارم ہے نا میرے لالہ کا بیٹا۔ اس کی آنکھوں کا نور۔ میری بھابھی کے دل کی ٹھنڈک' ہمارا صارم۔ یا اللہ تیرا کرم' تیرا شکر۔۔۔" وہ اب اونچی آواز میں روتے ہوئے اسد کی تصویر چومے جا رہی تھیں۔

"تم ہماری بہو ہو' ہمارے صارم کی بیوی۔"

انہوں نے والہانہ پن سے صباح کو خود سے لپٹا لیا۔

پشمینہ نے آہستہ آہستہ صباح کو اسد کو پہلی نگاہ دیکھنے کے بعد سے اب تک تمام صورت حال بتائی۔

وہ چپ ہوئی تو صباح نے شروع سے لے کر آخر تک ساری حکایت بیان کر ڈالی۔

"اللہ غارت کرے ان لوگوں کو جنہوں نے میرے لالہ کی نسل ختم کرنا چاہی تھی' مگر جسے اللہ رکھے' اسے کون چکھے' اللہ نے کیسے میرے صارم کو بچانے کا وسیلہ بنایا۔ بڑے نیک صفت تھے تمہارے تایا۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو ضرور عقیدت سے شکریہ ادا کرتی' انہوں نے ہماری امانت سنبھال کر رکھی۔ اپنا نام دیا' پڑھایا لکھایا' شادی کی۔ ورنہ کسی بے نام و نشان کا سہارا کون بنتا ہے۔"

وہ پھر آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

"بہت پیاری ہو تم۔ بھابھی جان کو بڑا ارمان تھا کہ ان کا صارم زندہ ہوتا تو وہ اسے دولہا بناتیں' شادی کرتیں' اس کے بچوں کو گود میں کھلاتیں۔ اب تم دیکھنا' کیسے ہم تمہیں ارمانوں سے اپنے گھر لے کر جاتے ہیں۔ اپنے سارے ارمان پورے کرتی ہیں۔"

اس کی پیشانی چومتے ہوئے بہت محبت سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"پشمینہ! اپنا موبائل نکال کر زوار کو اطلاع تو دو۔ بڑا بے چین ہو گا' پھر حویلی فون کرتی ہوں۔ لالہ اور بھابھی جان کو خوشخبری سناتی ہوں۔"

"مگر آنٹی وہ اسد!" وہ نہیں جانتی تھی کہ اسد کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔ اس نے فی الحال انہیں روکنا چاہا تھا۔

"مجھے مت روکو بہو! اس خوش خبری کے لیے ہم نے مایوسی اور امید و ناامیدی کے درمیان ایک طویل سفر طے کیا ہے۔ اب اس کے والدین کو بتانے دو۔ جب تک وہ اپنے کام سے لوٹے گا تب تک لالہ بھابھی اور باقی لوگ بھی ادھر آجائیں گے۔"

انہوں نے اس قدر ملتجی انداز میں کہا کہ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔



وہ یہاں پہنچا تو گھر میں دو بڑی بڑی گاڑیاں کھڑی دیکھ کر چونکا' ملازمہ سے صباح کا پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کچن میں ہے تو وہ سامان رکھ کر کچن میں ہی چلا گیا۔

وہ دروازے کی طرف پشت کیے روٹی پکانے میں مصروف تھی۔ دوپٹہ قریب ہی اسٹینڈ پر تھا۔ شاید نہائی تھی اس لیے لمبے بالوں کا آبشار پشت پر بہہ رہا تھا۔ محض ایک کیچر کی مدد سے ہلکا سا سمیٹا ہوا تھا۔

"صباح۔" وہ اس کے بالکل عقب میں آکھڑا ہوا' وہ چونک کر پلٹی تو اس کے ساتھ ٹکرا گئی۔ اسد کو اس کی اس قدر گھبراہٹ پر ہنسی آگئی۔

"اتنی گھبراہٹ؟ اتنی بری آواز تو نہیں میری کہ ڈر جاؤ۔"

اس کے ہاتھ سے بیلن لے کر سلیب پر رکھا اور دونوں کندھے تھامے کل سے وہ نظروں سے اوجھل تھی تو لگتا تھا کہ کچھ کھو گیا ہے اور اب سامنے آئی تھی تو لگتا ہے خود پر سارے اختیار ختم ہو گئے ہیں۔

صباح کے چہرے پر خوش گوار سی مسکان تھی جو یقیناً" اسد کی آمد کی وجہ سے ہونٹوں پہ چمکی تھی۔ اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ اگر وہ اس پر استحقاق جتاتے ہوئے دونوں کے درمیان حائل دیوار کو گرانے کی کوشش کرے گا تو صباح ناراض نہیں ہو گی۔

"آپ نے تو رات میں آنا تھا نا؟ پھر اس وقت کیسے؟" اس کی گہری بولتی آنکھوں کا سحر ایسا ہی تھا کہ وہ اس کے حصار میں آتے ہی سب کچھ بھول گئی تھی۔

"تمہارے بغیر دل ہی نہیں لگا۔ جلدی جلدی کام نبٹا کر بھاگا چلا آیا۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ "تم نے مجھے یاد کیا تھا؟ میری غیر موجودگی محسوس کی تھی؟"

وہ نجانے کیا سننا چاہتا تھا' وہ دھیمے سے مسکرا دی' پھر شرارت سے بولی۔

"نہیں۔"

صباح کے ہونٹوں پر ٹھہری مسکراہٹ نے اسے بے خود سا کر دیا تھا۔

"سنو۔۔۔ میں دعوا نہیں کرتا مگر میرا یقین کر لو۔ بے شک وفا کا حلف سمجھ لو' میں تمہیں بہت چاہوں گا۔ بہت زیادہ۔۔۔ حماد کی جگہ نہیں لے سکتا مگر کوشش کروں گا کہ میری رفاقت میں تم خوش رہو۔"

وہ اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لیے جذب سے کہہ رہا تھا' صباح کا دل اس کے ہر ہر لفظ پر ایمان لاتا جا رہا تھا۔

"پلیز چھوڑیں۔ کوئی آجائے گا۔ ملازمہ باہر ہی ہے۔"

"صباح۔۔۔ صباح بیٹے کہاں ہو۔۔۔ صباح۔" یہ آواز

بی بی جان کی تھی۔ اسد چونکا۔

"یہ کون ہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"بہو۔" آواز دروازے سے آئی تو اسد نے حیرانی سے پلٹ کر دیکھا۔

دروازے میں جو خاتون کھڑی تھیں' ان میں بلا کی تمکنت اور وقار موجود تھا۔ اسد پر نگاہ پڑتے ہی وہ دروازے پر منجمد ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے' اسد ان کے اس طرح دیکھنے سے پریشان ہونے لگا۔

"صارم۔۔۔! تم صارم ہو ناں؟" انہوں نے اسد کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا تھا۔

"صباح۔۔۔!" اس نے حیرانی سے صباح کو پکارا۔

"اسد! یہ آپ کی بی بی جان ہیں۔ آپ کی ماں۔۔۔"

صباح رندھی ہوئی آواز میں اسے ساری صورت حال بتانے لگی۔ اسد کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔ تینوں نفوس اپنی اپنی جگہ گم صم' خاموش اور عجیب سے احساس میں گھرے کھڑے تھے۔ صباح نے بات ختم کر کے اسد کا کندھا ہلایا اور وہ جو اتنی دیر سے ضبط کیے کھڑا تھا' ایک دم ان سے لپٹ گیا' ماں بیٹے کے ملن کا یہ منظر صباح کی روح میں اتر گیا تھا۔

وہ اسے دیوانہ وار چوم رہی تھیں۔

"آپ اندر چلیں۔" اسد سہارا دے کر انہیں لاؤنج میں لیے چلا آیا۔

کچھ دیر بعد صباح لاؤنج میں اور بھی بہت سے چہروں کو بلا لائی۔ وہ سب بظاہر اس کے لیے اجنبی تھے۔ مگر اس کے اپنے تھے۔ بہت گہرا تعلق تھا اس کا ان سب سے۔ اس کی بہنیں' بہنوئی۔۔۔ کزنز' خالائیں' پھوپھیاں' دیگر رشتہ دار' وہ سب سے ملا' سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔

"یہ میرا بیٹا ہے' میرا خون' میری آن' میری شان' میرا بیٹا۔"

خان ذکاء اللہ کتنی دیر تک اسے خود سے لپٹائے کھڑے رہے تھے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔

اس کی تینوں بہنیں اس کے گرد تھیں' بازوؤں کے حصار میں لیے سب کو پیار کرتے اس نے تینوں کے آنسو صاف کیے تھے۔

"اب تم دونوں ہمارے ساتھ وادی چلو گے۔" خان ذکاء اللہ نے دونوں کو ساتھ لگا کر خواہش ظاہر کی تھی۔

"بہت دھوم دھام سے اپنی بہو اور بیٹے کو لے کر جاؤں گا' سارا علاقہ دیکھے گا کہ خان ذکاء اللہ کا بیٹا زندہ ہے۔" وہ بہت پُرجوش ہو رہے تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد وہ کمرے میں آئی تو اسد پہلے سے وہاں موجود تھا۔

"تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ گھر میں اتنے سارے لوگ موجود ہیں۔"

"آپ نے موقع ہی کب دیا تھا۔ آتے ہی تو شروع ہو گئے تھے۔" اس نے اس کا سرخ چہرہ دیکھا' جو اندرونی و روحانی خوشیوں کا عکاس تھا۔

"صباح! اس دن کے لیے میں نے ساری زندگی انتظار کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں گزشتہ زندگی کے وہ چار سال بھول چکا تھا کہ میں کون ہوں' کیا ہوں؟ جو نام' جو مقام ابو جان نے دیا' وہی معتبر جانا' اور ان کی زندگی میں کبھی اپنوں کو تلاش کرنے کی کوشش نہ کی کہ کہیں وہ ہرٹ نہ ہو جائیں۔ یہاں آ کر بھی میں الجھتا رہا کہ کہاں سے شروع کروں۔ اس سے پہلے کہ میں باقاعدہ کوئی قدم اٹھاتا' یہ سب ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا صباح! کہ میں نے اپنوں کو پا لیا ہے۔ مجھے اپنی ذات کا اک نشان مل گیا ہے۔"

وہ جذب سے کہہ رہا تھا اور صباح اس کی خوشیوں کے دائمی ہونے کی دعا کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ سب جس قدر عجلت میں ہوا تھا' اسی قدر دلچسپ تھا۔ بہت رومانوی اور خواب ناک۔۔۔ صباح کو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی سلطنت کی مہارانی ہو۔ ایک ہفتہ پہلے وہ سب اس حویلی میں آئے تھے۔ بابا جان' بی بی جان اور تینوں بہنیں' سب نے گویا انہیں ہاتھ کا چھالا

بنا رکھا تھا۔ تینوں بہنیں اس کے آگے پیچھے یوں ہلکان ہو رہی تھیں جیسے وہ بڑی قیمتی شے ہے۔

صارم خان ذکاء اللہ کا اکلوتا بیٹا جو برسوں نگاہوں سے اوجھل رہا تھا' یہاں لانے کے بعد انہوں نے اس کے ولیمہ کا اہتمام کر لیا تھا۔

نکاح کے وقت تو وہ خاص اہتمام سے تیار نہ ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی سنگھار کیا تھا۔ مگر اب ان لوگوں کے خاندانی رسم و رواج کے مطابق دونوں کو ایک دفعہ پھر پورے اہتمام سے تیار کیا گیا تھا۔ نہ جانے کیا کیا رسمیں ہوئی تھیں' صباح کو تو بعض سمجھ میں بھی نہ آئی تھیں' مگر وہ خوش بہت تھی۔

تمام رسموں سے فارغ ہو کر انہوں نے صباح کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا' اس کی کمر کے گرد تکیہ درست کر کے اسد کو بھیجنے کا کہہ کر وہ تینوں بہنیں باہر نکل گئیں۔

اسد آہستگی سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ صباح اس وقت مکمل دلہنوں والے انداز میں تھی۔ اسے اپنے لیے یوں اہتمام سے سجے دیکھ کر دل و نظر ایک احساس تفاخر سے دوچار ہوا تھا۔

ملیں ہم کبھی تو ایسے کہ حجاب بھول جائے
میں سوال بھول جاؤں' وہ جواب بھول جائے

وہ کسی خیال میں ہو اور اسی خیال میں ہی
کبھی میرے راستے میں وہ گلاب بھول جائے

تیری سوچ پر ہو حاوی میری یاد اس طرح سے
کہ تو اپنی زندگی کا یہ نصاب بھول جائے

"صباح!" اس کے ماتھے کی بندیا درست کرتے ہوئے اس نے بہت جاذبیت سے پکارا تھا۔

اس کی کلائی کے زیورات کو چھیڑتے وہ بچپن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات یاد کرنے لگا۔ ہر لمحہ یادگار تھا' مگر اب لگتا تھا کہ اس نے بے نام و نشانی کا جو بھی دور گزارا تھا' اس کا انعام حویلی محبت کرنے والے ماں باپ' جان چھڑکنے والی بہنوں اور صباح کی دلنشین رفاقت کی صورت مل گیا تھا۔

"اتنا انتظار کیا ہے اس وقت کا' اب تو رحم کر لو تھوڑا۔"

وہ اس کے کان میں شرارت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اسد کی بوجھل آواز صباح کو اپنے حواس بے خود ہوتے محسوس ہوئے۔ وہ مکمل طور پر موڈ میں تھا۔ بے باک نگاہوں کے تقاضے نظر انداز کیے جانے والے تو نہ تھے' اس کی قربت میں اسے اپنا آپ فراموش ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ محبت بھری جسارتوں پر وہ گھبرا جاتی تھی۔

"تم نہیں جانتیں' صباح! تم میرے لیے کیا ہو۔ مجھے اپنی محبت کا اظہار کرنے سے مت روکا کرو' اتنے جتن سے تو میں نے تمہیں پایا ہے۔"

اس کے ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں کا لمس بخشتے وہ اسے اپنے دل کی تمام وارداتوں کی کہانیاں سنا رہا تھا اور وہ خود کو اس کے سپرد کیے' اس کی الفت و محبت کی روداد سنتے اک احساس تفاخر سے دوچار ہوئی جا رہی تھی اور دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیے جا رہی تھی۔

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں' سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بد مزاجی اور بد زبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی' خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ' جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے' جبکہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد' اجلال رازی سے ہوچکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یاسمین' اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بد ظن ہوجاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑ دیتی ہے۔ اجلال تعلیم مکمل کرکے واپس آتا ہے تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلتا ہے۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے' مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے' تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خود سر ہوتی جارہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ مگر سارہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے۔ کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔



تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کرلیتا ہے۔
شمشیر، تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے اسپتال داخل کروادیتا ہے۔
اریبہ، یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے، مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کردیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔
اجلال رازی، اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔
یاسمین اور شہباز درانی کی نازیبا گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچالیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی، توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے ریک سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے، فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔
وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ اریبہ، ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔
رازی، اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔
تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔
توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہوجاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جاکر تاجور کا معلوم کرتا ہے۔ مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ مگر ابا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہوجاتی ہے۔ تاباں کو دیکھ کر شمشیر پچھتاتا ہے اور ان کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے۔ مگر تاباں منع کردیتی ہے۔
یاسمین، اریبہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں پڑجاتی ہے۔ مگر اریبہ دوٹوک انداز میں منع کردیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعو کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔
بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال، اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہوجاتا ہے۔ اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں سمیر سے بات کرتی ہے۔ مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اریبہ نظر آجاتی ہے۔ وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کرلیتا ہے۔
اریبہ کے اغوا ہوجانے پر سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ اجلاس ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اریبہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر اریبہ سے تمیز سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اریبہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔
شمشیر علی کو اریبہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ اریبہ سے گریز کرنے لگا۔ شمشیر علی، اریبہ کو اپنا سیل فون دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے رابطہ کرلے۔
اریبہ نئے نمبر سے شمشیر علی سے رابطہ کرتی ہے اور تاجور کو اس سے ملوا دیتی ہے مگر فی الحال شمشیر اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاتا کیونکہ اس کے پاس نہ گھر ہے نہ نوکری۔ راستے میں اسے توصیف احمد ملتے ہیں۔ اریبہ کے حوالے سے وہ دوبارہ شمشیر علی کے ممنون ہوچکے ہیں۔ وہ شمشیر کو نئی برانچ کے لیے اچھی پوسٹ پر آفر دیتے ہیں۔ شمشیر ان کی پیش کش قبول کرلیتا ہے۔ آفس کی طرف سے اسے گھر مل جاتا ہے تو وہ تاجور کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

"تم ہوش میں تو ہو رازی! پتا بھی ہے کیا کہہ رہے ہو جس گھر کی ایک بیٹی نے..."
"امی پلیز....." اس میں شاید یہ سب سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ایک دم ٹوک کر بہت تیزی سے وہ کمرے سے نکل گیا۔ لیکن ہمیشہ صبر و ضبط کا مظاہرہ کرنے والی ساجدہ بیگم بالکل ہی آپے سے باہر ہوچکی تھیں۔
"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔ میں مر کر بھی دوبارہ اس دروازے پر نہیں جاؤں گی۔ تم کسی بھول میں مت رہنا۔" ساجدہ بیگم رازی کو سنانے کی غرض سے چلا چلا کر بول رہی تھیں۔ جب ہی ثنا بھاگی آئی۔
"کیا ہوا امی! کیا ہوگیا ہے؟ اتنا چلا کیوں رہی ہیں؟"
"پوچھو اس سے جاکر جو میری عمر بھر کی سنبھالی عزت خاک میں ملانے پر تلا ہے۔ ارے پہلے کیا کم ذلت اٹھائی ہے، جواب مزید....." ساجدہ بیگم کی آواز پھٹ گئی تھی۔ غصے میں وہ یہ بھی بھول گئیں کہ کس سے بات کررہی ہیں۔ ثنا جسے گھریلو معاملات میں بولنے کی وہ اجازت نہیں دیتی تھیں ہمیشہ اس کی آواز دبادیتیں۔ اب اسی سے کہہ رہی تھیں۔
"مجھے پتا تھا یاسمین ضرور کوئی چکر چلائے گی۔ اور دیکھو! کیسا چکر چلایا ہے۔ اریبہ نہیں تو سارہ..... وہ عورت ہر صورت مجھے اپنے در پر جھکانا چاہتی ہے۔"
"بات کیا ہے امی! مجھے اصل بات تو بتائیں۔" ثنا ساجدہ بیگم کے غصے سے متوحش تھی۔
"افسوس تو اپنی اولاد پر ہے۔" ساجدہ بیگم اپنا بولے گئیں۔ "سب جانتے ہوئے بھی اس کے چکر میں آگیا۔ یہ بھی نہیں سوچا لوگ کیا کہیں گے۔"
"اوفوہ امی! ہوا کیا ہے۔" ثنا اب جھنجلا گئی تھی۔
"تمہارا بھائی کہہ گیا ہے، سارہ سے شادی کرے گا۔" ساجدہ بیگم نے دانت پیس کر بتایا تو ثنا بھی اچھل پڑی۔
"کیا سارہ..... نہیں امی! رازی بھائی ایسا نہیں کہہ سکتے۔ ضرور آپ کے سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔"
"بہری نہیں ہوں میں۔ جاکر کہہ دو اس سے، میرے جیتے جی یہ ممکن نہیں ہے۔"
"اچھا آپ غصہ نہ کریں، آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہوجائے گا۔ میں آپ کو ٹیبلٹ دیتی ہوں۔"
ثنا کے اپنے اندر تنفر آمیز کھلبلی مچ گئی تھی لیکن اس نے پہلے ساجدہ بیگم کو سنبھالا۔ انہیں سکون کی دوائی دے کر کتنی ہی دیر ان کا سر دباتی رہی اور جب وہ سوگئیں تو لائٹ بند کرکے کمرے سے نکل آئی اور کیونکہ ابھی رات کا کھانا نہیں کھایا گیا تھا سو اسی بہانے وہ کھانے کی ٹرے لے کر رازی کے کمرے میں آگئی۔
"مجھے بھوک نہیں ہے۔" رازی اس کے ہاتھوں میں ٹرے دیکھتے ہی بولا تھا۔
"تھوڑا سا کھالیں بھائی! امی بھی بغیر کھائے پیے سوگئی ہیں۔" ثنا نے قصداً "ساجدہ بیگم کا بھوکا سونا جتایا تھا۔
"میں بھی سو رہا ہوں۔ تم جاؤ۔" رازی کے نروٹھے پن سے وہ مزید اصرار کی ہمت نہیں کرسکی۔ مایوس ہو کر پلٹ تو آئی لیکن اسے چین نہیں آیا۔ اسی وقت امینہ کے گھر فون کرڈالا اور جب سمیر کی آواز سنی تو اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔
"چہ..... چہ تمہارے لیے بری خبر ہے۔"
"تم سے کسی اچھی خبر کی توقع کی بھی نہیں جاسکتی۔ خیر بری خبر سناؤ۔" سمیر نے اس کی خصلت جتا کر کہا۔
"سن سکوگے؟" ثنا اب مزا لے رہی تھی۔
سمیر خاموش رہا تو خود ہی کہنے لگی۔
"اچھا دل تھام کر سنو! تم جس کے پیچھے بھاگتے ہو اس نے رازی بھائی کو پھانس لیا ہے۔"
سمیر ابھی بھی کچھ نہیں بولا۔ غالباً "اس کی بات سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔

"ہیلو... اٹیک وٹیک تو نہیں ہو گیا تمہیں۔ خود کو سنبھالو کزن! یا سمین آنٹی کی بیٹیاں ایسی ہی ہیں۔ پہلے اریبہ اب سارہ... اُدھر تمہیں چکر دے رہی تھی اُدھر رازی بھائی پر ڈورے ڈال رہی تھی۔" ثنا دل جلانے والے انداز میں بول رہی تھی کہ سمیر چیخ پڑا۔

"بکواس بند کرو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔ کم از کم اپنے بھائی کا ہی خیال کر لو۔"

"برا لگا ناں! یہی سچ ہے سمیر! اور اس سچ نے امی پر کیا قیامت توڑی ہے تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ پہلی بار... زندگی میں پہلی بار میں نے امی کو چلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ رازی بھائی پر چلا رہی تھیں' جو کہہ گئے ہیں سارہ سے شادی کریں گے۔ سن رہے ہو ناں! رازی بھائی نے یوں ہی تو نہیں کہہ دیا ہو گا۔ جا کر پوچھو اپنی سارہ سے کیا جادو کیا ہے اس نے میرے بھائی پر اور تم مجھ سے کہہ رہے ہو شرم نہیں آتی... ارے شرم دلانی ہے تو پہلے اپنی سارہ کو لاؤ... گھومے تمہارے ساتھ اڑاتی رہی اور شادی رازی بھائی سے کرے گی۔ ہونہہ!"

ثنا نے دل کے پھپھولے پھوڑ کر فون پٹخ دیا تھا۔



اریبہ مسلسل شمشیر علی کے میسجز نظر انداز کر رہی تھی' جو اسے ملنے پر اصرار کر رہا تھا۔ کتنے دنوں سے اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" اریبہ تنگ آ گئی تھی اور اب تو اس کا میسج پڑھتی بھی نہیں تھی۔ نام دیکھتے ہی ڈیلیٹ کر دیتی۔ ایک بار بھی اس نے یہ نہیں سوچا کہ آخر وہ کیوں ملنا چاہتا ہے۔ شاید اس لیے کہ شمشیر علی کو جب کوئی بات کہنی ہوتی تھی' وہ خود ہی اسے اسپتال میں ڈھونڈتے ہوئے آ جاتا تھا۔

اریبہ کے لاشعور میں یہی بات تھی کہ کوئی ضروری بات ہو گی تو اسی طرح آ جائے گا لیکن اس بار جانے کیا بات تھی کہ وہ آنے کے بجائے اسے بُلا رہا تھا۔ اریبہ کی طرف سے جواب نہ ملنے پر بھی اس کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر اس نے شاید کوئی دھمکی دی تھی' جس سے اریبہ مرعوب تو نہیں ہوئی البتہ طیش میں ضرور آ گئی تھی اور اس کا مزاج ٹھکانے لگانے کا سوچ کر ہی جہاں اس نے بلایا' وہیں پہنچ گئی۔

"تم کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہو شام! کیا چاہتے ہو؟" اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا تو جواباً" وہ انتہائی عاجزی سے بولا تھا۔

"تمہاری مدد۔ پلیز میری مدد کرو میں بہت مشکل میں ہوں۔"

"کک... کیا ہوا ہے۔ اب کیا مشکل آن پڑی ہے۔" اریبہ یک لخت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

"میں... میں خود کو معاف نہیں کر پا رہا۔ مجھے یہ احساس کچوکتا ہے کہ انتقامی آگ میں اندھا ہو کر میں نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ کر دی۔" وہ ہنوز عاجز تھا لیکن اریبہ پھر سلگ گئی تھی۔

"تو اس سلسلے میں میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔" تیکھا چبھتا لہجہ تھا۔

"تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہو۔ یہ مذاق نہیں ہے اریبہ! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے کسی پل چین نہیں ہے اور تب تک چین نہیں ملے گا جب تک مجھے یہ یقین نہ مل جائے کہ وہ شخص جو تمہاری زندگی کا ساتھی بننے جا رہا ہے' اس کی نظروں اور دل میں تمہارا آج بھی وہی مقام ہے' جو ہمیشہ سے تھا۔"

شمشیر علی جانے ایسا ہی محسوس کر رہا تھا یا اس کے منہ سے کچھ سُننا چاہتا تھا۔ اریبہ چند لمحے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر چہرہ موڑ کر گلاس وال سے باہر دیکھنے لگی۔ جانے کون سی جگہ' کون سا مقام تھا کہ نہ زمین نظر آ رہی تھی نہ آسمان۔ اسے لگا جیسے وہ بیچ درمیان میں کہیں معلق ہو گئی ہو۔ شمشیر علی اس کے چہرے پر نظریں جمائے اپنی بات کا جواب تلاش کرتے ہوئے الجھ گیا۔

"دیکھو شام!" کتنی دیر بعد وہ اسے دیکھ کر کہنے لگی۔ "جب میرے دل کی عدالت نے تمہیں بری کر دیا تھا تو تمہیں اسی وقت مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کے بعد میرے ساتھ جو بھی ہو' یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تم آخر کیوں زبردستی خود کو انوالو کر کے مجھے پریشان کر رہے ہو جبکہ میں یہ بھی کہہ چکی ہوں کہ اگر میرے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا بھی تو میں خود نمٹ سکتی ہوں۔ تم خدا کے لیے میرے بارے میں مت سوچو۔"

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میرا دل' میرا ذہن تمہاری طرف سے ہٹتا ہی نہیں ہے۔ میں کوئی بھی کام کر رہا ہوتا ہوں تم میرے ساتھ ہوتی ہو۔ کبھی بے اختیار میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکتی ہو۔ کبھی تنبیہی نظروں سے گھورتی ہو۔ کبھی مسکرا کر سراہتی ہو اور کبھی جب میں کسی کام میں خود کو زبردستی مصروف رکھتا ہوں تو چوری چوری دیکھتی ہو... بتاؤ! میں کہاں کہاں تم سے نظریں چراؤں؟" وہ جذبات میں بہہ رہا تھا۔

اریبہ کو خود احساس نہیں تھا کہ وہ اس پر سے نظریں ہٹانا بھول گئی ہے۔

"اور تمہیں صرف اپنی کہی باتیں یاد رہتی ہیں۔ میری کسی بات کی تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ میں نے کہا تھا' جہاں تمہاری منزل ہو گی وہاں سے میرا سفر شروع ہو گا اور میں اپنی بات سے پھرتا نہیں' کبھی نہیں۔ میرا یقین کرو! میں تمہیں پریشان نہیں کر رہا بلکہ میں تمہیں ہر پریشانی سے نکالنا چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے میں تمہارا کچھ نہیں لگتا لیکن کبھی ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ ہم کسی اجنبی کے سامنے بھی اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔" وہ سانس لینے کو رکا تھا کہ اریبہ نے دھیرے سے پوچھ لیا۔

"کیا سُننا چاہتے ہو تم!" شمشیر علی ابھی الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ کہنے لگی۔

"میں تمہارے سامنے روؤں۔ مظلومیت کی تصویر بن جاؤں... یہی چاہتے ہو ناں تو سنو! یہ ممکن نہیں ہے شمشیر علی...! روئی تو میں اس شخص کے سامنے بھی نہیں' جسے میری زندگی کا ساتھی بننا تھا۔"

"تھا؟" شمشیر علی کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

"شاید وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ میں اس کے سامنے رو رو کر اپنی پارسائی کی قسمیں کھاؤں' پھر التجا کروں کہ مجھے اپنا لے۔ کوئی فرق نہیں اس میں اور تم میں۔ تم سب ایک جیسے ہو۔ تمہیں میری بربادی کا احساس نہیں بلکہ تم مجھے روتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہو' اس کے بعد مجھے تسلی دے کر تم مطمئن ہو جاؤ گے۔ بس یہ ہے تمہارا مسئلہ۔"

اس کی تاسف بھری نظریں جن میں ملامت بھی تھی شمشیر علی کے دل میں ترازو ہو گئیں۔ وہ اپنی صفائی دے کر مزید خود کو گرانا نہیں چاہتا تھا۔ جب ہی کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے اس موضوع کو چھیڑنا ہی نہیں چاہیے۔ تم اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہو جبکہ میں غلطی پر غلطی کیے جا رہا ہوں۔ یہ جو دل ہے ناں۔" وہ اپنے دل کے مقام پر شہادت کی انگلی مار کر بولا۔ "یہ بڑی نامراد شے ہے۔ رسوا کر کے ذلیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ بہرحال میں تمہاری کسی بات کو جھٹلاؤں گا نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔"

اریبہ اب کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اس لیے پرس میں سے سیل فون نکال کر چیک کرنے لگی۔

"ہاں وہ ایک بات کہنی تھی تم سے۔" شمشیر علی نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے اچانک کچھ یاد آیا ہو۔ اریبہ سیل فون سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں پتا ہے تاجور کتنی سادہ ہے۔ شاید تم نے یا تمہاری بہن نے اس سے کہا ہو گا کہ تم اس کے پاس آتی رہو گی تو اسے بہت انتظار رہتا ہے تم دونوں کا۔ حالانکہ میں اسے سمجھاتا ہوں کہ کسی کے پاس فالتو وقت نہیں ہے لیکن وہ مانتی نہیں۔ الٹا کہتی ہے آپ کو نہیں پتا اریبہ باجی اور سارہ باجی مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہے تاجور۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں چلتی ہوں اور ہاں! تم تاجور کو ہم سے بدگمان کرنے کی

فضول کوشش ترک کرو۔"

"اچھی بات۔" وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن اریبہ تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔



سمیر کو جب سے ثنا نے فون پر یہ بتایا تھا کہ رازی نے سارہ سے شادی کرنے کا کہا ہے' تب سے وہ بے حد پریشان تھا اور چاہتا تھا کہ جا کر سارہ سے پوچھے یہ سب کیا ہو رہا ہے لیکن جس انداز میں یاسمین نے اسے تنبیہہ کی تھی اس کے بعد توصیف ولا جانا تو دور کی بات' اس کی فون تک کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر سارہ نے پڑھائی بھی چھوڑ دی تھی' جو وہ اس سے کالج میں مل سکتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کرے۔ امینہ سے وہ یوں بات نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اسے ثنا پر اعتبار بھی نہیں تھا۔ اکثر یہ خیال آتا کہ ہو سکتا ہے ثنا نے جلاپے میں یہ شوشا چھوڑا ہو لیکن اس خیال پر بھی وہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ پاتا۔ یہی سوچتا کہ ثنا اپنی طرف سے اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتی۔ اس وقت وہ متضاد سوچوں میں گھرا سارہ کو کوس رہا تھا جس نے یاسمین کے غیر اخلاقی رویے کے بعد اس سے معذرت کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے سارہ کو' وہ ایسی تو نہیں تھی۔" اس کی ہر سوچ کا اختتام اسی بات پر ہوتا تھا۔

ابھی بھی وہ سارہ کی بے حسی پر کڑھ رہا تھا۔ پھر آخر ہمت کر کے اسے فون کر ڈالا گو کہ اکثر سارہ ہی فون اٹھاتی تھی پھر بھی وہ خائف تھا اور جب تک اس کی آواز نہیں سن لی' اس کی سانسیں بحال نہیں ہوئی تھیں۔

"سمیر بات کر رہا ہوں۔" وہ بہت محتاط انداز میں بولا تھا۔

"کیسے ہو سمیر! پھپھو کیسی ہیں؟" سارہ کا لہجہ ہر احساس سے عاری تھا۔

"یاسمین آنٹی کہاں ہیں؟" اس نے سارہ کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔ تمہیں ان سے بات کرنی ہے؟" سارہ نے پوچھا تو وہ سلگا ضرور لیکن ضبط سے بولا۔

"نہیں تم سے۔"

"اب کیا بات ہے؟" سارہ کے نزدیک گویا ہر بات ختم ہو چکی تھی۔

"رازی بھائی کا کیا معاملہ ہے؟" اس نے فوراً" پوچھا۔

"رازی بھائی کا کون سا معاملہ؟" سارہ نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"سنا ہے اب رازی بھائی تم سے شادی کرنے کا کہہ رہے ہیں۔" سمیر کا سارا دھیان سارہ کی طرف تھا اور ادھر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

"بتاؤ سارہ! اس بات میں کتنی سچائی ہے؟" سارہ کی خاموشی نے اس کے اندر آگ لگا دی تھی۔ "بتاؤ سارہ! تم چپ کیوں ہو گئیں۔ اگر یہ سچ ہے تو بتاؤ کیا تم رازی بھائی سے شادی کر لو گی؟"

"نہیں! میں رازی بھائی تو کیا' کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی اور تمہیں یہ بات کہی کس نے؟" سارہ نے غصے سے پوچھا۔

"ثنا نے۔ لیکن مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آیا تھا۔"

"جب ہی مجھ سے تصدیق کر رہے ہو؟" سارہ کے چبھتے طنز پر اسے بھی غصہ آ گیا۔

"تم سمجھتی کیا ہو اپنے آپ کو۔ شکر کرو تم سے پوچھ رہا ہوں۔ اگر رازی بھائی سے پوچھتا اور وہ تصدیق کر دیتے تو پھر بتاؤ تم کیا جواب دیتیں۔"

"رازی بھائی کے کسی بھی معاملے میں میں جواب دہ نہیں ہوں۔ سمجھے تم!"

سارہ نے کہہ کر فون پٹخ دیا تھا اور سمیر کو بھی مزید کچھ نہیں کہنا تھا لیکن اس کی تشفی اب بھی نہیں ہوئی تھی جب ہی کچھ سوچ کر امینہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔



ساجدہ بیگم اس دن کے بعد سے رازی سے بات نہیں کر رہی تھیں اور اپنی ناراضی کا واضح اظہار وہ اپنے کمرے تک محدود ہو کر کر رہی تھیں۔ ناشتے کھانے کے وقت بھی وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلتی تھیں۔ کتنے دن ہو گئے تھے۔ اس دن کے بعد سے انہوں نے ثنا سے بھی اس موضوع پر بات نہیں کی تھی۔ رازی کی بے حسی مزید تکلیف دے رہی تھی۔ کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان کی ناراضی پر وہ خاموش ہو کر بیٹھ رہتا۔ فوراً" ان کے آگے پیچھے پھرنے لگتا تھا اور جب تک انہیں منا نہ لیتا چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ اب جانے اس نے اپنے دل میں کیا ٹھان لی تھی کہ ان کے کمرے میں جھانک بھی نہیں رہا تھا۔ صبح ناشتا کیے بغیر آفس چلا جاتا اور واپسی میں سیدھا اپنے کمرے کا رخ کرتا۔ شاید وہ بھی اس طرح اپنی بات منوانا چاہتا تھا۔ ساجدہ بیگم سمجھ رہی تھیں' جب ہی انہیں زیادہ تکلیف ہو رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رازی نے سارہ سے شادی کا کیسے سوچ لیا اور اس پر اتنا اٹل کیسے ہو گیا کہ اپنی ماں کی ناراضی کی بھی پروا نہیں رہی۔ کم از کم انہیں رازی سے ایسی توقع نہیں تھی۔

اسی وقت امینہ آئیں تو ساجدہ بیگم انہیں رازی کا نیا شوشا بتاتے ہوئے رو پڑیں۔

"بتاؤ امینہ! کیا یہ جان بوجھ کر خود کو ذلیل کروانے والی بات نہیں ہے؟ یاسمین کو تو چھوڑو توصیف بھی برا مانیں گے اور یہ نہیں کہ رازی یہ باتیں نہیں سمجھتا ہو گا۔ سب سمجھتے ہوئے بھی اس نے منہ پھاڑ کر سارہ کا نام لے دیا۔"

"وہی تو... میں بھی کہوں بھابھی! رازی کی مت ماری گئی ہے کیا۔ چار سال اریبہ سے منگنی رہی' اس کی محبت کا دم بھرتا رہا اور اب اسی کی بہن کو بیاہ لانا احمقانہ ہی نہیں گھٹیا پن بھی ہے۔ آپ نے یہ بات کہی نہیں رازی سے؟"

"ارے اس نے میری بات سنی کہاں۔ بس اپنی کہہ کر چلا گیا اور اس دن سے میرا سامنا بھی نہیں کر رہا۔ کرے گا بھی تو میں کیا کر لوں گی۔ ابھی آئے تو تم پوچھنا اس سے۔ آخر اس نے ایسا سوچا کیسے اور یہ بھی کہہ دینا' میں مر جاؤں گی لیکن سارہ کے لیے اس گھر میں نہیں جاؤں گی۔" ساجدہ بیگم کا ڈپریشن ان کی آواز سے ظاہر ہو رہا تھا۔

"اچھا آپ زیادہ دل پر نہ لیں بھابھی! میں بات کرتی ہوں رازی سے اور سمجھاؤں گی بھی۔" امینہ نے انہیں تسلی دی۔

"ہاں امینہ! مجھ میں اب برداشت کی طاقت نہیں ہے۔ سوچ سوچ کر لگتا ہے میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔" ساجدہ بیگم پھر روہانسی ہو گئیں۔

"اللہ نہ کرے بھابھی! اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ اپنے بچوں کی خوشیاں دکھائے۔" امینہ' ساجدہ بیگم کی پریشانی اپنے دل پہ محسوس کر رہی تھیں۔ انہیں گلے لگانا چاہتی تھیں کہ رازی کے آنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"السلام علیکم پھپھو!" رازی امینہ کو دیکھ کر یوں رکا تھا جیسے ان کا جواب سنتے ہی آگے بڑھ جائے گا۔

"خوش رہو' ٹھیک تو ہو۔ تم تو آتے ہی نہیں۔ کبھی یاد بھی نہیں آتی میری۔" امینہ نے رازی کی عجلت دیکھتے ہوئے بات بڑھائی تھی۔

"آؤں گا پھپھو!" رازی کہہ کر آگے بڑھا تھا کہ امینہ نے فوراً" ٹوک دیا۔

"جا کہاں رہے ہو بیٹھو۔ میں تم سے ملنے ہی آئی ہوں۔"
"جی!" رازی اپنی حرکت پر نادم ہو کر بیٹھ گیا۔ "کس کے ساتھ آئی ہیں پھپھو؟"
"سمیر چھوڑ کر گیا ہے لیکن جاؤں گی تمہارے ساتھ۔ کوئی بہانہ مت کرنا۔" امینہ نے پہلے سے جتا دیا۔
"لیجیے پہلے کب بہانہ کیا ہے پھپھو!"
"اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ۔ تم نے ماں کو کیوں پریشان کر رکھا ہے؟" امینہ تو خیر سوچ کر بیٹھی تھیں لیکن رازی کے لیے یہ بات غیر متوقع تھی کیونکہ ساجدہ بیگم گھر کی باتیں کبھی کسی کے سامنے نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے وہ جز بز ہو کر ایک نظر انہیں دیکھ کر بولا۔
"میں کہاں پریشان کر رہا ہوں پھپھو!"
"تو اور کون کر رہا ہے۔ سارہ سے شادی کی بات کس نے کی ہے؟" امینہ نے بغیر گھمائے پھرائے صاف لفظوں میں پوچھا تو رازی سنبھل کر بیٹھ گیا۔
"کوئی گناہ تو نہیں کیا میں نے پھپھو! مجھ سے امی نے میری پسند پوچھی تھی اور میں نے بتا دی۔ اب آگے ان کی مرضی۔ یہ میری پسند کا خیال کریں نہ کریں۔ میں زبردستی نہیں کر رہا اس لیے انہیں بھی زبردستی نہیں کرنی چاہیے.... ٹھیک ہے امی کو سارہ پسند نہیں ہے تو نہ سہی۔ لیکن پھر میری شادی کا خیال بھی چھوڑ دیں۔"
یہ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا! بات پسند ناپسند کی نہیں ہے۔ سارہ گھر کی بچی ہے ناپسند کیوں نہیں ہوگی۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں ہے۔" امینہ نے سٹپٹا کر بات سنبھالنے کی کوشش کی۔
"کیوں ممکن نہیں ہے۔ پھپھو! بنا آگے بات کیے آپ لوگوں نے کیسے سوچ لیا کہ یہ ممکن نہیں ہوگا۔"
"آگے بات کرنا آسان نہیں ہے۔ چلو اگر ہم آگے بات کریں اور وہاں سے توصیف بھائی اور یاسمین نے منع کر دیا پھر؟" امینہ نے پوچھتے ہوئے ساجدہ بیگم کا ہاتھ دبا کر گویا انہیں بھی پوری بات سننے پر آمادہ کیا۔
"میرا خیال ہے چچا جان اور یاسمین آنٹی بھی سارہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔" رازی کے جواب نے ساجدہ بیگم کو ششدر کر دیا۔
"تمہارا مطلب ہے سارہ بھی یہی چاہتی ہے؟" امینہ اپنی جگہ حیران اور غیر یقین تھیں۔
"پتا نہیں۔ مجھے سارہ کا نہیں پتا۔" وہ تنگ آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"امی! آپ خوامخواہ میرا تماشا بنوا رہی ہیں۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔" اس نے خفگی سے کہا اور فوراً" کمرے سے نکل گیا۔
"سن لیا۔ ساری باتیں طے ہو جاتی ہیں اور ہمیں خبر ہی نہیں ہوتی۔" ساجدہ بیگم نے رازی کے جاتے ہی کہا۔
"ہوں!" امینہ سوچتے انداز میں بولیں۔ "مجھے تو یہ بھی یاسمین کی چال لگ رہی ہے بھابھی!"
"اب بتاؤ۔ میں کیا کروں۔" ساجدہ بیگم حد درجہ فکر مند تھیں۔
"ابھی کچھ نہ کریں۔ آپ بس خاموش رہیں۔ میرا مطلب ہے ابھی رازی پر شادی کا دباؤ نہ ڈالیں۔ آپ جتنا کہیں گی وہ اسی قدر ضد میں آئے گا۔ اس لیے ابھی یہ شادی بیاہ کی باتیں رہنے دیں۔"
امینہ کی بات پر ساجدہ بیگم خاموش ہو گئیں۔



اریبہ اس وقت اسپتال سے جلدی فارغ ہو گئی تھی تو اکیڈمی جانے کا سوچ کر اس نے گاڑی اسی راستے پر ڈال دی لیکن پھر اچانک اس کا موڈ بدل گیا یا شاید سامنے بنے اپار ٹمنٹس کی پیشانی پر جانا پہچانا نام دیکھ کر اسے کچھ خیال

آگیا اور اس نے گاڑی وہیں پارک کردی اور سیکنڈ فلور پر آکر پہلے اطراف کا جائزہ لیا پھر مطلوبہ دروازے پر بیل کا بٹن دبا دیا۔ اندر سے تاجور کی آواز آئی تھی۔

"کون.....؟"

"اریبہ.....!" اس نے اپنا نام بتایا تو دروازہ فوراً" ہی کھلا اور اگلے پل تاجور مارے خوشی کے اس سے لپٹ گئی۔

"اریبہ باجی! مجھے یقین تھا' آپ ضرور آئیں گی۔"

"اچھا اندر تو آنے دو۔" تاجور کی محبت نے اسے مسکرانے پر مجبور کردیا تھا۔

"ہاں آئیں ناں۔ میں تو روز آپ کا انتظار کرتی ہوں۔ سارہ باجی نہیں آئیں۔" تاجور نے اس کے عقب میں دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں' میں اسپتال سے آرہی ہوں۔" وہ تاجور کے ساتھ اندر آگئی۔

"اچھا پھر میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔ بھوک لگی ہوگی نا آپ کو۔" تاجور کہہ کر تیزی سے جانے لگی تھی کہ اریبہ نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

"نہیں تاجور! میں ابھی کھانا نہیں کھاؤں گی۔"

"کیوں نہیں باجی! مجھے پتا ہے آپ کالج سے آکر کھانا کھاتی ہیں۔ آپ بیٹھیں۔ میں بس ابھی گرم کرکے لاتی ہوں۔" تاجور نے اتنے مان سے کہا کہ پھر وہ منع نہیں کرسکی۔

"اچھا بس زیادہ کچھ مت لانا۔" وہ کہہ کر بیٹھ گئی۔

تاجور کچن میں چلی گئی تو وہ سارے کا جائزہ لینے لگی۔ یہاں بھی غیر ضروری سامان کی بھرمار نہیں تھی۔ جب ہی دو کمروں اور لاؤنج پر مشتمل اپارٹمنٹ خاصا کشادہ لگ رہا تھا۔ اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی اس بورڈ پر جا ٹھہریں جس پر شمشیر علی اسکیچ بنا تا تھا۔ ابھی بھی اس پر دھندلا سا خاکہ نظر آرہا تھا۔ وہ بلا ارادہ اٹھ کر بورڈ کے پاس آن کھڑی ہوئی اور اس خاکے کو غور سے دیکھنے لگی لیکن سمجھ میں نہیں آیا۔ پنسل اٹھا کر وہ کچھ کرنا چاہ رہی تھی کہ موبائل کی ٹون نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ وہ پنسل رکھ کر دوبارہ اسی جگہ آبیٹھی اور بیگ سے موبائل فون نکال لیا۔ اسکرین پر سمیر کا نام تھا' اس نے لیس کیا۔

"ہاں سمیر!"

"تم کہاں ہو اریبہ؟" سمیر نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ابھی گھر پر نہیں ہوں۔ تم کہو کیا بات ہے؟" اسے سمیر کا انداز مشکوک لگا۔

"بات بہت اہم ہے اریبہ! فون پر نہیں کرسکتا۔" سمیر نے کہا تو وہ ٹھٹکی لیکن رسان سے بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم گھر پہنچو' میں بھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گی۔"

"سوری اریبہ! میں تمہارے گھر نہیں آسکتا۔ تم پلیز مائنڈ مت کرنا ہم کہیں باہر مل لیتے ہیں۔"

سمیر نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ اگر منع کرتی تو مزید الجھتی رہتی۔ اس لیے ہامی بھر کر موبائل آف کردیا اور ٹیبل پر رکھی کھانے کی ٹرے دیکھنے لگی۔ حقیقتاً" اب اس کا کھانے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن تاجور کا دل بھی رکھنا تھا۔ پلیٹ میں تھوڑے سے چاول نکالے اور ان پر شوربہ ڈال کر کھاتے ہوئے تاجور سے پوچھنے لگی۔

"کیا کرتی ہو سارا دن؟"

"گھر کے کام۔ کھانا پکاتی ہوں' صفائی کرتی ہوں' کپڑے دھوتی ہوں' بھائی کے آنے سے پہلے سارے کام کرلیتی ہوں۔" تاجور شوق سے بتانے لگی۔

"اچھی بات ہے۔" اگر سمیر کا فون نہ آتا تو وہ مزید کچھ دیر تاجور کے ساتھ ضرور رہتی ——— اس کی معصوم باتیں سنتی کچھ مشورے بھی دیتی لیکن اب اس کا ذہن بالکل کام نہیں کررہا تھا' اس لیے جلدی سے پلیٹ کے چاول ختم کیے اور تاجور سے معذرت کے ساتھ دوبارہ آنے کا وعدہ کرکے وہاں سے نکل آئی تھی۔

سمیر کو اس نے پارک ٹاور آنے کا میسج کیا اور تقریباً" بیس منٹ بعد وہ پارک ٹاور کے فوڈ کارنر میں سمیر کے سامنے بیٹھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر پریشانی ہویدا تھی۔

"آئی ایم سوری! میں نے تمہیں زحمت دی۔" سمیر نے کہا تو اس نے فوراً" ٹوک دیا۔

"تم اصل بات کہو۔"

"اصل بات۔" سمیر بہت پریشان نظر آنے لگا' جیسے اسے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔ پھر بمشکل رک رک کر گویا ہوا۔

"اصل بات کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ میں سارہ کو پسند کرتا ہوں بلکہ دل سے چاہتا ہوں اسے اور بارہا اس کے سامنے اعتراف بھی کرچکا ہوں۔"

"پھر.....؟" اریبہ کے لیے جیسے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

"پھر یہ کہ..... " سمیر کچھ کہتے کہتے رکا پھر اسے دیکھ کر بولا۔ "تم..... میرا مطلب ہے۔ تم بھی تو جانتی ہوگی کہ ابھی نئی بات کیا ہوئی ہے۔"

"نئی بات؟" اس نے سوچا پھر نفی میں سرہلا کر بولی۔ "نہیں مجھے کسی نئی بات کا علم نہیں ہے تم بتاؤ....."

"میں۔ مجھے بتاتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔ تم سارہ سے پوچھو' اس کا اور رازی بھائی کا کیا چکر ہے۔" سمیر نے کہا تو اس کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔

"سارہ اور رازی؟" پل میں جانے کب کب کے منظر اس کی نظروں میں گھوم گئے تھے۔

"ہاں۔ رازی بھائی کا کہنا ہے کہ وہ شادی کریں گے تو صرف سارہ سے ورنہ کسی سے نہیں اور کبھی نہیں۔" سمیر اس کی کیفیت اچھی طرح سمجھ رہا تھا' پھر بھی خود کو یہ کہنے سے روک نہ پایا۔ اور وہ جیسے قوت گویائی کھو چکی تھی۔

"یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا اریبہ! سارہ میری محبت ہے اور رازی بھائی کو کسی کی محبت پر ڈاکا ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ ہم سب ان کا احترام کرتے ہیں تو انہیں بھی اپنے مرتبے کا خیال کرنا چاہیے۔" سمیر اب غصے میں بول رہا تھا۔

اریبہ کو پتا بھی نہیں چلا' کب اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا تھا' جسے دیکھ کر سمیر ایک دم خاموش ہوگیا' پھر قدرے رک کر کہنے لگا۔

"بہت گری ہوئی حرکت کررہے ہیں رازی بھائی۔ چار سال تمہاری محبت کا دم بھرتے رہے اور تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ انہوں نے نظریں تو پھیریں ہی مزید تمہیں زک پہنچانے کی خاطر تمہاری بہن کو بہکا دیا۔ خدا کی قسم ایسا تو کوئی اپنے دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا ہوگا۔"

"اور سارہ..... سارہ کو تم کیا کہوگے؟" وہ جیسے درد کے صحرا میں تنہا کھڑی تھی۔

"سارہ نادان ہے۔ وہ رازی بھائی کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئی ہوگی۔" سمیر نے کہا تو وہ دکھ سے مسکرائی' پھر نفی میں سرہلا کر بولی۔

"نادان سارہ نہیں تم ہو۔ خیر اس بحث میں پڑنے کے بجائے یہ بتاؤ' تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"تم سارہ کو سمجھاؤ پلیز۔ وہ رازی بھائی کی باتوں میں نہ آئے۔" سمیر نے کہا تو وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر محض اس کا دل رکھنے کی خاطر بولی تھی۔

"کوشش کروں گی۔"

✵ ✵ ✵

شمشیر علی ہاتھ منہ دھوکر دسترخوان پر آکر بیٹھا ہی تھا کہ تاجور خوش ہو کر بولی۔
"پتا ہے بھائی! آج اریبہ باجی آئی تھیں۔"
"اریبہ آئی تھی؟" وہ حیران ہوا۔
"جی۔ میں نے کہا تھا نا اریبہ باجی ضرور آئیں گی اور انہوں نے پھر آنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ سچ بھائی! انہیں دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتی۔"
تاجور کی خوشی اپنی جگہ شمشیر علی خود بھی خوش گوار احساس میں گھر گیا تھا۔
"کب آئی تھی اریبہ۔"
"دوپہر میں اسپتال سے ادھر ہی آگئی تھیں۔"
"اچھا۔ پھر تم نے کیا خاطر مدارت کی اس کی؟" شمشیر علی کا بظاہر سرسری انداز تھا' ورنہ اصل میں تو وہ سب کچھ جاننا چاہتا تھا اور یہ بھی کہ اب بس اسی کا ذکر ہوتا رہے۔
"کھانا کھلایا تھا لیکن انہوں نے بہت تھوڑا سا کھایا' اصل میں کوئی فون آگیا تھا اس لیے انہیں جلدی جانا پڑا۔ ورنہ میں انہیں رات تک روکتی۔" تاجور کو اب اریبہ کے جلدی جانے کا افسوس ہو رہا تھا۔
"کس کا فون تھا؟" وہ بلا ارادہ پوچھ گیا۔
"پتا نہیں' کہہ رہی تھیں' ضروری جانا ہے' پھر آؤں گی۔"
"چلو کچھ دیر کو ہی سہی وہ آئی تو۔" وہ اپنی بات کہہ کر سٹپٹا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"کیا ہوا بھائی! کھانا تو کھالیں۔" اس کے اٹھنے پر تاجور کا دھیان اس کی بات سے ہٹ گیا تھا۔
"بس کھالیا۔ چائے پیوں گا۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کا دل چاہا اریبہ کو تھینکس کا میسج کرے اور اس نے موبائل فون اٹھایا بھی لیکن پھر رک گیا۔ اسے اپنی بات یاد آگئی تھی۔
"میں غلطی پر غلطی کر رہا ہوں۔" اور واقعی اسے احساس ہوا تھا کہ اسے اتنی جلدی اریبہ کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جانے اسے کن حالات کا سامنا تھا۔ بے اعتباری کی فضا میں سانس لیتی وہ ابھی کہاں کسی کا اعتبار کرے گی۔ اسے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب اس کی آنکھوں میں چبھی ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں تحلیل ہو جائیں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اریبہ کا دھیان بٹے اور وہ بجائے اس کا دھیان بٹانے کے الٹا اس سے ایسی باتیں کرتا تھا جس سے یقیناً" اس کے زخموں پر مزید ضرب پڑتی ہوگی' جب ہی تو وہ تلملا جاتی تھی۔ بہرحال اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا تو پھر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب اسے نہیں تنگ کرے گا۔ گو کہ اب خود سے کیے اس عہد پر قائم رہنا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ کیونکہ اریبہ بری طرح اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ ہر نئے دن کے آغاز پر اسے لگتا اریبہ کو دیکھے بغیر اس کا دن نہیں کٹ سکتا اور ہر رات اس رات میں ڈھل جاتی جب وہ اس کے تخت پر بے خبر سو رہی تھی۔ حقیقتاً" اس کا اب کہیں کسی بات میں دل نہیں لگتا تھا۔ ایسی بے قراری تو اس وقت بھی نہیں تھی' جب وہ تاباں کو سوچتا تھا۔ تاباں سے ملنے کے لیے تو باقاعدہ منصوبہ بندی کرنی پڑتی تھی کہ سمسٹر سے فارغ ہو جائے گا تب جائے گا اور اب پہلی ترجیح اریبہ تھی۔ باقی ساری باتیں اس کے بعد تھیں اسی قدر اب وہ مجبور بھی ہو گیا تھا۔ لیکن مایوس نہیں تھا۔ پھر آج اریبہ کی آمد نے اس کی امیدوں کو نئی جلا بخش دی تھی۔ منزل دور ضرور تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ راستے میں تھک کر بیٹھ جاتا۔

✵ ✵ ✵

سارہ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ کوریڈور سے آتی اریبہ کی آواز سن کر رک گئی۔ اریبہ یاسمین سے کہہ رہی تھی۔
"مما! مجھ سے مت چھپائیں۔ مجھے بتائیں جب تائی امی اور امینہ پھپھو آئی تھیں تو انہوں نے آپ سے سارہ کی بات کی تھی؟"
"سارہ کی بات؟" یاسمین کا انداز نا سمجھنے والا تھا جبکہ ادھر سارہ کو اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی تھی۔
"ہاں سارہ کی بات۔ تائی امی نے سارہ کے لیے رازی کا پرپوزل دیا تھا نا؟" اریبہ یقین سے پوچھ رہی تھی۔
سارہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا' پھر بھی وہ تیزی سے پلٹ کر بے آواز قدموں سے بھاگتے ہوئے کمرے میں آئی' پھر واش روم میں بند ہو گئی۔ اس کے سینے میں سانس اٹک گئی تھی۔ بند دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے' وہ کتنی دیر سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ اتنی جلدی یوم حساب آگیا تھا اور یہ تو آنا ہی تھا۔ وہ کب سے اس دن کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی اور کبھی کبھی تو اسے لگتا تھا' جیسے وہ آنکھ بند کر کے پل صراط سے گزر جائے گی' لیکن اب پل صراط کے تق... ہی اس پر ہیبت طاری ہو گئی تھی۔
"یا اللہ! میں نے کچھ نہیں کیا۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ تو سب جانتا ہے۔ میری لاج رکھ میرے رب۔"
آنسو ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اس نے شدت سے آرزو کی آندھی' طوفان کی' جو اسے کہیں دور اڑا لے جا۔ یا زمین ہی پھٹ جائے۔ کچھ تو ہو۔ وہ اپنی ماں بھائی کا سامنا کیسے کرے گی۔
"اریبہ!" اس کے ہونٹوں پر سسکی ابھری۔ پھر اس نے واش بیسن کا نل پورا کھول کر پانی کے ساتھ سارے آنسو بہا ڈالے' پھر بھی دل ٹھہر کے نہیں دیا۔ لیکن اب جو ہو سو ہو۔ وہ ہاتھوں سے چہرہ تھپتھپاتے ہوئے واش روم سے نکل آئی۔ اریبہ ابھی کمرے میں نہیں آئی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے اور یاسمین کے درمیان کیا باتیں ہو رہی ہوں گی۔ اس نے سوچا تکیے میں منہ چھپا کر سو جائے۔ لیکن کب تک چھپے گی۔
"کل جو ہونا ہے' وہ آج' ابھی ہو جائے۔" اس نے اپنے دل کو باور کرایا' پھر بیڈ کے سرہانے کمر ٹکا کر بیٹھ گئی اور اپنے سامنے میگزین کھول لیا۔ وہ یہ تاثر دینا چاہتی تھی جیسے وہ بہت دیر سے اسی طرح بیٹھی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلنے کی آواز پر بھی وہ بظاہر متوجہ نہیں ہوئی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کا پورا وجود آنکھ بن گیا تھا اور وہ اریبہ کی ایک ایک حرکت دیکھ رہی تھی۔
اریبہ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر ادھر ادھر ہاتھ مار رہی تھی۔ دراز کھولے' بند کیے' پھر اس کی طرف سے پیٹھ موڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تب اس نے ترچھی نظروں سے اریبہ کو دیکھتے ہوئے پکار کر پوچھا۔
"اریبہ! ابھی تم مما سے کیا کہہ رہی تھیں؟"
اریبہ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اچھل کر اس کی طرف گھومی۔
"کیا واقعی تائی امی میرا پرپوزل لائی تھیں؟" اس نے سہمے دل کے ساتھ پوچھا۔
اریبہ ابھی بھی کچھ نہیں بولی۔ چبھتی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔
"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" وہ مزید خائف ہو گئی۔
"دیکھ رہی ہوں' تمہارے کتنے روپ ہیں۔" اریبہ کے سلگتے لہجے میں طنز کے ساتھ اچانک استہزاء شامل ہو گیا۔ "واہ سارہ! تم نے تو کمال کر دیا۔ مجھے رازی کی محبت کا یقین دلانے دلاتے خود یقین کر بیٹھیں تو پھر رازی

میرے قابل نہیں رہا۔ یہ ہی کہا تھا نا تم نے کہ رازی تمہارے قابل نہیں ہے؟"

"ہاں! میں نے کہا تھا تو اس کا یہ مطلب کیسے لے لیا تم نے کہ میں....."

"تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا.... بتاؤ۔" اریبہ کو خود پر کنٹرول نہیں رہا تھا۔ "رازی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے، کیوں؟"

"مجھے کیا پتا۔ رازی بھائی سے پوچھو۔" سارہ نظریں چرا گئی۔

"اس سے بھی پوچھ لوں گی۔ پہلے تم بتاؤ! تم کیا چاہتی ہو۔ تم بھی رازی سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں.... نہیں۔" سارہ چیخ پڑی۔ "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ میں ایسا کیوں چاہوں گی۔ رازی نے اگر ایسا کوئی شوشا چھوڑا ہے تو تم مجھے کیوں گھسیٹ رہی ہو؟ میں نے کبھی رازی کو ایسی نظر سے نہیں دیکھا نہ کبھی سوچا۔ ہمیشہ تمہاری نسبت سے اسے جانا۔ وہ اگر تمہارا نہیں ہوا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مجھے الزام دو۔ میں لعنت بھیجتی ہوں رازی پر۔"

سارہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ فوری طور پر اریبہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ وہ سارہ کا یقین کر بھی رہی تھی اور نہیں بھی.....

"کہہ دو مما سے اگر تائی امی نے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت کی ہے تو صاف منع کر دیں انہیں۔ میں مر جاؤں گی لیکن رازی سے شادی نہیں کروں گی۔ انہوں نے ایسا سوچا کیسے۔" سارہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

اریبہ نے اس وقت مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے روتے ہوئے چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

سارہ کا رونا بند نہیں ہوا۔ اسے اب رازی پر غصہ آ رہا تھا۔



کتنے دن ہو گئے تھے۔ اریبہ اور سارہ کے درمیان بات چیت بند تھی۔ سارہ نے اپنا کمرا بھی الگ کر لیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کیا سوچتی تھیں اور دونوں میں کون صحیح تھا کون غلط، یہ تو یاسمین بھی نہیں جانتی تھی۔ لیکن وہ دونوں بیٹیوں کے درمیان کشیدگی کو بری طرح محسوس کر رہی تھی۔ اس نے الگ الگ دونوں کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ جب ساجدہ بیگم کی طرف سے ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں تو وہ کیوں ناراض ہو رہی ہیں۔ اس وقت وہ اریبہ سے یہ ہی کہہ رہی تھی، جس پر وہ تنفر سے بولی۔

"تائی امی نے نہیں کہا، لیکن رازی تو کہہ رہا ہے نا۔"

"تو بیٹا! اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟"

"کیا ہوتا ہے.... مما! آپ کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ایک شخص چار سال مجھ سے منسوب رہا اور اب وہ آپ کی دوسری بیٹی کا نام لے رہا ہے۔ آپ کو تو چاہیے اس کا منہ توڑ دیں کیونکہ اس کا مقصد مجھے ٹارچر کرنا ہے۔" اریبہ کا ہتھے سے اکھڑنا فطری تھا۔

"میں سمجھتی ہوں بیٹا! اور یہ ہی تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کہ تم رازی کو اس کے مقصد میں کامیاب مت ہونے دو.... اور رہی اس کا منہ توڑنے کی بات تو میں اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہوں۔ لیکن مجھے پہلے اپنے گھر کو دیکھنا ہے۔ میرا گھر مضبوط ہو گا، تب ہی میں دشمنوں کا منہ توڑ سکوں گی۔" یاسمین میں جانے اتنا ضبط کہاں سے آ گیا تھا، دھیمے سے بول رہی تھی۔

"پھر تم یہ کیوں نہیں سوچ رہیں بیٹا! کہ رازی کی اس بکواس سے سارہ کا کیا تعلق۔ تم سارہ سے کیوں ناراض ہو۔"

"مجھے نہیں پتا۔ بس مجھے لگتا ہے سارہ اور رازی کے درمیان کچھ ہے۔ اور میں آپ کو بتا رہی ہوں، اگر میرا شک صحیح نکلا تو پھر میں خود یہاں سے چلی جاؤں گی ہمیشہ کے لیے۔" اریبہ محض دھمکی نہیں دیتی تھی، جب ہی یاسمین پریشان ہو گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹا! تم اپنی بہن پر شک کر رہی ہو؟"

"بہن کو شرم نہ آئی میری محبت پر ڈاکا ڈالتے ہوئے؟" اریبہ تنک کر بولی۔

"نہیں بیٹا! تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ کم از کم میں سارہ کے بارے میں ایسی کسی بات کا یقین نہیں کر سکتی۔ وہ تو اتنے چھوٹے دل کی ہے کہ....."

"چھوٹے دل والے ہی ایسی پیچ حرکتیں کرتے ہیں مما!" اریبہ نے یاسمین کی پوری بات سنی ہی نہیں۔ "سارے جہاں کا درد سارہ کے دل میں ہے، یہ تو آپ مانتی ہیں نا۔ ہر ایک کی ہمدرد بن جاتی ہے، پھر ہمدردی کیا گل کھلاتی ہے، یہ بھی آپ جانتی ہوں گی۔"

"بس کرو بیٹا! تم بہت بدگمان ہو رہی ہو۔ غصے اور بدگمانی میں ایسی باتیں کر رہی ہو، جو تمہیں زیب نہیں دیتیں۔" یاسمین نے ٹوک کر افسوس سے کہا۔

"میں انسان ہوں مما! مجھے کسی ایسی مسند پر مت بٹھائیں، جہاں میں پتھر کی مورت بن جاؤں اور میں آپ کو بتاؤں، یہ اب کی بات نہیں ہے۔ سارہ جانے کب سے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہے۔" اریبہ کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

"اچھا! تم....." یاسمین کچھ کہتے کہتے نہ صرف چونکی بلکہ ٹھٹکی بھی تھی۔ پھر ایک دم اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگی۔ اریبہ کچھ سمجھ نہیں پائی۔

"کیا ہوا مما.....؟"

"کچھ نہیں۔" یاسمین کھڑکی بند کر کے واپس پلٹتے ہوئے بولی۔ "مجھے لگا یہاں کوئی تھا۔"

"تائی ہو گا۔" اریبہ بے نیازی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں! شاید وہ ہی تھا۔" یاسمین نے اپنا خدشہ ظاہر نہیں کیا اور سرسری انداز میں کہہ کر وارڈروب کھول لی۔ صرف اس لیے کہ اریبہ پھر نہ سارہ کی بات لے بیٹھے۔ اس کی بدگمانی دیکھتے ہوئے یاسمین اب اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"اچھا مما! میں ذرا ڈیڈی کے پاس جا رہی ہوں۔" اریبہ نے جاتے ہوئے کہا تو یاسمین ایک دم پریشان ہو گئی۔

"اریبہ....."

"فکر مت کریں۔ ڈیڈی سے سارہ کی بات نہیں کروں گی۔" اریبہ اس کی پکار سے سمجھ کر کہتے ہوئے چلی گئی۔ یاسمین نے بمشکل خود کو روکے رکھا اور جب اریبہ کی گاڑی جانے اور گیٹ بند ہونے کی آواز سن لی، تب اس نے وارڈروب بند کی اور اپنے خدشے کی تصدیق کے لیے سارہ کے کمرے میں آ کر اسے دیکھنے لگی۔

سارہ خاصے مگن انداز میں کچھ گنگناتے ہوئے اپنا سوٹ پریس کر رہی تھی۔

"سارہ!" یاسمین کے پکارنے پر سارہ چونک کر بولی۔

"جی مما....."

"بیٹا! تم ابھی لان میں گئی تھیں؟" یاسمین نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

"نہیں مما! کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، بس مجھے فیل ہوا تھا جیسے تم وہاں ہو۔" یاسمین کا انداز ہنوز تھا۔

"اچھا!" سارہ محظوظ ہوئی۔ "آپ مجھے ڈرا تو نہیں رہیں مما!"
یاسمین نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔



اریبہ نے گیٹ پر رازی کی گاڑی دیکھ کر چاہا کہ واپس پلٹ جائے' لیکن پھر کچھ سوچ کر اندر آئی تو رازی توصیف احمد کے ساتھ بیٹھا نظر آیا۔
"السلام علیکم!" اس نے سلام کیا تو آواز پر رازی چونکا ضرور لیکن اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا' جبکہ توصیف احمد خوش ہو گئے۔
"وعلیکم السلام! کیسا ہے میرا بیٹا؟"
"بالکل ٹھیک۔" وہ کوشش سے کھلکھلائی اور رازی کو نظرانداز کر کے توصیف احمد کے پاس بیٹھ کر پوچھنے لگی۔ "میں آپ کی بزنس میٹنگ میں مخل تو نہیں ہوئی ڈیڈی۔"
"نہیں بیٹا! آپ بتاؤ' گھر میں سب ٹھیک ہیں؟" توصیف احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ پھیلا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
"جی! بس سارہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے رازی کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ شاید سارہ کے نام پر اس کے چہرے پر کوئی داستان رقم ہو جائے' لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔
"کیا ہوا۔ یوں ہی بخار ہے یا کوئی اور تکلیف؟" توصیف احمد نے پوچھا تو اس کی نظریں پھر رازی کی طرف اٹھ گئیں۔
"بخار تو نہیں ہے ڈیڈی! شاید کوئی اور تکلیف ہے۔"
"تو بیٹا! ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھایا؟"
"میں خود ڈاکٹر ہوں ڈیڈی! لیکن سارہ اپنی تکلیف بتائے تب نا۔ وہ تو کچھ بتاتی ہی نہیں ہے۔ ویسے مما لے گئی تھیں اسے ڈاکٹر کے پاس۔" اس نے رازی پر جتا کر توصیف احمد کو تسلی بھی دے ڈالی۔
"پھر کیا بتایا ڈاکٹر نے؟"
"ڈاکٹر نے کہا' سوچتی زیادہ ہے۔ اسے مصروف رہنے کی ضرورت ہے۔ مجھے بھی یہ ہی لگتا ہے ڈیڈی۔ آپ اسے سمجھائیں' پھر سے کالج جوائن کر لے۔ گھر بیٹھ بیٹھ کر خبطی ہو گئی ہے۔"
"ہوں! یہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! سارہ کو پڑھائی نہیں چھوڑنی چاہیے۔ میں سمجھاؤں گا اسے۔" توصیف احمد نے اس کی تائید کی تو وہ بے اختیار بولی۔
"نہ سمجھے تو آپ فوراً" اس کی شادی کر دیں۔" پھر اسی طرح بے اختیار رازی کو مخاطب کر گئی۔ "کیوں رازی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"
رازی ایک نظر اس پر ڈال کر توصیف احمد کو دیکھنے لگا تو اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی بوندیں دیکھ کر وہ ہنس پڑی۔
"ارے ہم تو یوں بوکھلا گئے رازی! جیسے میں تمہاری شادی کی بات کر رہی ہوں۔ ویسے اڑتے اڑتے مجھ تک یہ خبر پہنچ چکی ہے کہ تم۔۔۔"
"چچا جان!" رازی نے گھبرا کر توصیف احمد کو مخاطب کر لیا۔ "وہ میں نے آپ کو ثنا کے رشتے کا بتایا تھا نا تو انہوں نے وہاں ہامی بھر لی ہے۔"
"اچھا! یہ تو اچھی بات ہے۔" توصیف احمد نے خوشی کا اظہار کیا' پھر اریبہ کو وہاں سے اٹھانے کی غرض سے

لے۔ "بیٹا! اپنی آنٹی سے چائے کا کہہ دو۔"
"وہ سوری! میں آنٹی سے ملنا تو بھول گئی۔" وہ کہتے ہوئے فوراً" اٹھ کر اندر خالدہ کے پاس آ گئی۔
"السلام علیکم آنٹی! کیسی ہیں آپ؟"
"اللہ کا شکر ہے۔ تم سناؤ بڑے دنوں بعد آئیں۔" خالدہ اس کی آمد پر کچھ نہ کچھ قیاس کرنے لگی تھیں۔
"ہاں! بس۔ پڑھائی کا جو نقصان ہوا ہے' وہ ہی پورا کرنے میں لگی ہوئی ہوں۔"
"ہاں! تمہارا تو سال ضائع ہو گیا ہے۔" خالدہ بے ساختہ کہہ گئیں۔
"شکر ہے آنٹی! صرف ایک سال ضائع ہوا ہے۔ آگے زندگی ضائع ہونے سے بچ گئی۔" اس کا اشارہ رازی کی طرف تھا اور خود اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس کے لیے یہ ہی ٹھیک ہے۔ وہ کیوں دل کے اجڑنے کا ماتم کر رہی ہے۔
"ارے! تم بیٹھو نا۔۔۔" خالدہ نے کہا تو وہ چونک کر بولی۔
"بس آنٹی! میں چلتی ہوں اور ہاں! ڈیڈی چائے کا کہہ رہے ہیں۔ بھجوا دیجیے۔"
"تم بھی بیٹھو نا۔ چائے تو پی لو۔" خالدہ نے اخلاقاً" اسے روکنا چاہا۔
"پھر آؤں گی آنٹی! خدا حافظ۔" وہ کھڑے کھڑے وہیں سے باہر نکل آئی۔ اچانک دل اچاٹ ہو گیا تھا۔
"مما ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ مجھے رازی کو اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہیے۔ وہ مجھے ٹارچر کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اپنی ذات میں الجھائے رکھنا چاہتا ہے۔ نان سینس۔۔۔ میں بتاؤں گی اسے کہ مجھے کوئی فرق نہیں پڑا اور سارہ۔" اس کی سوچوں کو بریک لگ گئی۔ ساتھ ہی اس نے گاڑی کو بھی بریک لگا دیے تھے۔
پھر شاپنگ مال کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے بہت کچھ سوچ ڈالا۔ اس کے بعد روشنیوں کی چکاچوند میں اس کا نہ صرف دھیان بٹا' بلکہ وہ شوق سے خصوصاً" سارہ کے لیے شاپنگ میں مصروف ہو گئی۔
"کیا ہوا' جو سارہ کی رازی کے ساتھ انڈراسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔ اگر سارہ خوش ہے تو مجھے اس کی خوشی کا خیال کرنا چاہیے۔"
وہ خود کو یہ ہی باور کراتے ہوئے سارہ کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے سوٹ' میک اپ کی کچھ چیزیں اس کے بعد میچنگ جیولری دیکھ رہی تھی کہ اسے لگا' جیسے وہ کسی کی نظروں کے حصار میں آ گئی ہو۔ اچانک دل دھڑکا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا' لیکن ایسا کوئی نظر نہیں آیا' جو اس پر نظریں جمائے کھڑا ہو۔ تب وہ سر جھٹک کر پھر جیولری کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ سماعتوں پر دستک ہونے لگی۔
"اور کبھی جب میں زبردستی خود کو کسی کام میں مصروف رکھتا ہوں تو چوری چوری دیکھتی ہو۔"
"اسٹوپڈ!" وہ دھیرے سے بڑبڑائی پھر جیولری پیک کروا کر دکان سے نکلی ہی تھی کہ شمشیر علی سامنے آ گیا۔
"ہیلو۔۔۔!" اریبہ جواباً" "ہیلو" بھی نہیں کہہ سکی۔ وہ حیران تھی کہ ابھی تو اس کا خیال آیا تھا اور وہ آن موجود ہوا۔
"کیسی ہو۔۔۔ مجھے دیکھ کر حیران ہو رہی ہو؟" شمشیر علی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں۔" اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔
"کیوں؟"
"پلیز! یہاں کھڑے کھڑے سوال' جواب مت شروع کر دو۔ میں وہاں چائے پینے جا رہی ہوں۔ تمہیں پینی ہو تو آ جاؤ۔" وہ کہہ کر اپنے شاپرز سنبھالتی تیز قدموں سے فوڈ کارنر پر آ گئی۔
اور یہ کیسے ممکن تھا کہ شمشیر علی اس کی بات رد کر دیتا۔ وہ نہ کہتی تب بھی اسے آنا ہی تھا۔

"تھینک یو! مجھے بڑا اچھا لگا۔" وہ چائے آرڈر کر کے اس کے سامنے بیٹھتے ہی بولا۔
"تھک گئی۔" وہ اس کی بات ان سنی کر گئی۔
"حیرت ہے۔ میرا مطلب ہے ہمیں نے تو سنا ہے لڑکیاں شاپنگ کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتیں۔ تم اتنی سی شاپنگ سے تھک گئیں؟" شمشیر علی نے اس کے تین چار شاپرز کی طرف اشارہ کیا۔
"سنو! مجھے سکون سے چائے پینے دو۔" اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔ پھر گھونٹ لے کر پوچھنے لگی۔
"تم یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟"
"کچھ نہیں! میری گاڑی یہاں سامنے بند ہو گئی تھی۔ مکینک کے حوالے کر کے خود یہاں چلا آیا۔ شاید اسی طرح تم سے ملاقات ہونی تھی۔" وہ بتا کر مسکرایا۔
"چلو! اب یہاں تک آ ہی گئے ہو تو تاجور کے لیے کچھ لے لو۔" اس نے کہا تو وہ تائیدی انداز میں سرہلا کر بولا۔
"ہاں! سوچ رہا ہوں کیا لوں۔ تم نے کیا لیا ہے؟"
"میں نے یہ ساری شاپنگ اپنی بہن سارہ کے لیے کی ہے۔"
"اچھا! سارہ خود نہیں آئی؟" شمشیر علی نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں! وہ ناراض ہے اور یہ سارے جتن اسے منانے کے ہیں۔" وہ انجانے میں اس مانوس اجنبی کے ساتھ کچھ باتیں شیئر کرنے لگی تھی اور جب وہاں سے اٹھی تو اسے لگا جیسے جانے کب سے نامعلوم شکنجے میں جکڑا اس کا دل آزاد ہو گیا ہو۔
"ٹھیک ہے! شام پھر ملیں گے۔" اسے پتا بھی نہیں چلا، وہ آس کی ڈور خود اس کے ہاتھ میں تھما آئی تھی۔
واپسی میں اسے ہر جگہ ٹریفک جام ملا۔ یوں بمشکل پندرہ منٹ کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ وہ واقعی چکرا گئی تھی۔ جب ہی اسے گیٹ پر کھڑی ایمبولینس نظر نہیں آئی۔ وہ چوکیدار کو متوجہ کرنے کے لیے ہارن بجانا چاہتی تھی کہ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں یاسمین انتہائی پریشانی کے عالم میں گیٹ سے نکل کر ایمبولینس کی طرف بھاگی تھی۔
"ممّا!" وہ پہلے سمجھی نہیں، لیکن جب یاسمین کے بیٹھتے ہی ایمبولینس کو جاتے دیکھا تب وہ بھی پریشان ہو کر گاڑی سے اتری اور پہلے ایمبولینس کے پیچھے بھاگنا چاہا، پھر ایک دم پلٹ کر بھاگتے ہوئے اندر آئی۔
"ممّا... سارہ... سارہ...!" وہ اونچی آواز میں پکار رہی تھی کہ بی بی نے آ کر اس کے کندھے تھام لیے۔
"کیا ہوا ہے بی بی۔ ایمبولینس میں کون گیا ہے؟"
"وہ بیٹا... وہ..." بی بی کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔
"بتائیں بی بی! کیا ہوا ہے؟" اس نے چیخ کر بی بی کو جھنجوڑ ڈالا۔
"وہ بیٹا... سارہ..."
"ہاں سارہ... سارہ کہاں ہے؟" وہ حواس کھونے لگی۔
"سارہ نے اپنی کلائی کی نس کاٹ لی ہے۔" بی بی بتاتے ہوئے رونے لگیں۔
"نہیں۔" اریبہ کو اپنے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو گیا۔ وہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



عتیقہ محمد بیگ



عجیب ہی اس کی شخصیت تھی نام تھا اس کا کلی خان، دیکھنے میں بھی وہ گلاب کی کلی جیسی ہی تھی مگر اس کی باتیں زہر میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
وہ یونیورسٹی میں آئی تو اپنی زبان کی تلخی کی وجہ سے سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ مگر اس نے کسی کو گھاس نہ ڈالی، اپنی تعریف سن کر ساتویں آسمان پر نہ جا بیٹھتی۔ بہت مضبوط ذہن کی مالک تھی یا پھر اسے اتنے ڈسے تھے کہ وہ کسی پر اعتبار نہیں کرتی تھی۔
ایک دن سر مظہر کے لیکچر میں مجھے اس کے ساتھ جگہ مل گئی۔ میرا دل زور سے دھڑکا۔
"میرا نام سعد ہے اور آپ...؟" میں نے پوچھا جبکہ میں اس کا نام جانتا تھا۔
"اچھا تو آپ میرا نام نہیں جانتے؟" وہ ہنسی میں شرمندہ سا ہو گیا اور مزید جھوٹ بولنے کے بجائے میں نے سچ بول دیا۔
"بات شروع کیسے کرتا۔ سوچا جھوٹ کا سہارا لوں... مگر نہیں لے سکا۔"
وہ مسکرائی۔ "شکر ہے... کوئی تو ہے... اس دنیا میں میری طرح کا۔"
میں بھی مسکرا دیا۔ "اس کا مطلب آپ جھوٹ

بولنے والوں کو پسند نہیں کرتیں۔"
اس نے تیکھی نظر مجھ پر ڈالی۔
"یقیناً آپ بھی۔۔۔ اور شاید ہر کوئی یہ ہی کہتا ہے۔۔۔ کہ ہم جھوٹے لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔۔۔ مگر خود بے چارے جھوٹ اور سچ کی پہچان ہی نہیں رکھتے۔"
"کیا بات ہے۔ آپ کو باتوں میں کمال حاصل ہے۔" میں نے فوراً "داد" دی۔
"شکریہ۔۔۔ ویسے میرا نام کلی خان ہے۔"
"جی میں جانتا ہوں آپ کا نام۔۔۔ آپ کی شخصیت کے مطابق ہی ہے۔"
"اچھا۔۔۔ ویسے کلی کے ساتھ بہت سے کانٹے بھی ہوتے ہیں۔۔۔ کہیں آپ کانٹا بننے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟"

اگر آپ اجازت دیں۔۔۔ ویسے کانٹے تو کلی کی حفاظت کے لیے ہوتے ہیں۔"
"ہاہاہا۔۔۔" وہ زور سے ہنس پڑی۔ "میرے خیال میں ایسا نہیں۔۔۔ کانٹے تو کلی کو اس کے حقیقی مالک سے ملنے نہیں دیتے۔"
"یہ بھی درست ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ہم دونوں کی دوستی اچھی رہے گی۔"
"شاید۔۔۔" وہ مسکرائی۔
"تو پھر ایک چائے کا کپ ہو جائے؟"
"نہیں۔۔۔" وہ فوراً بولی۔ "چائے تو میں تب پیتی ہوں جب میں اپنی اماں کی جھڑکیاں کھاتی ہوں۔"
"مطلب؟" میں نے ناسمجھی سے پوچھا۔
"اماں کی جھڑکیوں سے سر میں درد ہو جاتا ہے پھر چائے تو پینی پڑتی ہے نا۔"
"آپ کی اماں جھڑکیاں کیوں دیتی ہیں؟"
"وہی شادی کا رونا۔" اس نے سر جھٹکا اور میں ہنس دیا۔
پھر وہ کینٹین کی طرف میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔
کچھ لڑکوں نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔
"یہ ہمارے معاشرے کا عام چلن بن گیا ہے۔" میں نے خوامخواہ وضاحت دی۔ اس نے لمبی سانس لی اور مسکرائی۔ "آپ کا معاشرہ۔۔۔ بہت چالاک ہے۔" اس نے رائے دی۔
"وہ کیسے؟" میں ہنسا۔
"مرد سو بار غلطی کر کے بھی پاک صاف اور لڑکی اگر کسی سے ہنس کر بھی بات کر لے تو مجرم ٹھہرا دی جاتی ہے۔"
"آپ بھی ایک مرد ہیں۔" وہ مسکرائی۔
"میں حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا۔" میں نے جیسے اقبال جرم کیا۔
"پیسے میں دوں گی۔" وہ چائے پیتے ہوئے بولی۔
"کیوں؟" میں نے اچنبھے سے پوچھا۔
"بس میرے دل نے کہا ہے۔" وہ کندھے اچکا کر بولی۔
"آپ کا دل اور کیا کیا کہتا ہے۔۔۔ کچھ مجھے بھی اپنے دل کی باتیں بتائیں۔"
"کیا بتاؤں۔۔۔ ہر جگہ سے زخمی ہے۔۔۔ جو بات سنیں گے آپ کی آنکھ بھیگ جائے گی۔"
"مگر آپ دیکھنے میں تو ایسی نہیں لگ رہیں۔"
"ہنستا چہرہ تو زمانے کے لیے ہے۔"
"یہ بھی آپ نے خوب کہا۔" میں متاثر ہوا۔
"آپ چائے پئیں۔۔۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔"
میں نے اس کے حکم پر فوراً "گھونٹ" بھرا۔ "تو پھر کچھ بتایئے نا۔" میں نے ایک بار پھر اصرار کیا۔
"ابھی تو دوستی کا آغاز ہوا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب پتا چل جائے گا۔"
"یہ بھی ٹھیک کہا۔"
"اچھا۔۔۔ میں چلتی ہوں۔" اس نے اٹھنے کا اعلان کیا۔
"مجھے گھر جانا ہے۔ برتن دھونے ہیں۔ ورنہ میری بہنیں مجھ میں خوب برسیں گی۔
ورنہ اماں اتنے طعنے دیں گی کہ میرے سر میں درد ہو جائے گا۔"
"ایسا کیوں۔۔۔ آپ تو ان کی بیٹی ہیں۔"
"جب بیٹی کی عمر بڑھتی جا رہی ہو تو وہ گھر کی ملازمہ بن جاتی ہے۔ چھوٹی بہنیں الگ روتی ہیں کہ تمہاری وجہ سے ہماری باری کب آئے گی۔" سنجیدگی سے بات کر کے وہ مسکرانے لگی۔
"ارے نہیں، آپ اپنے گھر والوں کے بارے میں غلط سوچ رہی ہیں۔"
"اچھا۔۔۔ آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ میں غلط سوچ رہی ہوں۔"
"میرا مطلب وہ نہیں تھا۔" میں ہکلا گیا۔
"مجھے دوغلے پن سے سخت نفرت ہے۔" اس نے ایک دم سختی سے کہا۔
"آپ اتنی تلخ، اتنی تیکھی، میرا مطلب۔۔۔" میں ڈرتے ہوئے بولا۔
"مجھے پتا ہے میں بہت بری ہوں۔" اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔
"میں نے ایسا تو نہیں کہا۔" میں شرمندہ سا ہو گیا۔
"میرے اپنے بھائیوں کا بھی میرے بارے میں یہ ہی خیال ہے کہ میں بہت بری ہوں۔ جو ان کی بات نہیں مانتی۔"
"میرے خیال میں وہ معاشرے سے ڈرتے ہیں۔" میں نے غیر شعوری طور پر اس کے بھائیوں کی حمایت کی۔
"کیسا ڈر۔۔۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے کچھ ایسا ویسا کر دیا تو ان کی عزت خاک میں مل جائے گی، جبکہ باہر وہ خود کتنے ہی ایسے کام کرتے ہوں گے جو دوسروں کی عزت کو خاک میں ملا دے۔"
"آپ شادی کر لیں۔۔۔ آپ اتنی خوب صورت ہیں۔" میں نے یک دم بات پلٹ دی۔
"ہاہاہا۔۔۔۔ شادی۔۔۔ ایک جیل سے دوسری جیل۔۔۔ کوئی اچھا مشورہ دیں۔ اسلام میں کہیں بھی شوہر کی ماں کی خدمتیں کرنا نہیں لکھا لیکن آپ کا معاشرہ بہو کو سسرال والوں کا غلام بناتا ہے۔"
"آپ کو اس دنیا میں رہنے کے لیے سب باتوں کے لیے خود کو تبدیل کرنا پڑے گا، اس طرح تو آپ کے لیے جینا مشکل ہو جائے گا۔"
"میں ایسی دنیا میں جینے سے مر جانا بہتر سمجھتی ہوں۔ جہاں انسان، انسان پر حاوی ہو رہا ہے زبان کھلتی ہے تو جھوٹ کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔"
"کلی۔۔۔ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔۔۔ مجھے آپ سے ڈر لگ رہا ہے۔" میں واقعی خوف سا محسوس کرنے لگا۔
"ہاں۔۔۔ اب۔۔۔ آپ بھی مجھے نفسیاتی مریضہ کا لقب دے دیں۔ یہ ہی گفتگو کا اینڈ ہونا تھا۔ مجھے معلوم تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔
"آپ کو کسی بات سے دکھ ہے شاید۔ آپ کی سوچ اتنی منفی کیوں ہے۔" میں اس کے زرد پڑ جانے والے چہرے [illegible] رجھا کر بولا۔
"شاید میرا لڑکی ہونا میرا گناہ ہے۔" وہ اداسی سے بولی۔ "اب میں چلتی ہوں۔" وہ یک دم کھڑی ہو گئی۔
"کیا پھر ملاقات کی امید رکھوں؟" میں نے پُرامید نظروں سے پوچھا۔
"نہیں، کبھی نہیں۔"
"کیوں؟" میں بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"مسٹر سعد! میں ابھی اتنی کمزور نہیں ہوں کہ آپ کی تھوڑی سی دل جوئی سے پگھل جاؤں۔ میری زندگی میں بہت دکھ ہیں اور میں مزید دکھ پالنا نہیں چاہتی۔" اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
"لیکن۔۔۔ میری بات تو سنیے۔" وہ چلنے لگی تو میں نے پکارا۔
"کلی۔۔۔ آپ۔۔۔" میں جو چاہ رہا تھا نہ بول سکا۔
"آپ نے کہا مجھے معاشرے کے مطابق چلنا ہو گا تو یاد رکھیے۔۔۔ معاشرہ اس طرح کی ملاقاتوں کو پسند نہیں کرتا سعد صاحب۔۔۔ اللہ حافظ۔"

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بے زار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت، کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں

کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے
یہاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

انشاء اللہ خان انشا

جو ترے آستاں سے لوٹ آئے
جنتِ دو جہاں سے لوٹ آئے

ماہ و انجم کے ساتھ تھے ہم بھی
مگر ہم درمیاں سے لوٹ آئے

لگ گیا جی قفس میں جن جن کا
بارہا آشیاں سے لوٹ آئے

اب تو کعبے میں روشنی کر دو
اب تو کوئے بتاں سے لوٹ آئے

ہائے جو گردِ راہ ہیں اب تک
وائے جو کارواں سے لوٹ آئے

احسان دانش

راستوں میں اک نگر آباد ہے
اس تصور ہی سے گھر آباد ہے

کیسی کیسی صورتیں گم ہو گئیں
دل کسی صورت مگر آباد ہے

کیسی کیسی محفلیں سونی ہوئیں
پھر بھی دنیا کس قدر آباد ہے

بے خودی رسوا تو کیا کرتی مجھے
مجھ میں کوئی بے خبر آباد ہے

دھوپ بھی سنولا گئی ہے جس جگہ
اس خرابے میں سحر آباد ہے

سحر انصاری



وقت تھمتا نہیں،

لوگ چلتے ہوئے راستوں میں
بچھڑ جاتے ہیں
اور بچھڑتے سمے کے لگے گھاؤ بھر جاتے ہیں
سانحہ چاہے جیسا بھی ہو
کوئی صدیوں کی دوری جگا کر چلا جائے
یا پاس ہو
وقت رکتا نہیں
وقت کی آنکھ میں نقش کوئی بھی جمتا نہیں
وقت تھمتا نہیں

ارشد ملک

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے نزدیک سب سے زیادہ "قابل رشک" وہ مومن ہے جو ہلکا پھلکا (کم آمدنی والا) ہو۔ اسے نماز سے وافر حصہ ملا ہو۔ (نفلی نماز اور تہجد زیادہ پڑھتا ہو) لوگوں میں گمنام ہو۔ اس کی پروا نہ کی جاتی ہو، اسے ضرورت کے مطابق رزق میسر ہو۔ (اتنا زیادہ رزق نہ ہو کہ بچا کر رکھا جائے) وہ اس پر صبر کرے (مزید کا لالچ نہ کرے) اسے جلدی موت آجائے۔ اس کا ترکہ تھوڑا ہو اور اسے رونے والیاں بھی کم ہوں۔

اہم معلومات،

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کا نام عبدالمطلب، دادی کا نام فاطمہ بنت عمرو بن عائذ، نانی کا نام برہ بنت عبدالعزیٰ اور نانا کا وہب تھا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کا نام عبداللہ اور والدہ کا نام آمنہ تھا۔

شمائلہ۔ الہ آباد

حسن اخلاق،

حضرت علیؓ سے پوچھا گیا۔ انسان میں کتنے عیب ہوتے ہیں۔ جواب ملا بے شمار لیکن ایک خوبی سب پر پردہ ڈال دیتی ہے اور وہ ہے حسن اخلاق۔

اقرا اکرم، نفیسہ اکرم۔ سیالکوٹ

لاجواب یادداشت،

امام زہریؒ بہت بڑے محدث اور فقیہ گزرے ہیں۔ ان کی قوت یادداشت غضب کی تھی۔ ایک بار بنوامیہ کے فرماں روا ہشام بن عبدالملک نے امام زہریؒ سے درخواست کی کہ "میرے لڑکوں کے لیے کچھ احادیث لکھوا دیجیے۔"

امام صاحبؒ نے کاتب کو چار سو حدیثیں لکھوائیں اور ہشام کو بھجوا دیں۔

چند دن بعد ہشام نے ازراہ امتحان امام زہریؒ سے کہا کہ "وہ آپ کی چار سو حدیثوں والی کتاب کہیں گم ہو گئی ہے۔"

امام صاحب نے فرمایا "کوئی مضائقہ نہیں۔" اور پھر کاتب کو بلا کر وہی چار سو احادیث لکھوا دیں۔ ہشام دوسری کتاب کے ملنے پر پہلی کتاب نکال لایا اور دونوں کا مقابلہ کیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دونوں کتابوں کی لکھی ہوئی احادیث میں ایک حرف کا بھی فرق نہیں تھا۔

(خوبصورت کتابیں۔ صمد آصف یوسف زئی)

سندھو اجن۔ سانگھڑ

تشخیص،

"ڈاکٹر صاحب!" بیگم حامد نے کہا۔ "براہ کرم مجھے بتائیے کہ میں کس مرض میں مبتلا ہوں۔ آخر مجھے تکلیف کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے سرتاپا مریضہ کو دیکھا اور بولے۔ "محترم خاتون! آپ بیک وقت تین امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض یہ ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ بھاری بھرکم ہیں۔ آپ کے موٹاپے کا علاج ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ آپ کے دانت دیکھ بھال نہ ہونے کے سبب انتہائی بدنما نظر آتے ہیں۔ ان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آپ کا تیسرا اور سب سے خطرناک مرض نظر کی کمزوری ہے۔ آپ کو اپنی آنکھوں کے لیے نظر کے کسی اچھے چشمے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ میرے دفتر کے باہر آویزاں میرے نام کی پلیٹ پڑھتیں تو آپ کو بخوبی علم ہو جاتا کہ میں پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہوں اور مقامی یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔"

نمرہ، اقرا۔ کراچی

آرزو،

کہتے ہیں کہ خلیفہ عبدالملک نے وفات کے وقت اپنے محل کی کھڑکی سے ایک دھوبی کو کپڑے دھوتے دیکھا تو اس نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

"کاش میں اس دھوبی کی طرح ہوتا کہ اپنی محنت کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتا۔ کاش میں خلیفہ نہ ہوتا۔"

ابوحازم نے یہ قول سنا تو کہنے لگے۔

"الحمدللہ یہ لوگ موت کے وقت اس بات کی تمنا کرتے ہیں جو ہمیں حاصل ہے لیکن ہم موت کے وقت ان کی حالت کی آرزو نہیں کرتے۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

سوال سے پہلے دینا،

حضرت سعید بن العاصؓ نے وفات کے وقت اپنی اولاد سے کہا۔

"میری وصیت کون قبول کرے گا؟"

بڑے بیٹے نے کہا۔ "میں۔"

کہنے لگے۔ "میرا قرضہ ادا کرنا ہوگا۔"

پوچھا۔ "کتنا ہے؟"

کہا۔ "اسی ہزار درہم۔"

پوچھا۔ "کیوں لیا تھا؟"

جواب دیا۔ "دو قسموں کے آدمیوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے۔ شریف النفس عزیزوں کی اور حیا سے سوال نہ کر سکنے والوں کی۔ جو مجبور ہو کر آتے تھے مگر شرم سے مانگ نہ سکتے تھے۔ فرط حیا سے چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔ میں سوال کرنے سے پہلے ہی انہیں دے دیتا تھا۔"

قابل دید،

ایک چیف کانسٹیبل ماہر حیوانیات بھی تھے۔ ایک دن ان کے گھر فون آیا۔ جوان کی بیوی نے ریسیو کیا۔ ایک صاحب نے پریشان سے لہجے میں پوچھا۔

"کیا ڈاکٹر صاحب کا گھر یہی ہے؟"

"جی ہاں! آپ کو جانوروں کے ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کی مدد درکار ہے یا بطور پولیس آفیسر۔۔۔؟"

"دونوں حیثیتوں سے۔۔۔!" جواب ملا۔ "ہمارا کتا منہ نہیں کھول رہا ہے کیونکہ اس کے منہ میں ایک ڈاکو کی ٹانگ ہے۔"

عائشہ، تحریم۔ گوجرہ

اقوال زریں،

- عالم سے ایک گھنٹے کی گفتگو دس برس کے مطالعہ سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔
(اقوال بطلیموس)
- تاریخ کی اکثر ایسی کتابوں کا ملنا جن پر جھوٹ کے حاشیے نہیں چڑھائے گئے، بے حد مشکل ہے۔
(سنتایانا)
- خاموشی دانش مندی کی علامت ہے تو سہی لیکن کبھی کبھی اس سے حماقت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔
(ولیم کورج)
- تنگ نظر وہ ہے جسے دو برائیوں میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑے تو وہ دونوں کو اختیار کر لیتا ہے۔
(بقراط)
- خوشامدی شخص تمہاری برائیوں اور بھلائیوں دونوں کو پسندیدہ بتلائے گا۔
(خلیفہ مامون الرشید)

نائلہ، شمائلہ۔ الہ آباد

اچھی بات،

دو قسم کے لوگوں سے ہمیشہ بچ کر رہو۔ ایک معروف اور دوسرے مغرور۔ کیونکہ مغرور لوگ اپنی مرضی سے اور معروف لوگ اپنے مطلب سے ملتے ہیں۔

حافظ سمیرا۔ 157- این بی

پھل دار درخت،

پھل نہ درخت کے ڈالے کو لگتا ہے نہ اس کے مضبوط تنے کو۔ پھل جب بھی لگتا ہے، لرزنے والی شاخ کو لگتا ہے اور جہاں بھی لگتا ہے کانپتی ہوئی ڈالی کو لگتا ہے۔ جس قدر شاخ رکوع میں جانے والی ہوگی، اسی قدر پھل کی زیادہ حامل ہوگی۔ فائدہ درخت کو اس کا یہ ہے کہ پھل کی وجہ سے ڈالا بھی کلہاڑے سے محفوظ رہتا ہے اور تنا بھی۔

درخت کی بھی عزت ہوتی ہے اور درخت کی وجہ سے سارا باغ عزت دار بن جاتا ہے۔

(اشفاق احمد۔ زاویہ)

استدعا،

ایک نوجوان نے جس پر ایک رئیس زادے کا بٹوا اڑانے کا الزام تھا۔ جج کے سامنے اقرار کیا۔

"میں مجرم ہوں مجھے سزا دیجیے اور اس کے ساتھ بیوی سے بھی طلاق دلوا دیجیے۔"

جج نے حیرت سے پوچھا۔ "مگر طلاق کیوں؟"

نوجوان نے جواب دیا۔ "جب میں نے اس رئیس زادے کا بٹوا کھولا تو اس میں سے کچھ برآمد ہوا۔ میری بیوی کی تصویر کے سوا۔"

ندا، فضہ۔ کراچی

خیال رکھنا،

زندگی میں دو لوگوں کا بہت خیال رکھنا۔

1۔ وہ جس نے تمہاری جیت کے لیے سب کچھ ہارا ہو۔ (تمہارا باپ)

2۔ جس کی دعاؤں سے تم نے سب کچھ جیتا ہو۔ (تمہاری ماں)

عذرا ناصر۔ کراچی

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

٭ دنیا میں وہی لوگ سربلند رہتے ہیں جو تکبر کے تاج کو دور پھینک دیتے ہیں۔ اگر انسان رنج یا مسرت کی فکر سے بلند ہو جائے تو آسمان کی بلندی بھی اس کے قدموں کے نیچے آجائے گی۔

(شیخ سعدی)

٭ کنول کا پھول تالاب میں کھلا ہو تو سب کو خوشنما لگتا ہے۔ کنارے پر کھڑے لوگ اسے سراہتے ہیں لیکن گندگی میں جا کر اسے توڑنے کا حوصلہ ہر کسی میں نہیں ہوتا۔

(ڈاکٹر ڈیوڈ اس)

٭ خود غرض لوگ انڈوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں اپنے علاوہ کسی دوسرے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

(بلنگز)

٭ سیدھی اور صاف بات کہنے سے نقصان بہت معمولی مگر فائدہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

(لارڈ میکالے)

شبنم شمشاد۔ یزمان

نئی نسل،

ایک نوجوان اپنے والد کے ساتھ کار میں کہیں جا رہا تھا۔ والد کار چلا رہے تھے، اس لیے کار بالکل آہستہ چل رہی تھی۔ والد اپنے بیٹے کو آج کل کے نوجوانوں کی خامیوں اور لاپروائیوں سے آگاہ کر رہے تھے کہ وہ کس قدر تیز رفتاری سے موٹر سائیکل اور کاریں چلاتے ہیں۔ اتنے میں اچانک ایک بچہ سائیکل چلاتے ہوئے کار کے سامنے آگیا۔ کار چونکہ کم رفتار تھی، اس لیے والد نے آسانی سے بریک لگا دیے اور بچہ کار کی زد میں آنے سے بچ گیا۔

والد نے اپنی نصیحتوں کے ثبوت میں بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھا تم نے... یہ تو میں کار چلا رہا تھا اور وہ آہستہ تھی لہٰذا حادثہ نہیں ہوا، اگر میری جگہ کار تم چلا رہے ہوتے تو یقیناً بچے کو روندتے ہوئے گزر جاتے۔"

"ڈیڈ! اگر میں کار چلا رہا ہوتا تو ایک گھنٹہ پہلے اس جگہ سے گزر چکا ہوتا۔" بیٹے نے اطمینان سے جواب دیا۔

صدف عمران۔ کے ڈی اے



خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

رضوانہ ناز ہنجرا ——— گگھر منڈی

میں اک عام سی لڑکی
میری اک عام سی خواہش
آنگن میں ہو اک پیڑ
اور پیڑ پر رم جھم بارش

کرن ——— شجاع آباد

اپنے ہی ہوتے ہیں جو دل پہ وار کرتے ہیں محسن
غیروں کو کیا خبر دل کس بات پہ دکھتا ہے

شہلا شہزادی ——— چوک جمال خانیوال

یہ کیا ہوا کہ بھرے آسمان کے آنگن میں
بچھڑ گیا وہ ستارہ جو ہمارے نام کا تھا
بڑھا گئے اس سے راہ و رسم یہ سوچتے ہیں
وہی بہت تھا رشتہ جو دعا سلام کا تھا

شائلہ عنایت چغتائی ——— بلڈ ٹاؤن

سوچا کیے کہ ٹوٹ نہ جائے کسی کا دل
گزری ہے اپنی عمر اسی دیکھ بھال میں
خالد وہ بات تو اسے اب یاد بھی نہیں
ہم جی کو خون کر گئے جس کے ملال میں

شافیہ اسلم ——— ہری پور

کیوں کچھ سوچ کر میں اپنا دل چھوٹا کروں وصی
وہ اتنی ہی کر سکا وفا، جتنی اس کی اوقات تھی

عفت جبیں ——— فیصل آباد

آئینہ دیکھ کے خوش ہیں میری آنکھیں بے حد
کہ میرے چہرے میں شباہت میری ماں کی ہے

مسرت الطاف احمد ——— کراچی

میرے دشمن بھی مجھے ہنستا ہوا چھوڑ گئے!
کہنے لگے تیرے اپنے ہی کافی ہیں تجھے رلانے کے لیے

نائلہ، شمائلہ ——— الہ آباد

یقین اس کو نہیں آتا، وضاحت میں نہیں کرتا
گزر جائے گی ساری عمر، شاید امتحانوں میں

امبر گل ——— جھڈو (سندھ)

ہمیشہ حلقۂ نامہرباں میں رہتے ہیں
جو حق پہ ہوتے ہیں وہ امتحاں میں رہتے ہیں
حسد کی آگ سے کس کس کا گھر جلاؤ گے
کہ اہل عشق تو سارے جہان میں رہتے ہیں

سندھو اجن ——— سانگھڑ

زیست میں جب شام غم ٹھہر گئی ہے
بہت دور کہیں اندیشۂ دل بکھر گئی ہے
اے زندگی! اب بھی ہم تنہا ہیں تو کیا ہوا
کچھ اور گزر جائے گی، کچھ تو گزر گئی ہے

صفیہ عباس خان ——— کروڑ لعل عیسن ضلع لیہ

نہیں تھا زور اس کی ستم نوازیوں کا
مجھے بھی حوصلے میرے خدا سے ملے
میری انا کیوں کہتی ہے بار بار مجھے
وہ محبت ہی کیسی جو التجا سے ملے

یاسمین کنول ——— پسرور

کیا ہوا اگر دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے
یہ تو تسلی ہوئی کہ چہرے کی پہچان ابھی باقی ہے

صفیہ کوکب گوندل ——— اسلام آباد

کیوں عزیزوں سے کھیلتی ہے رات
روز اک چاند بیلتی ہے رات
شمعیں ساری بجھا کے جاتی ہے
گھر کا معمول جانتی ہے رات

ایمن ——— ہری پور ہزارہ

ہجوم میں تھا وہ شخص کھل کر نہ رو سکا ہو گا
مگر یقین ہے کہ شب بھر نہ سو سکا ہو گا
وہ شخص جس کو سمجھنے میں مجھ کو عمر لگی
بچھڑ کر مجھ سے کسی کا نہ ہو سکا ہو گا

نعمانہ بٹ ——— لاہور

سچ کہوں مجھ کو یہ عنوان برا لگتا ہے
ظلم سہتا ہوا انسان برا لگتا ہے
کس قدر مصروف ہو گئی یہ دنیا اپنی
ایک دن ٹھہرے تو مہمان برا لگتا ہے

طاہرہ ملک ——— پسرور

آئینے میں شاید کوئی بال آ گیا
پہلا سا آپ کی بات کا لہجہ نہیں رہا
تو نہ رہا تو درد کو ساتھی بنا لیا
میں تجھ سے دور رہ کر بھی تنہا نہیں رہا

نوال افضل گھمن ——— گجرات

مستقل بولتا ہی رہتا ہوں
کتنا خاموش ہوں میں اندر سے

حنا سلیم اعوان ——— آخون باندی

اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں تیرا پیماں جاناں
ہم کہ روٹھی ہوئی رت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسم ہجراں جاناں

عنبر نوشین ——— گوجرانوالہ

اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں
تیرے فراق کے دکھ یاد آنے لگتے ہیں
پلک جھپکتے ہی دنیا اجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں

فوقیہ رباب ——— بورے والا

پھر تجھ پر یقین کر رہے ہیں
وہ دل جو ہزار بار ٹوٹے

مہوش ڈوگر ——— گوجرانوالہ

تو مرا حوصلہ تو دیکھ داد تو دے کہ اب مجھے
شوق کمال بھی نہیں، خوف زوال بھی نہیں

یاسمین کنول ——— پسرور

تیرے بغیر جس میں گزاری تھی ساری عمر
تجھ سے جب آئے مل کے تو وہ گھر ہی اور تھا

انیقہ ثنا ——— چکوال

جواز رکھتا ہے ہر ایک اپنے ہونے کا
یہاں پہ جو ہے کسی سلسلے میں آیا ہے
جمال دیکھ کے جیتا تھا جو کبھی تجھ کو
کہیں وہ شخص بھی کیا دیکھنے میں آیا ہے

مسز فصیحہ آصف خان ——— ملتان

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں، سورج کو دکھاتے ہیں چراغ
اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

فوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

سپردگی شاخ گل کی، وحشت غزال کی ہو
جو اس طرح ہو تو دوستی پھر کمال کی ہو
کوئی تو ہو جس پر اس کا گمان گزرے
کہیں کہیں تو مشابہت خدوخال کی ہو

انیلا کرن ——— بہاول پور

کس کو گماں ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے
ہائے وہ روز و شب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے
اب خواب ہو گئی ہے رہ و رسم دوستی
اک وہم سا ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

شازیہ بٹ ——— لاہور

انکار نہ اقرار بڑی دیر سے چپ ہیں
کیا بات ہے سرکار بڑی دیر سے چپ ہیں
اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چپ ہیں

سمیرا ملک ——— ٹوبہ ٹیک سنگھ

کبھی یوں بھی تھا کہ ہزار تیر جگر میں تھے تو دکھی نہ تھے
مگر اب یہ ہے کسی مہرباں کے تپاک نے بھی رلا دیا



امت الصبور

خاموشی کی ڈائری

سورٹھ ساند — کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر منیر نیازی کی یہ نظم نئے سال پر آپ سب بہنوں کی نذر۔

نیا سال،

نیا سال آیا ہے
ویران صبحوں کی نیلی تہوں سے ابھرتا
خیابان دشت و جبل کی ٹھٹھرتی خموشی میں
بر فیلی سیٹی بجاتے
دبے پاؤں
یخ آلود شاموں کی خوشیاں
اس کے قدموں کی آہٹ سمیٹے
گزرگاہوں پر سائبانوں میں نوحہ کناں ہے
در آتی ہے شب کو دریچوں درزوں سے
پرشور جھونکوں کی بے مہر ٹھنڈک
برودت زدہ پانیوں پر پرندے
کناروں پر ایستادہ پیڑوں کی نمناک شاخوں کی
جانب اڑے جا رہے ہیں
مکین آنگنوں میں چھتوں پر
دھڑکتے دلوں میں ہزاروں خیالوں کی
شمعیں جلائے
دبے پاؤں آتے ہوئے سالوں کو دیکھتے ہیں

قرۃ العین — کی ڈائری سے

کسی لمحہ میں، کسی چھوٹے سے پل میں، کسی چھوٹی سی بات، کسی دور بستی ہستی کی "محبت" سے ایک نئی زندگی ہمارے اندر اچانک ہی نمو پانے لگتی ہے۔
اور ہم حیران و پریشان رہ جاتے ہیں کہ کیا ایک وجود میں، کوئی دوسرا جہان بھی چپکے سے آباد ہو سکتا ہے وہ خواب بھی اپنے ہوتے ہیں وہ الفاظ بھی۔ کچھ ہوتے ہیں ایسے ہی دل کے پراسرار مکین۔ امجد اسلام امجد کی یہ خوبصورت نظم، ایسی ہی زندگی جینے والوں کے نام۔

جو بات نہیں کرتے
ان بولتے رنگوں میں
میں نے تمہیں سوچا ہے

جو دل سے گزرتے ہیں
ان اجنبی رستوں میں
میں نے تمہیں دیکھا ہے

کہنے کے لیے تم سے
باتیں تو بہت سی ہیں
الفاظ نہیں ملتے
جو میری نظر میں ہیں
اس شہر کے باغوں میں
وہ پھول نہیں کھلتے

میں نے تمہیں جانا ہے
اظہار کے رشتوں سے
اس طرح جدا ہو کے
جس طرح کوئی بندہ
دھرتی پہ نظر ڈالے
اک بار خلا ہو کے

عائشہ ارما کی ڈائری سے

بعض اوقات ہم بہت تنہا اور اُداس ہوتے ہیں اداسی کی یہ کیفیت اس غزل میں لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔ اُداسی اور تنہائی کے شاعر ناصر کاظمی کی ایک خوبصورت غزل آپ کے لیے۔

مسلسل بے کلی دل کو رہی ہے
مگر جینے کی صورت تو رہی ہے

میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا
یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے

چلے دل سے اُمیدوں کے مسافر
یہ نگری آج خالی ہو رہی ہے

نہ سمجھو تم اسے شورِ بہاراں
خزاں پتوں میں چھپ کر رو رہی ہے

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

سلمیٰ عفت کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر منور جمیل کی غزل سب قارئین بہنوں کی نذر۔

کئی دن سے اک آواز مجھ میں گونجتی نہیں
کئی دِنوں سے کوئی مجھ میں رت جگا نہ ہوا

کئی دِنوں سے سماعت کی رہگزاروں پر
نہ کوئی چاند ہی اُترا نہ کوئی پھول کِھلا

کئی دِنوں سے یہ آنکھیں ہیں نیند سے بوجھل
کئی دِنوں سے ہیں بے نور درد کے چاغل

کئی دِنوں سے یہ دن مجھ میں آکے ڈھلتا ہے
کئی دِنوں سے کسی وسوسے کی زد میں ہوں

کئی دِنوں سے خیالوں کے طاقِ ہجراں پر
کسی کے نام کا رکھا دیا جلاتا ہوں

کئی دِنوں سے یہ کارِ عشق جاری ہے
کئی دِنوں سے عجب دل کو بے قراری ہے

ارم کمال کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر کیفی اعظمی کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے نام۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین، نیا آسماں نہیں ملتا

نئی زمین، نیا آسماں مل بھی جائے
نئے سفر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

وہ تیغ مل گئی جس سے ہوا ہے قتل میرا
کسی کے ہاتھ کا اس پہ نشاں نہیں ملتا

وہ میرا گاؤں ہے وہ میرے گاؤں کے چولہے
کہ جن میں شعلے تو شعلے، دھواں نہیں ملتا

کھڑا ہوں کب سے میں چہروں کے اک جنگل میں
تمہارے چہرے کا کچھ بھی پتا نہیں چلتا



روشن حرف وہ سارے

آنسہ مقدسہ

1 ۔ ابھی کچھ زیادہ دن تو نہیں گزرے یہی دو چار سال پہلے کی بات ہے، زندگی بہت رواں دواں تھی۔ گرمیوں کی لمبی دوپہریں اور سردیوں کی ٹھٹھرتی راتیں ہمارے دم سے آباد رہتی تھیں۔ ہر دم قہقہے گونجا کرتے تھے اور جو کوئی کسی کو اداس دیکھ لیتے تو فوراً" کہتے تھے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اور پھر وقت کا ظالم پنجہ ہم سب کو جدا کر گیا۔ اکثریت کی شادیاں اور پھر گھرداریاں اور اب ہم کہتے پھرتے ہیں۔

منیر اب بھی مان لے تو مقدر کی حقیقت کو
جو ہے وہ بھی ضروری ہے، جو تھا وہ بھی ضروری تھا

2 ۔ کبھی وقت تھا شاعری ہمارے ہر قدم پہ ساتھ ساتھ ہوا کرتی تھی اور اب دل ڈھونڈتا ہے فرصتیں وہی۔ بہرحال محسن نقوی کے ساتھ تعارف ان کی مشہور غزل کے ساتھ ہوا۔

وہ روٹھا تو شہر خواب کو غارت بھی کر گیا
پھر مسکرا کے تازہ شرارت بھی کر گیا

یہ دل اس سے بچھڑتا نہ تھا اک گھڑی
آج اس کو بھولنے کی جسارت بھی کر گیا

3 ۔ جناب! یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ کوئی ہمیں دیکھ کر بے ساختہ شعر پڑھتا۔

البتہ شادی کی رات ہمارے شوہر نامدار نے شعر سننے کی فرمائش ضرور کی تھی، جو کہ ہم پوری نہیں کر سکے تھے۔

4 ۔ غلام علی کی آواز میں غزل جو ہمیں اتنی پسند ہے کہ جہاں کہیں سنیں، سر بے اختیار دھننے لگتے ہیں اور اسری رحمٰن کی طرف جب بھی جاؤں تو اسے کہتی ہوں۔ "پلیز! غلام علی کو لگا دو" اور وہ فوراً" سمجھ جاتی ہے کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔

ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح
صرف اک بار ملاقات کا موقع دے دے

میری منزل ہے کہاں، میرا ٹھکانہ ہے کہاں
صبح تک تجھ سے بچھڑ کر مجھے جانا ہے کہاں
سوچنے کے لیے اک رات کا موقع دے دے
ہم تیرے شہر۔۔۔

اپنی آنکھوں میں چھپا رکھے ہیں جگنو میں نے
اپنی پلکوں پہ سجا رکھے ہیں آنسو میں نے
میری آنکھوں کو بھی برسات دیکھنے کا موقع دے دے
ہم تیرے شہر۔۔۔

آج کی رات میرا درد محبت سن لے
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی شکایت سن لے
بھولنا ہی تھا تو اقرار کیا ہی کیوں تھا
بے وفا تو نے مجھے پیار کیا ہی کیوں تھا
صرف دو چار سوالات کا موقع دے دے
ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح

5 ۔ کلاسک شاعری میں میرا انتخاب مرزا اسد اللہ خان غالب کی یہ غزل۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصت کاروبار شوق کسے
ذوق نظارہ جمال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

میری خامشی کو بیاں ملے

اِدارہ

گل پری مرزا لاہور

بسم اللہ سے ابتدا ہے میری
سدا سب خوش رہیں یہ دعا ہے میری

آپ سب کی جانی پہچانی گل پری مرزا حاضر خدمت ہے۔ تعلق لاہور سے ہے۔ پیچھے سے افغانستان کے رہنے والے ہیں۔ لیکن دل وجان سے لاہور کو چاہتے ہیں کیونکہ "لور لورا ہے۔" تعلیم

کاش! ہم بھی پڑھے لکھے ہوتے
تمہیں لکھتے جان جاں "تعلیم" کی داستاں

حافظ قرآن ہوں۔ تعلیم واجبی سی ہے، لیکن کوئی نہیں پہچان سکتا کہ ما بدولت کتنا پڑھے ہوئے ہیں۔

ابھی پچھلے دنوں میں نے ایک پڑھی لکھی اور نائس فیملی کو خط لکھا۔ آپ یقین کریں کہ ان کے یہ الفاظ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں کہ "گل پری اتنا اچھا خط لکھا ہے کہ میں نے تین بار پڑھا اور دوسروں کو بھی پڑھایا ہے۔ ہم نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا کر اتنا اچھا لکھنا نہیں سیکھا اور تم، مجھے حیرت ہے کہ تم نے اتنا اچھا لکھنا کہاں سے سیکھا" اب ڈیئر قارئین! آپ تو جانتے ہیں نا کہ کہاں سے سیکھا ہے؟ خواتین اور شعاع زندہ باد۔ آگے کے ارادے ہیں شادی کرنا۔ ارے، ارے! حیران مت ہوں۔ واقعی جنوری یا فروری میں میری شادی خانہ آبادی ہے ان شاء اللہ۔ مشاغل میں خواتین اور شعاع پڑھنا اور اپنی ڈائری لکھنا شامل ہیں۔

(2) خامیاں

کبھی ہم بھیگتے ہیں چاہتوں کی تیز بارش میں
کبھی برسوں نہیں ملتے کسی ہلکی سی رنجش میں

خوبیاں

ہم خوشبو کے سوداگر ہیں اور سچا سودا کرتے ہیں
جو گاہک پھولوں جیسا ہو بن داموں ہی بک جاتے ہیں
ہم شہر وفا کے لوگوں کا تم حال بھلا کیا جانو گے
ہم دل کی بات چھپاتے ہیں اور آنسو بھی پی جاتے ہیں

(3) خواتین ڈائجسٹ سے میرا تعلق بہت ہی پرانا ہے۔ اتنا پرانا کہ مجھے تھوڑا، تھوڑا یاد ہے کہ میں اپنے دادا جی کے کمرے میں پسینے سے شرابور ہو کر کہانیاں پڑھا کرتی تھی یہ الگ بات ہے کہ مجھے سمجھ میں آتی تھیں یا نہیں لیکن "میرے خواب ریزہ ریزہ" میں نے اپنے شعور میں پڑھی تھی اور لاسٹ قسط جب پڑھی تو آپ یقین جانیں میرا سارا دن روتے ہوئے گزرا تھا۔ جب گھر والوں کو پتا چلا تو سب نے خوب مذاق اڑایا کہ گل پری کی ہیروئن مر گئی ہے افسوس۔

پہلے رسالہ میری بہن "ندیا باجی" کسی سے منگوا کر پڑھتی تھیں اور باقاعدہ اس پر کور چڑھا کر جیسے کہ یہ کوئی بڑی ہی مقدس اور نایاب کتاب ہے۔ لیکن مجھ سے انتظار کی سولی پر لٹکا نہیں جاتا۔ اس لیے اپنا رسالہ منگواتی ہوں۔

اچھا! اب آپ کو ایک دلچسپ بات بتاتی ہوں۔ میری عادت ہے کہ جب بھی کوئی اچھی اسٹوری پڑھوں اسے کسی نہ کسی سے ضرور ڈسکس کرتی ہوں اکثر اپنی بہن گل بینا باجی سے یا کسی اور کو سنا کر اس پر تبصرہ کرتی ہوں۔ پہلے پہل جب بھابھی کی نئی، نئی شادی ہوئی تھی۔ میں اسے دل لگا کر پوری کہانی سناتی تو وہ بڑی خاموشی سے پوری کہانی سن کر کہتی۔

"گل پری! اس میں ہیروئن کون سی تھی" دھت تیرے کی، ساری رات کہانی سنی، صبح پوچھا لکھا عورت تھی یا مرد۔ مجھے بچپن ہی سے رائٹر بننے کا بے حد شوق ہے۔ بچوں کے لیے طبع آزمائی کی تو کامیاب ٹھہری۔ لیکن جب خواتین اور شعاع کے لیے تحریر لکھی تو... تو اے رسالے والو!

یہی نہیں کہ بس اپنا حساب دینا ہے
میری کہانیوں کے حشروں کا بھی جواب دینا ہے

ہائے اللہ! رسالوں میں مصنفین کے ناموں کی لسٹ دیکھتی ہوں تو دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ یا اللہ! رسالوں پر کبھی مصنفین کے ناموں کی طرح جگمگائیں ہم۔ قارئین اچھے لفظوں میں یاد کریں۔ کوئی ایسا افسانہ لکھ جائیں ہم لیکن... ان شاء اللہ کبھی نہ کبھی تو ضرور کامیابی نصیب ہوگی۔

نور حق شمع الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون
جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون

ابھی تو فی الحال مجھے اتنی فرصت نہیں مل رہی کیونکہ۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

(4) سالگرہ۔ اپنی پیدائش کے متعلق جب بھی امی سے پوچھا تو جواب اس طرح کا ملتا ہے۔ "آلو کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی اور مٹروں کی پکچی تھی۔" "لو کر لو گل اور منالو سالگرہ۔ البتہ۔

جو بات بتا نہیں سکتی اسے میں فرض کرتی ہوں
چلو میں فرض کرتی ہوں ابھی میں پندرہ سال کی ہوں

ہاہ، ہاہ، ہاہ۔

(5) میں اپنا پسندیدہ شعر بھی سناؤں گی۔ اقتباس بھی اور لطیفہ بھی۔ اب حاضر خدمت ہوں، کچھ تو سیوا کرنے دیں۔

پسندیدہ اقتباس۔ "اپنی اہمیت جتانے کے لیے کسی سے دور ہونا تو ضروری ہے، لیکن اس قدر نہیں کہ وہ آپ کے بغیر جینا سیکھ لے۔"

پسندیدہ لطیفہ۔ وہ رات کو اس سے ملنے چھت پر گئی تو اس نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا کہ "جاناں! تمہارے ہاتھ بہت گرم ہیں اور پتا ہے گرم ہاتھ وفا کی علامت ہوتے ہیں۔"

اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "ایک سو دو بخار ہے مجھے... اڑا تو وصی شاہ۔"

پسندیدہ شعر۔

قاصد پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل
فقط کہنا یہ ان سے، آنکھیں ترس گئیں

آپ کو میرا یہ تعارف کیسا لگا؟ ضرور آگاہ کیجیے گا۔

☼

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی.
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com



فریحہ شبیر ۔۔۔ شاہ نکڈر سرگودھا

ویسے تو خواتین 'شعاع اور میرا ساتھ تین ' چار سال پرانا ہے مگر باقاعدگی سے پڑھنا ایک سال پہلے شروع کیا۔ جب فرحت اشتیاق کا "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" کی دوسری یا شاید تیسری قسط تھی۔ مجھے اتنی پسند آئی کہ پچھلی اقساط تو پڑھیں ہی ساتھ اگلے شمارے سے خود خریدنا اور اسے سنبھال سنبھال کر رکھنا شروع کردیا۔

بات کروں گی نئے سال کے پہلے شمارے کی تو سب سے پہلے ٹائٹل 'مختلف رنگوں کے پھولوں سے سجا (جو بالوں میں لگے تھے) ایک دلی خوشی سے ہمکنار کر گیا۔ "کہنی سنی" اور کرن کرن روشنی سے مستفید ہونے کے بعد انشاء جی کو پڑھا۔ "نئے سال کی دہلیز پر" سب کے جوابات اچھے لگے۔

عنیزہ سید "جو رکے تو" کو رکنے نہیں دے رہیں بلکہ بہت خوش اسلوبی سے لیے رواں دواں ہیں۔ بہت خوب! "میرے خواب لوٹا دو" نگہت جی بہت زبردست لکھ رہی ہیں۔

"زمین کے آنسو" نگہت سیما (مائی فیورٹ) اس قسط نے بہت رلایا اور بہت کچھ سوچنے پر 'کھوجنے پر مجبور کیا۔ ہر کردار ہی زبردست ہے 'کچھ سکھاتا ہوا' کچھ سمجھاتا ہوا سا ویلڈن نگہت جی۔ "تیرے میرے درمیان" مہوش افتخار کی بہت اچھی تحریر تھی۔ ہمیشہ کی طرح اچھا لگا پڑھ کر مکمل ناول "برف کا موسم" سائرہ رضا 'جب لکھا خوب لکھا۔ اس تحریر نے ہنسایا بھی اور رلایا بھی 'ہمت بھی دلائی اور حوصلہ بھی اگرچہ یہ تحریر میری بہن (مونا) کو کچھ خاص پسند نہیں آئی مگر مجھ سے پوچھیں تو مجھے یہ بہت ہی انوکھی اور خاص لگی۔ افسانے سارے ہی اچھے لگے اور ناولٹ "ہم سے ہے زمانہ" کی تو کیا ہی بات 'ہنسی 'لڑائی 'ڈانٹ ڈپٹ اور طنز و مزاح سے بھرپور تحریر مزا دے گئی۔ نمرہ بخاری کی تو کیا ہی بات ہے 'ہم سب اسی انداز تحریر کے تو دیوانے ہیں "نیلم منیر" اور "بجل علی" سے ملاقات اچھی لگی کیونکہ نیلم تو میری بھی فیورٹ ہے۔

ج: فریحہ! آپ کا طویل خط پڑھا قدر دانی اور محبت کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ اللہ تعالیٰ خواتین اور شعاع سے آپ کا تعلق ہمیشہ برقرار رکھے۔ آمین

متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ "برف کا موسم" آپ کی بہن کو متاثر نہ کرسکا۔ ان سے کہیں کہ ہمیشہ علیحدہ خط لکھ کر تفصیل سے اپنی پسند ناپسند کے بارے میں بتائیں۔ خط کے لیے علیحدہ لفافے کی ضرورت نہیں 'وہ آپ کے لفافے میں خط لکھ کر ڈال سکتی ہیں۔

رابیل سعید ۔۔۔ نامعلوم شہر

میں پندرہ سال کی عمر سے شعاع اور خواتین کی قاریہ ہوں۔ ویسے تو سب رائٹرز ہی اچھی ہیں مگر عمیرہ احمد 'نمرہ احمد 'نگہت عبداللہ 'فائزہ افتخار اور نگہت سیما کی کیا بات ہے۔ اور ہمیں ان تحریروں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

اک سوال پوچھنا تھا آپ سے۔ اگر کوئی شعر یا اچھی بات لکھ کر بھیجنا چاہوں تو کیا طریقہ ہوگا۔

ج رابیل! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں

آپ ہمیں کوئی بھی انتخاب شعر لطیفہ یا کوئی اچھی بات لکھ کر بھجوانا چاہتی ہیں تو جس طرح آپ نے خط لکھا ہے۔ خط کے ساتھ علیحدہ کاغذ پر اپنا انتخاب بھی لکھ کر اسی لفافے میں رکھ دیتیں۔

اقرا اکرم ۔۔۔ گاؤں سلیاں شریف

آپ نے میرا خط شامل کیا بہت خوشی ہوئی اپنے گاؤں کے بارے میں پڑھ کر۔ غلطی ہو گئی تھی وہ بارڈر دو کلومیٹر دور نہیں بلکہ آدھا کلومیٹر دور ہے ہر بار کی طرح خواتین اس بار بھی بہت اچھا تھا۔ افسانے 'ناول شاعری سب کچھ اچھا۔

ج پیاری اقرا! بارڈر آپ کے گاؤں سے آدھا کلومیٹر دور ہے دو کلومیٹر نہیں۔ غلطی کی تصحیح کردی ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فوزیہ افضل ۔۔۔ فیصل آباد

ساتویں کلاس سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ زمین کے آنسو بہت زبردست کہانی ہے۔ لگتا ہے کہ اریب فاطمہ کا ملن ایبک سے ہوگا۔ "تیرے میرے درمیاں" کہانی بھی بہت پیاری ہے۔ خواتین کی تمام کہانیاں ہی زبردست ہیں۔ میری دوست بھی بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔

ج پیاری فوزیہ! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ اتنا مختصر سا خط ہمیں بالکل اچھا نہیں لگا۔ صرف دو کہانیوں پر تبصرہ! آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

حیا بخاری ۔۔۔ ڈیرہ اسماعیل خان

اپنے نام کے ساتھ پیاری لکھا دیکھ کر باچھیں ہی کھل گئیں۔

"کرن کرن روشنی" سے فیضیاب ہونے کے بعد سب سے پہلے دوڑ لگائی ثمرہ کی طرف۔ ثمرہ کے جوادی شبلی سے ایک اور ملاقات بے حد پسند آئی۔ مگر پتا نہیں کیوں کچھ سست سا لگا۔ مکمل ناول میں سب سے زیادہ نمبر لینے والی نگہت سیما۔

"زمین کے آنسو" بلاشبہ ایک ایسی کاوش ہے جو عرصہ تک قارئین کے ذہنوں پہ تحریر ہونے والی ہے۔ احمد رضا کو ٹریجڈی کریکٹر مت بنانا۔ پلیز نگہت۔ پلیز۔۔۔۔

باقی رہی ناولوں کی بات تو نگہت عبداللہ اور عنیزہ سید یہ دونوں تو ہیں ہی شاندار رائٹرز۔ مگر میں عنیزہ سے اتنا کہنا چاہوں گی کہ عنیزہ کاش آپ میری دوست یا بہن ہوتیں تو میری "آٹھ" بہنوں والی حسرت پوری ہو جاتی۔ (ہم ماشاء اللہ سے سات بہنیں ہیں۔)

اور اب بالکل آخر میں 'میں چند الفاظ بہن ثمینہ اکرم کے لیے لکھنا چاہوں گی۔ آپ کا خط پڑھ کر مجھے اس قدر بے چینی رہی کہ ۔۔۔ ساری رات ہی میں سو نہ سکی۔ میں آپ کی ہمت اور ذہنی سوجھ بوجھ کی داد دیتی ہوں۔ دنیا واقعی فانی ہے۔ جو چیز اللہ دیتا ہے لینے پہ بھی قادر ہے۔

ج پیاری حیا! یہ محض الفاظ نہیں بلکہ اپنی تمام مصنفین اور قارئین خصوصاً وہ جو ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں ہمیں بے حد پیاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے آپ سب کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ آٹھ بہنوں کی حسرت کی وجہ بھی بتا دیتیں۔ سات کا ہندسہ تو بہت اچھا ہے۔ ہماری ساری کلاسک کہانیوں میں سات شہزادیاں ہوتی ہیں۔ پھر آپ کو آٹھ بہنوں کی حسرت کیوں؟

آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں آپ کا انداز تحریر تو اچھا ہے۔ یقیناً کہانیاں بھی اچھی ہوں گی۔

ثمرین اکرم ۔۔۔ میرپور خاص سندھ

میرا تعلق خواتین اور شعاع سے بہت پرانا ہے اب جب کہ میری شادی کو بھی تین سال ہو چکے ہیں 'شعاع اور خواتین سے محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ میں اب بھی خاموش قاری ہی رہتی مگر مجھے فرحت اشتیاق صاحبہ کے ناول "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" نے اکسایا کہ اگر انہیں خراج تحسین پیش نہ کیا تو یہ تو زیادتی ہوگی نا؟ اور آل آپ کا رسالہ بہت شاندار ہے میرے فیورٹ رائٹرز میں عمیرہ احمد 'فرحت اشتیاق 'نمرہ احمد 'آسیہ رزاقی اور بھی بہت ہیں "آپ کا باورچی خانہ" اور "موسم کے پکوان" کا

سلسلہ بہت پسند ہے۔

ج ثمرین! خواتین کی محفل میں خوش آمدید ہماری جانب سے اپنے شوہر صاحب کا شکریہ ادا کر دیں جو آپ کو باقاعدگی سے خواتین اور شعاع لا کر دیتے ہیں۔ فرحت اشتیاق تک آپ کی طرف پہنچا رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے آپ نے خط لکھا' اب یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔

ام عبیر..... جھمرہ فیصل آباد

زندگی نے کئی کروٹیں لیں' بچپن گزرا۔ لڑکپن بھی جوانی کی حدود میں داخل ہوا۔ تبدیلی آئی شادی ہو گئی اور اب تک اس شادی خانہ آبادی کے توسط سے دو کلیاں بھی گھر آنگن مہکانے کو موجود ہیں۔ سسرال' میاں' بچے' دوست احباب میں سے اپنے پیارے ڈائجسٹوں کے لیے وقت نکالنا۔ خواتین اور شعاع کا ساتھ یوں جیسے حیات کامل ہو جائے۔ سارے سلسلے بہترین ہیں' اچھے لگتے ہیں پیارے نبی سے لے کر خوب صورت بنیے تک سارا رسالہ گھول کے پی جاتی ہوں (وقفے وقفے سے) خواتین کی بے شمار کہانیوں نے توجہ کھینچی۔ تبصرہ کرنا چاہا مگر۔ ہائے سستی مجبوری اور بھی بہت کچھ اب سوچا قلم اٹھا ہی لوں۔

زمین کے آنسو..... تبصرہ محفوظ..... کوہ گراں تھے ہم ..... یقیناً "مدتوں یاد رکھی جانے والی تحریر' عنیزہ سید' ایسے تانے بانے۔ سیانے فقیر زندگی کے گرہ تاتی گرہیں کھولتی مزا آجاتا ہے۔ نگہت عبداللہ اپنے محبت بھرے انداز میں بہترین..... مسئلہ یہ نہیں کہ کس کو اچھا کہا جائے مسئلہ تو یہ ہے کہ کس کو زیادہ اچھا کہا جائے مجھے تو ہر رائٹر سے پیار ہے۔ اب وہ پرانی لکھاری ہوں یا نئی آنے والیاں..... گلہ بھی ہے عمیرہ سے' تنزیلہ ریاض سے' عمیرہ احمد تو ٹی وی کو پیاری ہو گئیں اور تنزیلہ ایسی پیا کو پیاری ہوئیں کہ اپنی پیاری پڑھنے والیوں کو بھول ہی گئیں۔

کہانیاں میرے اندر جنم لیتی ہیں' کروٹیں بدلتی ہیں۔ مگر صفحہ قرطاس پر نہیں بکھرتیں۔ جی چاہتا ہے چپ کا قفل ٹوٹ جائے۔ حبس جب حد سے بڑھ جائے تو بارش کا امکان بڑھ جاتا ہے۔

ج ام عبیر! چلیں اتنا تو ہوا کہ آپ نے خواتین کی محفل میں شرکت کی۔ ان شاء اللہ جلد وہ بارش بھی ہو گی جو جل تھل کر دے گی۔ تحریر سے تو لگتا ہے کہ آپ اچھا لکھ سکتی ہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مسز رشید احمد..... تحصیل میلسی

میں 2002ء سے آپ کے پرچے پڑھ رہی ہوں' ان دنوں تھوڑا سا آسماں' خواتین ڈائجسٹ میں چل رہا تھا۔

اب خط لکھنے کی وجہ عنیزہ سید کا ناول "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوب صورتی سے لکھ رہی ہیں۔

اس کے علاوہ رخسانہ نگار عدنان بالکل غائب ہیں' ماہا ملک' فرحت اشتیاق' جبیں سسٹرز ان سب سے بھی لکھوائیں۔ باقی آپ کے سب سلسلے بہت اچھے ہیں۔

ج آپ نے اپنا نام نہیں لکھا' نام انسان کی شناخت ہوتی ہے' اپنی شناخت تو قائم رکھنی چاہیے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ' رخسانہ نگار پچھلے کچھ عرصہ سے مصروفیت کی بنا پر لکھ نہیں پائیں۔ اس ماہ سے شعاع میں ان کا ناول "ایک تھی مثال" شروع ہو رہا ہے۔

بشریٰ قریشی..... مری

میں تقریباً" 4th کلاس سے شعاع اور خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ یعنی میرا اور آپ کا خاموش تعلق پچھلے نو سال سے ہے۔ ہماری ساری رائٹرز ہی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن فرحت اشتیاق' ماہا ملک' نمرہ احمد' عنیزہ سید' بشریٰ سعید' نگہت عبداللہ کی تو تعریف کرنا ہمارے بس میں ہی نہیں۔

اب آتے ہیں اس ماہ کے رسالے کی طرف تو جناب ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ سارے سلسلے ہی زبردست تھے۔ عنیزہ سید کی زبردست تخلیق "کوہ گراں تھے ہم" میں سد اور ماہ نور کا کردار بہت زبردست ہے۔ پلیز انہیں جدا مت کیجیے گا۔ زمین کے آنسو فنٹاسٹک سیما جی' لیکن پلیز احمد کو کسی طرح بچا لینا۔ افسانے سارے ہی زبردست تھے۔ نگہت جی تسی تے گریٹ ہو۔ کیا زبردست ناول ہے۔

میں نے بہت سے ناول پڑھے لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ایک ناول نبیلہ ابر راجہ کا "میں کی کراں یار مناواں" میرے ذہن سے نہیں نکلتا۔ کیا محبت خواب سفر کتابی شکل میں آچکا ہے۔

ج پیاری بشریٰ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نبیلہ ابر راجہ اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں "محبت خواب سفر" کتابی شکل میں آچکا ہے۔

عائشہ ارما..... اسلامیہ کالج پشاور

ماڈل کے بالوں کا انداز بہت پیارا تھا۔ "ہم سے ہے زمانہ" دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مجھے یہ سلسلہ بہت پسند ہے۔ ثمرہ بخاری ہر ماہ لکھا کریں نا! مہوش افتخار کا ناول یوں تو بہت زبردست تھا مگر عادل کا انجام کچھ برا تو ضرور ہونا چاہیے تھا۔ سائرہ رضا کا ناول بہت پسند آیا۔ ویسے ابن صفی میرے بھی پسندیدہ ناول نگار ہیں۔ میری بہت خواہش ہے کہ عمران سیریز اور کرنل فریدی پڑھوں مگر یہاں کے کسی بھی کتب فروش کے پاس نہیں ہیں۔ ابن انشاء کو میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ افسانوں میں راشدہ رفعت کا افسانہ بہت پسند آیا۔ تنہائیاں ڈرامے میں سائرہ یوسف کی بہن کا کیا نام ہے؟ کیا وہ بھی کراچی کی ہے؟ "میرے خواب لوٹا دو" پتا نہیں میں جلدی پڑھ لیتی ہوں یا صفحات کم ہوتے ہیں۔

ج عائشہ! ہمیں افسوس ہے پچھلے ماہ عائشہ ارما کے بجائے آپ کا نام عائشہ رانا شائع ہو گیا۔ سائرہ یوسف کی بہن کا نام علیشبہ یوسف ہے۔

عفت سعید..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

"کوہ گراں تھے ہم" اتنا پرفیکٹ ناول سب ناولز سے مختلف۔ زمین کے آنسو تو ہمیں اپنے آنسو لگتے ہیں' ہر بار پڑھنے پہ آنکھوں میں آنسو آنا لازم ہے۔ میرے خواب لوٹا دو بہت زبردست جا رہا ہے مگر سست رفتار سے۔ نئے سال کا شمارہ بہت خوب۔ خواتین کا ہر شمارہ اتنا پرفیکٹ کہ کوئی اور ڈائجسٹ آنکھوں کو بھاتا ہی نہیں۔ میں اپنی آپی ماجدہ کی بہت لاڈلی ہوں 10 دسمبر کو ان کی شادی ہو چکی ہے

ماجدہ کی بہت لاڈلی ہوں 10 دسمبر کو ان کی شادی ہو چکی ہے

اوہ فرحت آپی پلیز ہمیں کسی اور خوب صورت ملک کی سیر ضرور کروایئے گا۔ ہم بہت منتظر ہیں آپ کی آمد کے ہمارے نام میں شیریں ظفر کا خط پڑھ کر دکھ ہوا۔ اقرا اکرم جی آپ کا بارڈر اتنا پیارا ہے میرے بہنوئی بھی آپ کے باڈر پر ڈیوٹی کرتے ہیں!

ج پیاری عفت! بہن کی شادی کی مبارک باد اور دعائیں اللہ تعالیٰ انہیں خوش و خرم رکھے آمین۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

صفیہ کوکب گوندل..... اسلام آباد

میں تقریباً" چھ سال بعد آپ کی محفل میں شریک رہی ہوں وجہ یونیورسٹی میں لیکچرار شپ اور شادی کی مصروفیات میں الجھ کر رہ گئی ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں' میں نے شعاع اور خواتین پڑھنا چھوڑ دیے تھے۔ بس ایک ڈائجسٹ جو ایک دن میں ختم کرتی تھی ایک مہینے میں ختم کر پاتی ہوں۔ جس چیز نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کیا۔ وہ حفیظ بھائی (جو ابھی انگلینڈ سے پاکستان آئے ہیں) کا تبصرہ ہے' جو انہوں نے میرے بیڈ روم میں پڑے خواتین اور شعاع ڈائجسٹ دیکھ کر کہا "ہائیں! شادی کے بعد بھی تمہاری لڑکیوں والی عادت نہیں گئی اور میں ان کے تبصرے پر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی خیر اب آتے ہیں اس ماہ کے شمارے کی طرف۔ سب سے پہلے بات کرتے ہیں مہوش افتخار کے مکمل ناول "تیرے میرے درمیان" کی پہلی قسط میں مصنفہ کی جو گرفت نظر آئی وہ آخری قسط میں کم تھی بہرحال انابیہ اور تیمور کے ملاپ نے کہانی کو چار چاند لگا دیے اور خاص طور پر یہ فقرہ جس نے میں کی جگہ ہم کا لفظ استعمال کر کے اس کی چار سالہ اذیت مٹا دی تھی اس کے بعد ثمرہ بخاری کا ناولٹ "ہم سے ہے زمانہ" ہمیشہ کی طرح ترو تازہ کر گیا۔ شبلی اور جوادی کی حرکتوں نے کئی بار ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

راشدہ رفعت کا افسانہ "کہی ان کہی" زندگی کی تلخ حقیقتوں کو متعارف کروا گیا۔ تعلیم انسان کو بزدل نہیں بناتی بلکہ مروت سکھاتی ہے۔ باقی سب ناولٹ اور افسانے اچھے تھے۔

سجل علی اور نیلم منیر سے ملاقات اچھی رہی۔

ج پیاری صفیہ! آپ تو ابھی کم عمر ہیں لیکن ہم نے تو 70 سالہ خواتین کو بھی خواتین پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ہمارے ہاں بہت سے ایسے خطوط آتے ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ خواتین ڈائجسٹ کی پہلے پرچے سے قاری

ہیں اور اب وہ نانی دادی بن چکی ہیں لیکن خواتین کا مطالعہ جاری ہے۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

تہنیت احمد۔۔۔۔ غازی پور

زرد رنگ کے درمیان خوب صورت نین نقش والی' کھلے گلاب جیسی ماڈل بہت پسند آئی۔
"عنیزہ سید" کا ناول اچھا جا رہا ہے لیکن کچھ کردار ابھی بھی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ "میرے خواب لوٹا دو" بھی اچھا ہے۔ نگہت سیما کا ناول "زمین کے آنسو" پڑھ کر شاک لگا۔ فلک شاہ اور عمارہ کی زندگی کے انکشاف نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ انسان غصے میں ایسی باتیں کر جاتا ہے کہ جس کے نتائج بھیانک نکلتے ہیں۔
افسانے سارے ہی اچھے تھے "رنگین خواب" میں انسان کی نیکی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ "کہی ان کہی" میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے۔ ایسی حقیقت کا سامنا پڑھی لکھی خصوصاً "گاؤں کی لڑکیوں کو کرنا پڑتا ہے۔
ج پیاری تہنیت! نگہت سیما نے وضاحت کی تھی' صرف امام حنیفہ کا کہنا ہے کہ اس صورت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے یعنی فقہ حنفیہ کی رو سے طلاق واقع ہو جاتی ہے دیگر فقہوں میں ایسی صورت حال میں طلاق واقع نہیں ہوتی۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔

صاعقہ جبیں۔۔۔۔ (پھلروان) سرگودھا

خواتین ڈائجسٹ گھر آتے ہی اس پر کور چڑھا دیا جاتا ہے تاکہ ٹائٹل خراب نہ ہو۔۔۔۔ پلیز آپی! عمیرہ احمد اور مریم عزیز سے بھی کچھ لکھوائیں۔
ج پیاری صاعقہ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔
آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں اگر اچھی ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

امبر گل۔۔۔۔ جھڈو (سندھ)

ہزاروں مشغلے ہیں جو مجھے مصروف رکھتے ہیں
مگر محترم وہ ایسا ہے کہ پھر بھی یاد آتا ہے
کچھ یاد نہیں کہ آخری بار خواتین میں خط کب لکھا تھا سو اس بار سوچا کہ جنوری 2012ء کے خواتین پر کچھ تبصرہ کر ہی ڈالیں۔
سب سے پہلے ٹائٹل بہت ہی اچھا لگا مجھے اس بار 'اب بات کروں اس ناول کی جس نے اسٹارٹ سے ہی مجھے اپنے سحر میں لے لیا تھا جی عنیزہ جی کا ناول "کوہ گراں تھے ہم" اس کا ایک ایک کردار اپنی اپنی جگہ جیسے انگوٹھی میں نگینے کی طرف فٹ ہے۔ اس کے بعد باری آتی ہے سائرہ جی کی۔ مجھے بالکل ایسا لگتا ہے کہ راحت جبیں، جونیئر پیدا ہو گئی ہیں "میرے خواب لوٹا دو" ناول بہت زبردست جا رہا ہے مگر جب پڑھنے لگتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے '4 صفحے تھے جو 5 منٹ میں پڑھ کر ختم ہو جاتے ہیں پلیز اس کے کچھ صفحات تو بڑھا دیں۔ عجیب سی تشنگی محسوس ہوتی ہے۔
مہوش افتخار کا ناول اس بار بس سو سو ہی لگا۔
آفریدی' سعید بھائی' محمد حفیظ' جنید خان' عمر گل یہ بھی تو ہمارے ہیرو ہیں نا ان کے انٹرویو بھی لیں۔
ج پیاری امبر! طویل عرصہ بعد آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ کبھی کبھی انسان ہر چیز سے اکتانے لگتا ہے۔ کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہوتی پھر بھی کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔ اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ بڑھ جائے تو نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ تازہ ہوا میں چہل قدمی آپ کی ذہنی کیفیت بہتر بنا سکتی ہے۔
تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

یاسمین کنول۔۔۔۔ پسرور ضلع سیالکوٹ

خوب صورت سرورق کے ساتھ سال نو کہتا ہوا خواتین موصول ہوا۔ سجل علی اور نیلم منیر سے مل کر خوشی ہوئی۔ "میرے خواب لوٹا دو اور کوہ گراں تھے ہم" اچھے بلکہ بہت اچھے جا رہے ہیں۔ جنوری کی شام اور کہی ان کہی بہترین افسانے لگے۔ غزلوں میں انور سدید کی غزل بہترین لگی۔ تیرے میرے درمیان کی آخری قسط پڑھ کر مزا آیا۔
باقی کراچی کے حالات پڑھ کر دل بہت دکھتا ہے۔ قائد کے شہر اور روشنیوں کے نگر کو کس کی نظر لگ گئی کتنے سالوں سے حالات دگرگوں چلے آ رہے ہیں۔

ج پیاری یاسمین! کراچی کے حالات کی ذمہ داری سب سے بڑھ کر کراچی کے شہریوں پر عائد ہوتی ہے اگر وہ حالات سنوارنے کا عزم کر لیں تو کوئی بھی حالات نہیں بگاڑ سکتا۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

سندھو اجن۔۔۔۔ سانگھڑ

جنوری کا شمارہ بہت اچھا تھا اور سرورق بھی شان دار تھا۔ نومبر میں فرحت اشتیاق کے ناول کی آخری قسط پڑھی اختتام اچھا تھا فرحت جی آپ میری فیورٹ رائٹر ہیں اب آپ جلدی کچھ اچھا لکھیے گا پلیز اور شاہین رشید سے کہیں 'فہد مصطفیٰ' سے انٹرویو لیں پلیز۔
ج پیاری سندھو! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ فہد مصطفیٰ کا انٹرویو شائع ہو چکا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سائرہ عبید۔۔۔۔ ڈنگہ شہر

اس بار خواتین منگوایا تو پتا چلا کہ خواتین تو ختم بھی ہو گیا۔ ہر دکان سے پتا کروایا لیکن نہیں ملا تو بہت دکھ ہوا' اب مجھے خواتین ڈائجسٹ چاہیے۔ کیا مجھے مل سکتا ہے؟
اس کے علاوہ میں خواتین ڈائجسٹ کی سالانہ خریدار بننا چاہتی ہوں اس کے لیے میں کیا کروں؟
خواتین ڈائجسٹ ہمیشہ لیٹ ملتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج پیاری سائرہ! خواتین ڈائجسٹ لیٹ ہو جانے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ کراچی کے حالات ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں خواتین آپ کو جلد مل سکے خواتین ڈائجسٹ کا دسمبر کا شمارہ آپ کو گھر پر بھجوا سکتے ہیں۔ آپ اپنا ایڈریس بھجوا دیں۔ ہم خواتین وی پی کر دیں گے۔ آپ کو سو روپے دینا ہوں گے۔
خواتین ڈائجسٹ کی سالانہ خریدار بننے کے لیے آپ 600 روپے منی آرڈر کر دیں۔ آپ کو گھر بیٹھے پرچا ملتا رہے گا۔ منی آرڈر اس ایڈریس پر کریں۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار کراچی
اپنا ایڈریس صاف اور واضح لکھیں۔

سائرہ خورشید۔۔۔۔ راولپنڈی

میں "خواتین ڈائجسٹ" 1997ء سے باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ خط لکھنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو مہوش افتخار کا ناول "تیرے میرے درمیان" بہت پسند آیا۔ اس کی تعریف کرنی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مجھے بھی لکھنے کا شوق ہے۔ اس کا طریقہ کار جاننا چاہتی ہوں۔
ج پیاری سائرہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ لکھنے کا طریقہ یہ ہے۔ صفحے کے ایک جانب اور سطر چھوڑ کر لکھیں اور بذریعہ ارجنٹ میل سروس بھجوائیں۔

آمنہ اجالا۔۔۔۔ ڈہرکی

سال نو جنوری کا خواتین ڈائجسٹ اس بار خلاف توقع کچھ جلدی مل گیا۔ سرورق نہایت ہی دلکش تھا۔ لمبی چوٹی میں رنگ برنگے پھول سجائے خوب صورت سی مسکان کے ساتھ ماڈل بہت پیاری لگی۔ فہرست میں اپنی فیورٹ رائٹرز نایاب جیلانی اور نبیلہ عزیز کو نہ پا کر تھوڑا بد مزا ہوئے۔ پلیز تنزیلہ ریاض' سعدیہ عزیز آفریدی' سعدیہ حمید چودھری' فارحہ ارشد اور ایک بہت ہی پیاری رائٹر ریحانہ آفتاب ہم آپ کی خوب صورت تحریروں کے شدت سے منتظر ہیں۔
سال نو کا ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے ہم دوسری مرتبہ بد مزا تب ہوئے جب اپنا بھیجا ہوا انتخاب رشتے' رابطے۔ کسی اور کے نام سے چھپا ہوا دیکھا۔
دو اقساط پر مشتمل مہوش افتخار کا مکمل ناول "تیرے میرے درمیاں" سگے رشتوں کی منافقت کو عیاں کر رہی تھی لیکن سچائی کتنے ہی پردوں میں کیوں نہ چھپی ہو ایک دن سامنے آ کر رہتی ہے اختتام حسب توقع بہت اچھا ہوا۔
"برف کا موسم" سائرہ رضا کا مکمل ناول بھی بے حس اور خود غرض رشتوں کا واضح عکس تھا۔
ج پیاری آمنہ! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کا انتخاب کسی اور نام سے شائع ہو گیا۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ نایاب جیلانی کا مکمل ناول موصول ہو چکا ہے۔ آپ جلد پڑھ سکیں گی۔

انجم فاروق۔۔۔۔ لاہور

جنوری کی شام اور کہی ان کہی دونوں افسانے اچھے تھے۔ رنگین خواب متاثر کن نہیں تھا۔ ہم سے بے زبان

ناولٹ اچھی پیشکش تھی۔
زمین کے آنسو، تیرے میرے درمیان اور برف کا موسم یہ تینوں ناول بھی اچھے سبق آموز تھے۔ ڈاکٹر انور سدید کی غزل موجود تھی، یہ ہمارے گھر کے بالکل ہی سامنے رہائش پذیر نقاد ہیں۔ "بیمار کا حال اچھا ہے" انسانی زندگی کے داؤ پیچ کا خوب صورت جائزہ ہے۔
ج انجم! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تحریریں پڑھی نہیں۔ قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

صفیہ عباس خان۔۔۔ کروڑ لعل عین ضلع لیہ 15

میں 8th کی طالبہ تھی جب سے میں یہ دونوں ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں۔ اب میں ایم اے کر چکی ہوں اور ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آئی کہ نہ میں نے لمبے ناول یا افسانے بھیجے، نہ کسی کے انٹرویو کی درخواست کی نہ کبھی شاعری بھیجی، نہ آپ کے ڈائجسٹ میں کوئی نقص نکالا، نہ کھانا پکانے کی تراکیب بھیجیں، نہ کوئی فرمائش کی۔ جب بھی خط لکھا ہمیشہ تعریف کی پھر آپ میرا خط کیوں نہیں چھاپتے؟

اس بار ٹائٹل پہ ماڈل بہت اچھی لگی۔ سب سے پہلے نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" پڑھا بہت اچھا جا رہا ہے۔

مہوش افتخار کا "تیرے میرے درمیان بہت زبردست تھا۔ "برف کا موسم" منفرد اور بہترین تھا۔ اینڈ بہت مزے کا تھا۔ شعاع اور خواتین پڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے مذہبی واقعات سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ شاعری مجھے بہت پسند ہے اور خواتین میں مجھے میری پسند کے سب شاعروں کی شاعری ملتی ہے۔

ج پیاری صفیہ! آپ ہمیں لمبے ناول اور افسانے بھجوائیں انٹرویو کی درخواست کریں۔ ڈائجسٹ میں نقص نکالتیں۔ کھانا پکانے کی تراکیب بھیجتیں، ہم سے کوئی فرمائش کرتیں تب بھی ہم آپ کا خط شائع کر. تہ۔ یہ سلسلہ صرف پرچے کی تعریف کے لیے نہیں شروع کیا گیا۔

آپ کے پچھلے خط شائع نہیں ہوئے تو اس کی صرف ایک وجہ ہے، وہ یہ کہ آپ کے خط ہمیں موصول ہی نہیں ہوئے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کے اشعار شائع کیے جا رہے ہیں۔

جمیلہ اختر۔۔۔ راولپنڈی

میں آپ کے تمام پرچے خاص طور پر خواتین، تقریباً" بیس سال سے پڑھ رہی ہوں۔ تمام سلسلے واقعی بہت زبردست ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میں بھی لکھوں۔
ج جمیلہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ کہانیاں بھجوادیں اگر قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔

ثمینہ کوثر۔۔۔ ڈوگہ گجرات

ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ سب سے پہلے "زمین کے آنسو" نگہت سیما جی آپ کے کیا کہنے، میں فقط اتنا ہی کہوں گی "احمد رضا" کے لیے امید کا آخری دیا روشن رکھیے گا۔
اور "میرے خواب لوٹا دو" زبردست جا رہا ہے "تیرے میرے درمیان" بہت اچھا تھا۔
اور میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ "باروفا" قسط وار شائع ہوا تھا یا ایک ہی قسط میں ختم ہو گیا تھا۔
ج پیاری ثمینہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں۔ باروفا کئی اقساط پر مشتمل تھا۔ اب یہ کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ اس کو منگوانا چاہتی ہیں تو 200 روپے درج ذیل ایڈریس پر منی آرڈر کر دیں
مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی
کتاب آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گی۔



خبریں اور تبصرے

تبصیر نشاط



افواہیں

شعیب منصور کی فلم "بول" متنازعہ موضوع کے باوجود سپرہٹ رہی۔ فلم کی ہیروئین ٹی وی کی دنیا سے آنے والی ماہرہ خان تھیں، مگر بول بالا صرف عمیمہ ملک کا ہی ہوا۔ کیونکہ ماہرہ خان اور عاطف اسلم تو اس میں "بیبے" ہیرو ہیروئین ہی تھے۔ کہانی کا اصل مرکزی کردار تو عمیمہ ہی کا تھا۔ اس فلم سے ماہرہ خان کو توجہ کے بول نہ ملے تو انہوں نے دوبارہ ٹی وی کی ہم سفری اختیار کی۔ ان کی یہ "ہم سفری" بہتر رہی۔ چنانچہ ہر طرف ان کے اس "خردمندانہ" فیصلے کی دھوم مچ گئی۔ ان کی سیریل "ہم سفر" بلاک بسٹر اور خود ماہرہ خان ہزاروں یا شاید لاکھوں مداحوں کی مرکز نگاہ ٹھہریں۔

ان ہی میں سے کچھ نگاہوں نے تاڑ لیا کہ ماہرہ خان کی اپنے ہم سفر سے کچھ ان بن ہو گئی ہے۔ سو وہ ان دنوں اپنے بچوں کے ساتھ اپنے والدین کے گھر میں مقیم ہیں۔ تاڑنے والی ان نگاہوں کے یہ افسانے زبانوں تک بھی پہنچ گئے اور کہنے والوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ماہرہ خان کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہو گئی ہے۔ کیونکہ ماہرہ کے شوہر علی عسکری کو ان کے شوبز میں کام کرنے اور ان کے بعض نامناسب لباس پہننے پر اعتراض تھا۔ چنانچہ ان کی اپنے شوہر سے ہم نوائی نہ ہو سکی اور انہوں نے نامناسب لباس اور ٹی وی چھوڑنے کے بجائے خود انہیں ہی چھوڑ دیا۔ ماہرہ خان اور علی عسکری نے ابھی تک ان افواہوں کی تردید یا تصدیق نہیں کی ہے۔ ان دونوں نے اپنی پسند سے شادی کی تھی اور ان کے دو بچے بھی ہیں۔

(ان دونوں کی خاموشی ٹوٹے یا نہ ٹوٹے، ہماری دعا ہے کہ ان کا تعلق نہ ٹوٹے کیونکہ گھر ٹوٹ جائیں تو ان ٹوٹے گھروں کا دکھ سب سے زیادہ بچوں کو سہنا پڑتا ہے مگر افسوس! ہمارے شوبز کے اکثر افراد یہ بات نہیں سمجھتے۔)

دوستی

آج کل سب کہہ دو کا زمانہ ہے شاید اسی لیے عمیمہ ملک کی "بول" اتنی پسند کی گئی کہ عمیمہ کا حوصلہ سرحد پار تک بڑھ گیا۔ اور وہ سرحد پار جا پہنچیں وہاں بھی ان کو پذیرائی ملی اور کئی اہم ایوارڈز ان کی





جھولی میں ڈال دیے گئے۔ فوری طور پر انہیں بڑے بینر کی ایک فلم "شیر" بھی مل گئی۔ اپنی فلم میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے یا پھر شاید عمیمہ ہی "شیر" کو اس قدر بھائیں کہ شیر نے ان سے دوستی کرلی۔ دوستی ہو اور تحفے تحائف کا سلسلہ نہ ہو' یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ سو اس روایت پر عمل کرتے ہوئے شیر نے عمیمہ پر تحائف کی بارش کردی۔ جس میں بیش قیمت ہیروں کا ہار بھی شامل ہے۔ کیونکہ یہ شیر کوئی عام شیر نہیں' بلکہ جانے پہچانے "سنجو بابا" ہیں۔ سرحد پار کی اطلاعات کے مطابق سنجے دت عرف سنجو بابا اپنی اس نئی دوست پر بے حد مہربان ہیں۔ وہ بالی وڈ میں قدم جمانے کے لیے عمیمہ ملک کی ہر طرح سے مدد کر رہے ہیں۔ کیونکہ ایک تو عمیمہ پردیسی اور پھر سنجے دت کی ہیروئین (فلم کی...... کچھ اور سوچنے کی اجازت نہیں) تو سنجو بابا انہیں تنہا کیسے چھوڑ سکتے تھے بھلا۔

عمیمہ ملک اپنے سے دگنی عمر کے شیر کی شیرنی بن کر بے انتہا خوش تو تھیں ہی' اب ان کی کرم فرمائیوں پر بھی بے حد مسرور ہیں اور سنجو بابا کے سارے تحائف اپنی دوستی کا خراج سمجھ کر خوشی خوشی وصول کر رہی ہیں۔

(ذرا دھیان سے عمیمہ جی! سنجو بابا کی اصلی شیرنی کو پتا چل گیا تو وہ چیر پھاڑ کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگائیں گی...... اور پھر ہمیں بادل نخواستہ ہی سہی' کہیں یہ کہنا نہ پڑ جائے کہ "لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔")

امیج

ویسے تو مشرقی اور مغربی روایات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ لیکن فی زمانہ بیوی مشرق کی ہو یا مغرب کی' تقریباً" ایک ہی جیسے رویے کا مظاہرہ کرتی نظر آتی ہے۔

وہ زمانے گئے' جب بیوی اپنے سرتاج کی پابند تھی۔ اب تو اکثر گھروں میں بیویاں شوہروں کو اپنے اشاروں پر نچاتی نظر آتی ہیں' مگر اپنی ثانیہ مرزا تو ان سب سے بھی ایک قدم آگے نکلیں کہ انہوں نے اپنے شعیب میاں کو سب کے سامنے "سرِ چینل" ہی نچا ڈالا...... اور چینل بھی کون سا؟ ثانیہ کے اپنے میکے کا چینل۔ پیاری بیوی کی فرمائش شعیب بھلا کیسے ٹال سکتے تھے' سو انہوں نے بھی سسرالیوں کے سامنے خوب ٹھمکے لگائے۔ ثانیہ نے بھی ان کا ساتھ دیا اور حاضرین محفل



بیٹی اور داماد پر داد کے ڈونگرے برساتے رہے۔ رقص کے دوران دبلے پتلے شعیب ملک نے ثانیہ کو اٹھا کر یہ ثابت کیا کہ وہ ثانیہ کا بوجھ اٹھانے کی طاقت رکھتے ہیں۔

بعد میں پروگرام کے شرکاء کی چھیڑ چھاڑ کا جواب دیتے ہوئے شعیب نے بتایا کہ میں نے اس کے لیے بہت محنت کی تھی۔ جان بنانے کے لیے ڈھیر سارا دودھ بھی پیا۔

(کاش! اتنی محنت ہر مرتبہ میچ سے پہلے کرلیں تو دس میں سے صرف ایک میچ میں کارکردگی بہتر نہ ہو بلکہ کم از کم سات میں تو ہو ہی...... ڈانس فلور پر پرفارمنس دیتے اور ثانیہ کو اٹھاتے ہوئے شعیب یہ بھول گئے کہ انہوں نے اپنے کندھوں پر ملک و قوم کی عزت کا بار بھی اٹھایا ہوا ہے۔

ناچ گانا ان کے سسرالی ملک کی ثقافت سہی' مگر سسرالی خاندان کی ہرگز نہیں ہوگی' کیونکہ ان کی اہلیہ کا تعلق ایک مسلمان گھرانے سے ہے۔ پھر ہماری قوم کا مزاج بھی شعیب کو یاد رہنا چاہیے کہ فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والی کسی شخصیت کو ہم کسی حد تک نظر انداز کر بھی دیا کرتے ہیں کہ یہ ان کا کام ہے۔ لیکن کھیل' فنون لطیفہ کا حصہ نہیں ہے۔ اس لیے کھیلوں سے وابستہ شخصیات سے ہم سنجیدگی کی توقع رکھتے ہیں ویسے بھی پاکستانی کرکٹ ٹیم کا مذہبی امیج سب کے سامنے ہی ہے۔)

کچھ اِدھر اُدھر سے

ہماری حکومت کا حال اس مالی جیسا ہے' جو ہر روز صبح کو اپنے باغ کی دیکھ بھال کے لیے جاتا ہے اور جس پودے یا درخت کے پتوں میں کیڑا لگے نظر آئے ان تمام پتوں کو کاٹ کر مطمئن ہو جاتا ہے' لیکن اگلی صبح پھر اس کے پودوں اور درختوں کے پتے کیڑوں نے کھائے ہوتے ہیں۔

(جاوید چودھری...... زیرو پوائنٹ)

○ ڈرون حملوں میں صرف بے گناہ لوگ نشانہ بنتے ہیں۔ اب تک جتنے افراد ہلاک ہوئے ہیں' ان میں پونے دو سو تو صرف بچے ہیں۔

(سائمن جینکنس...... گارجین)

○ اسپین کے طبی ماہرین کے مطابق بروقت کھانے سے جسم کو موٹاپے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وقت پر کھانا کھانے سے جسم متوازن اور تندرست رہتا ہے۔

(میڈرڈ...... اے پی پی)

○ فرنچ میڈیا کا مولانا طاہر القادری کو خراج تحسین۔ طاہر القادری مغرب کے لیے "فیورٹ" ہو گئے۔ طاہر القادری اپنی تقاریر اور فتووں سے ثابت کرچکے ہیں کہ وہ طالبان کے سخت خلاف ہیں۔

(منظور جنجوعہ...... پیرس)

○ ابھی کل تک امن کی آشا کا راگ الاپا جا رہا تھا۔ اب یہ حال ہے' گیارہ بھارتی ریاستوں کے پچیس سے زائد شہروں سے شائع ہونے والے ہندی زبان کے اخبار "جاگرن" نے ایک شرانگیز سرخی کے ساتھ مضمون لکھا ہے "پانچ منٹ کی تیاری' ایک بٹن دبانے کی دیر...... اور پاکستان تباہ"۔

(ایم ابراہیم خان)

○ بلدیہ عظمیٰ اس وقت اپنی تاریخ کے سب سے بدترین بحران سے گزر رہی ہے۔ ادارے کے ملازمین کو کئی ماہ سے تنخواہیں بھی نہیں دے سکی ہے۔ رواں سال میں 6 کروڑ کی رقم سے زائد رقم مختلف اداروں کو بانٹ دی۔ ان میں کلفٹن کا ایک معروف نجی اسکول جیسز اینڈ میری بھی شامل ہے۔ جہاں پر صرف امراء اور صاحب ثروت لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ اس اسکول کو چالیس لاکھ روپے امداد کے نام پر دے دیے گئے۔

(ایکسپریس نیوز)

خواتین ڈائجسٹ میں قارئین کی شرکت کے لیے کچن کے حوالے سے ہمارا ایک مستقل سلسلہ ہے "آپ کا باورچی خانہ" جس کے سوالات یہ ہیں۔

1 : کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟ پسند ناپسند' غذائیت' گھر والوں کی صحت۔

2 : گھر میں اچانک مہمان آگئے ہیں' کھانے کا وقت ہے۔ کسی ایسی ڈش کی ترکیب بتائیں جو فوری تیار کرکے تواضع کرسکیں۔

3 : کچن عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے' آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟

4 : صبح کا ناشتا ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ آپ ناشتے میں کیا بناتی ہیں؟ ایسی خصوصی چیز کی ترکیب جو آپ اچھی بناتی ہیں۔

5 : گھر سے باہر کھانا کھانا فیشن بنتا جارہا ہے۔ آپ مہینے میں کتنی بار باہر کھانا کھانے جاتی ہیں؟ (1) جب کوئی لے جائے' (2) کسی کی سال گرہ پر (3) یا کسی خوشی کے موقع پر۔

6 : کھانا پکانے کے لیے ڈش کا انتخاب کرتے ہوئے موسم کو مدنظر رکھتی ہیں؟

7 : اچھا پکانے کے لیے کتنی محنت کی قائل ہیں؟

8 : کچن کی کوئی ٹپ' جو دینا چاہیں؟

آپ کا باورچی خانہ

شائستہ ابوالحسن

باورچی خانہ اور خاتون خانہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ ساتھ شادی کے بعد ذمہ داری میں بدل جاتا ہے ہر اچھی اور سگھڑ خاتون خانہ کی طرح مجھے بھی اپنے شوہر اور بچوں کو مزے مزے کی چیزیں بنا کر کھلانے کا شوق ہے اور مہمان آجائیں تو اور بھی اچھا لگتا ہے کہ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور جب اللہ ہی رازق ہے تو اس کے بندوں سے کیا گھبرانا وہی انتظام کرے گا۔

(1) بھئی کھانے میں بچوں اور شوہر نام دار کی پسند تو لازمی ہے اور اگر اس میں غذائیت بھی شامل ہوجائے تو پھر کیا کہنے اور میاں جی کے دل تک رسائی بھی تو معدے سے ہی ہوتی ہے۔

(2) اچانک مہمان آجائیں تو میں پریشان نہیں ہوتی کیونکہ فریزر میں شامی کباب' کوفتے اور یخنی بنا کر ہمیشہ رکھتی ہوں تاکہ ٹائم بھی کم لگے اور مہمان داری کے ساتھ ساتھ گپ شپ کا موقع بھی ملے۔ ہاں اگر کبھی ضرورت ہو تو انڈوں کا مغز بنالیتی ہوں ہوں جو صرف 15-10 منٹ میں بن جاتا ہے۔ ترکیب حاضر خدمت ہے۔

اجزا :

انڈے	چار عدد
نمک	حسب ذائقہ
مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
پسا دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھائی اسپون
ٹماٹر	ایک عدد درمیانے سائز کا
پیاز	ایک عدد درمیانی سائز کی
ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ' ہرا دھنیا اوپر سے ڈالنے کے لیے	
اوور کوکنگ آئل	آدھا کپ

ترکیب :

پہلے پیاز کو کاٹ کر تھوڑی سی پیاز بچا کر باقی ساری پیاز گولڈن کرلیں۔ پھر انڈے اور ہری مرچ ہرا دھنیا چھوڑ کر سارے مسالے آئل میں ڈال کر بھون لیں۔ انڈوں کو پھینٹ کر ایک فرائی پین میں تھوڑا سا پانی ڈال کر گرم کریں اور پھینٹے ہوئے انڈے اس میں دو منٹ پکائیں جب پک جائے تو چولہے سے اتار کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں اور بھونے ہوئے مسالے میں ڈال کر چمچے سے مکس کردیں اوپر سے ہرا دھنیا ہری مرچ اور پیاز ڈال کر دو منٹ دم پر رکھ دیں۔ یقین کریں کہ دس منٹ میں مزے دار ڈش تیار ہے بالکل مغز کا مزا دیتی ہے۔ جو لوگ مغز کھانے کے شوقین ہیں ان کو ضرور پسند آئے گی۔

(3) کھانا پکا کر کچن کی صفائی کرتی ہوں۔ پوچا لگا کر لال بیگ کا اسپرے ضرور کرتی ہوں تاکہ لال بیگ نہ ہونے پائیں۔ صفائی کے مقصد کے علاوہ مجھے لال بیگ سے ڈر بھی لگتا ہے۔

(4) ناشتے میں ہمیشہ بدل بدل کر بناتی ہوں اگر رات کا سالن ہو تو پراٹھا بنالیتی ہوں' فرنچ ٹوسٹ یا کبھی کوئی سوئٹ ڈش یعنی بیسن اور انڈوں کا حلوہ بنالیتی ہوں۔ اس کی ترکیب بھی حاضر خدمت ہے۔

بیسن اور انڈوں کا حلوہ

اجزا :

انڈے	دو عدد
بیسن	چار کپ
گھی	آدھا کپ
چینی	آدھا کپ
سبز الائچی	چار دانے
میوہ	اگر دل چاہے تو

ترکیب :

پتیلی میں گھی ڈال دیں پھر اس میں بیسن ڈال کر بھونیں۔ چمچہ مسلسل ہلاتے رہیں تاکہ نیچے سے لگ نہ سکے۔ الائچی کے دانے نکال کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی چینی بھی۔ چینی گھلنے لگے تو انڈے پھینٹ کر ڈال دیں۔ پھر تیز ہاتھوں سے اس وقت تک بھونیں جب تک گھی الگ ہوجائے۔ عموماً" یہ ڈش میں ناشتے ہی میں بناتی ہوں مگر میرے بیٹے کو میرے ہاتھ کا یہ حلوہ اتنا پسند ہے کہ وہ اکثر شام کی چائے پر بھی فرمائش کرکے بنواتا ہے۔ آپ بھی ٹرائی کیجئے گا۔ یقیناً" آپ کے بچوں کو بھی پسند آئے گا۔

(5) باہر کھانا کھانا کم ہی ہوتا ہے۔ کبھی کوئی خاص موقع ہو یا مہمان کا موڈ دیکھ کر باہر چلے جاتے ہیں ورنہ نہیں۔

(6) کھانے موسم کے حساب سے ہی اچھے لگتے ہیں مثلاً" سردیوں میں پائے' ماش کی کھچڑی' گرمیوں میں ہلکے پھلکے کھانے اور برسات میں بیسن کی روٹی' لہسن کی چٹنی اور اچار کے ساتھ (منہ میں پانی آگیا نا؟)

(7) اچھے کھانے کے لیے ڈش کے لوازمات پورے ہوں اور محبت سے اللہ کا نام لے کر پکایا جائے تو قسم سے گھر والے انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔

(8) کھانا پکانے سے پہلے میں بسم اللہ پڑھتی ہوں اور پھر درود شریف پڑھتی رہتی ہوں۔ اسماء الٰہی بھی پڑھتی ہوں۔ اس سے کھانے میں برکت بھی ہوتی ہے اور کھانا خوش ذائقہ بھی بنتا ہے۔

ان سوالات کے جواب بھجوا کر آپ بھی اس سلسلے میں شرکت کرسکتی ہیں۔ ساتھ ایک عدد تصویر بھی بھجوائیں۔

اس ماہ آپ کا باورچی خانہ میں جس بہن نے انعام حاصل کیا ہے۔ ان کا نام ہے۔

شائستہ ابوالحسن۔ کراچی

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے مبارک باد۔

دسمبر میں بشریٰ نوید باجوہ اور جنوری میں شمیم افتخار ویر انعام کی مستحق قرار پائی تھیں۔

آپ سب بہنوں سے درخواست ہے کہ اپنے مکمل پتے بھجوادیں تاکہ انہیں انعام ارسال کیا جاسکے۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

رس ملائی

اجزا:

دودھ — ایک کلو
خشک دودھ — ایک کپ
بیکنگ پاؤڈر — ایک چائے کا چمچہ
انڈا — ایک عدد
چینی — ایک کپ
گھی — ایک کھانے کا چمچہ
الائچی — پانچ عدد
بادام پستے — حسب ضرورت

ترکیب:

دودھ میں چینی' الائچی اور بادام' پستے ڈال کر ابال لیں۔ خشک دودھ میں بیکنگ پاؤڈر' انڈا اور گھی (گھی اگر جما ہوا ہے تو بہت اچھا ہے۔) ملا کر گوندھ لیں۔ ہاتھ چکنے کرکے چھوٹی چھوٹی ٹکیہ بنالیں۔ دودھ میں جوش آجائے تو درمیانی آنچ کرکے ساری ٹکیاں ڈال دیں۔ چمچہ چلاتے رہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب یہ پھول جائیں اور دودھ گاڑھا ہوجائے تو اتار لیں اور ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

لال چکن

اجزا:

چکن — آدھا کلو
شملہ مرچ — ایک عدد
ٹماٹو کیچپ — دو کھانے کے چمچے
ٹماٹو پیوری — آدھا کپ
ٹماٹر — ایک عدد
پیاز — ایک عدد
لہسن پیسٹ — ایک چائے کا چمچہ
کٹی سیاہ مرچ — آدھا چائے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ
تیل — حسب ضرورت

ترکیب:

پیاز' ٹماٹر اور شملہ مرچ کو چوکور کاٹ کر رکھ لیں۔ چکن کی ہڈیاں نکال کر چھوٹی بوٹیوں کی شکل میں کاٹ لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کرکے چکن ڈال کر فرائی کریں۔ پھر لہسن پیسٹ ڈال کر بھونیں۔ نمک' مرچیں اور ٹماٹو پیوری ڈال کر پانچ منٹ پکنے دیں۔ تیل الگ ہوجائے تو پیاز' ٹماٹر' شملہ مرچ اور کیچپ ڈال کر مکس کردیں اور تھوڑی دیر پکائیں پھر پیش کریں۔

روسٹڈ چکن سوپ

اجزا:

چکن بغیر ہڈی — تین پاؤ
گاجر — آدھا کپ
مٹر — آدھا کپ
پیاز — ایک عدد
کارن فلور — دو کھانے کے چمچے
انڈا — ایک عدد
مکھن — ایک کھانے کا چمچہ
لہسن پیسٹ — دو چائے کے چمچے
پسی سرخ مرچ — آدھا چائے کا چمچہ
پسی سفید مرچ — آدھا چائے کا چمچہ
نمک — حسب ذائقہ

ترکیب:

گاجر کو کدوکش کرلیں۔ پیاز کو چوکور کاٹ لیں۔ آدھے چکن میں تین گلاس پانی ڈال کر چار کپ یخنی تیار کرلیں۔ باقی چکن کی ہڈیاں الگ کرکے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنالیں۔ توا گرم کرکے ان بوٹیوں کو خوب سینک لیں۔ پھر نمک' ایک چمچہ لہسن پیسٹ اور سرخ مرچ ڈال کر بوٹیوں کے ساتھ توے پر بھونیں اور اتار لیں۔ ایک ساس پین میں مکھن پگھلائیں۔ بقیہ لہسن پیسٹ' پیاز' مٹر' گاجر' نمک' سفید مرچ اور آدھی روسٹڈ چکن بوٹیاں ڈال کر فرائی کریں۔ اب چار کپ یخنی بھی ڈال دیں۔ کارن فلور آدھا کپ پانی میں گھول کر ڈال دیں۔ انڈا پھینٹ کر ڈال دیں۔ ایک ابال آنے تک پکائیں۔ ڈش میں نکال کر پیش کرتے وقت باقی روسٹڈ بوٹیاں بھی ڈال دیں۔

کشمیری پلاؤ

اجزا:

چاول — تین کپ
چانپیں — چھ عدد
پیاز — چار عدد
سونف — دو کھانے کے چمچے
دار چینی — چار ٹکڑے
بڑی الائچی — دس دانے
چھوٹی الائچی — دس دانے
کالا زیرہ — ایک چائے کا چمچہ
تیزپات — چار پتے
نمک — حسب ذائقہ
گھی — آدھا کپ

دیگچی میں تقریباً" پندرہ کپ پانی ڈالیں۔ اس میں چانپیں (بکرے کی ٹانگ کی لمبی ہڈی بھی لی جاسکتی ہے) تیزپات' بڑی الائچی' دار چینی' سونف اور نمک ڈال کر بیس منٹ تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ پیاز کو الگ سے براؤن کرکے ڈال دیں۔ پانچ منٹ پکانے کے بعد اتار کر ٹھنڈا کرکے چھان لیں۔ یہ تقریباً" سات کپ یخنی ہوگی۔ کم ہو تو پانی شامل کرلیں۔ ایک پتیلی میں یخنی ڈالیں۔ ابال آجائے تو چاول ڈال دیں۔ اب کالا زیرہ اور چھوٹی الائچی کے ساتھ نمک ڈالیں اور ایک کنی ابال لیں۔ پانی خشک ہونے پر الگ سے گرم کیا ہوا گھی چاولوں کے اوپر ڈال کر ڈھکن بند کرکے دم لگادیں۔ مزے دار کشمیری پلاؤ تیار ہے۔

عدنان

نفسیاتی اور ذہنی الجھنیں

انسانی شخصیت کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ناقابل بیان اور ناقابل تشریح چیز ہے اور کچھ باتیں بعض لوگوں میں ہوتی ہیں اور بعض اس سے محروم ہوتے ہیں۔

ماہرین نفسیات نے یہ انکشاف کیا ہے کہ شخصیت کی نشوونما تربیت کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ شخصیت کا انحصار سیکھنے پر ہے۔

شخصیت سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کے ساتھ بھلائی یا خدمت کرنے کی پوزیشن میں ہو تو وہ بھلائی کا کام کرے اور دوسروں کی خدمت کرے اور دوسروں کے کام آئے۔ اس طور زندگی گزارنے سے خوشیوں' شادمانیوں اور مسرتوں کی دولت حاصل ہوتی ہے اور قلبی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ایمرسن کہتا ہے۔

"مسرت اور شادمانی ایک عطر ہے اور اس کی خوشبو تم دوسروں تک اسی وقت پہنچا سکتے ہو' جب چند قطرے اپنے اوپر ڈال لو۔"

لیکن اصل خوشی' مسرت اور شادمانی اس وقت حاصل ہوتی ہے' جب دوسروں کو مسرت و شادمانی پہنچانے کے لیے کسی صلے اور لالچ کے بغیر کام کیا جائے۔

ایک خاتون میں پژمردگی اور افسردگی کے آثار تھے' اس کا خیال تھا کہ اب وہ بوڑھی ہو چلی ہے اور چہرے پر جھریاں پڑنے والی ہیں۔ دراصل اس کے پاس اب کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ اس کی دلچسپیاں بھی کم تھیں اور اس نے اپنے اردگرد کے لوگوں کے بارے میں بھی کبھی نہ سوچا تھا۔

پھر کسی کے مشورے پر وہ چند گھرانوں کی مدد کرنے لگی۔ بعض کی روپے پیسے کی مدد کے علاوہ ان کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگی۔ ان کی مشکلات میں ان کا ساتھ دینے لگی۔ اسے اس بات کی فرصت ہی نہ رہی کہ کوئی بوڑھا خیال اس کے قریب آئے۔ یا کوئی منفی سوچ اس کے پاس سے گزرے۔

☼ ☼ ☼

ع۔ نامعلوم شہر

بہن ع نے خط لکھا ہے۔ گھر میں کسی وجہ سے ان کا جھگڑا ہوا تو انہوں نے نازیبا باتیں کیں اور بددعائیں بھی دیں۔ بعد میں انہیں پشیمانی ہوئی تو سوچ سوچ کر ٹینشن کا شکار ہو گئیں اور جہاں جاب کرتی ہیں وہاں بھی ان کا رویہ خراب ہو گیا۔ اب اس کے بارے میں سوچ کر پریشان ہیں۔

اچھی بہن! پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ ایک اچھی لڑکی ہیں کہ آپ کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے اور پشیمانی محسوس کرتی ہیں۔ جہاں تک گھر والوں کا تعلق ہے۔ وہ آپ کے متعلق کبھی بھی غلط نہیں سوچیں گے لڑائی جھگڑے کے دوران اس قسم کی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں لیکن اپنوں کے لیے کوئی بھی غلط نہیں سوچتا ویسے بھی انہیں آپ کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہوگا اور وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ غصہ میں اکثر آپ کے منہ سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جو در حقیقت آپ کہنا نہیں چاہتیں' اس لیے آپ اطمینان رکھیں کہ وہ آپ کے بارے میں غلط نہیں سوچیں گے اور نہ آپ کو غلط سمجھیں گے جہاں جاب کرتی ہیں' وہاں اپنے رویے کی معذرت کرلیں۔ اور

سب کچھ بھول جائیں۔ بددعاؤں کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے۔ وہ دلوں کا حال جانتا ہے۔ بلاوجہ کی بددعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

البتہ ایک بات بہت ضروری ہے کہ کسی اچھے سائیکاٹرسٹ سے مل لیں۔ کچھ دوائیں ایسی ہیں جو آپ کی ذہنی کیفیت بہتر بنانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ کچھ عرصہ یہ دوائیں استعمال کرنے سے آپ بہتر محسوس کریں گی اور اس طرح بلاوجہ کی ٹینشن سے نکل آئیں گی۔

ایک بہن فیصل آباد سے

میں گھر میں سب سے چھوٹی ہوں اور کالج کی طالبہ ہوں۔ میرا قد تقریباً" پانچ فٹ ہے' رنگ گندمی اور چہرے کے نقوش عام سے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ گھر والے اور عزیز و اقارب اکثر اوقات میری رنگت اور چہرے اور نقوش کو تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ کسی جاننے والے کے گھر جاؤں یا کسی محفل میں تو یہی ذکر چھڑ جاتا ہے۔ بہن بھائی تو سفید اور خوب صورت ہیں۔ یہ کس پر ہے' کالی ہے' ناک دیکھو' اس کی آنکھیں' یہ وہ وغیرہ۔ نقص نکالتے ہیں۔ جب سے شعور آیا ہے تب سے ایسی باتیں سننے کو مل رہی ہیں۔ یہ سن سن کر ذہنی ٹینشن کا شکار ہو گئی ہوں۔ ذہن پڑھائی کی طرف بھی صحیح طرح مبذول نہیں ہوتا۔ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ کالج کی ہر لڑکی سے اپنا موازنہ کرتی ہوں اور بعد میں محسوس ہوتا ہے' میں اس کے مقابلے میں کمتر ہوں۔ عزیز و اقارب سے ملنا جلنا دوبھر لگتا ہے۔ بہت کم کسی کے سامنے جاتی ہوں۔ لوگوں کی باتوں نے اتنا تلخ بنا دیا ہے کہ چہرے پر کرختگی سی آگئی ہے اور عمر سے بڑی دکھائی دینے لگی ہوں۔ اکثر لوگ سمجھتے ہیں' میں بڑی بہن ہوں' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ تقریبات میں جانے کے لیے بناؤ سنگھار کروں تو مجھے فوراً" احساس دلایا جاتا ہے' میں کیا لگ رہی ہوں۔ اپنی تیاری پر اندر ہی اندر شرمندہ رہتی ہوں' جی چاہتا ہے' کسی کونے میں چپ چاپ پڑی رہوں۔ دوسرے سمجھتے ہیں کہ میں مغرور ہوں' نک چڑھی ہوں' بڑی شے جیسے خطابات دیتے ہیں۔ اگر کوئی قیمتی لباس پہن لوں تو اب اپنا آپ برا لگنے لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے' جیسے میرا خوشیوں اور قیمتی چیزوں کو زیر استعمال لانے کا کوئی حق نہیں۔ حق صرف اس کو ہے' جو خوب صورت ہے۔

پیاری بہن! آپ کا خط پڑھ کر افسوس ہوا۔ دراصل ہمارے ہاں لوگ خوبصورتی کے مفہوم ہی سے واقف نہیں ہیں۔ اپنی تعلیم' ذمہ داریوں' اخلاق' لیاقت اور اہلیت کو دلجمعی' سکون اور اطمینان کے ساتھ پورا کرنا' اپنی اندرونی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور اپنی ذات سے دوسروں کو آرام' سکھ اور خوشیاں دینا ہی اصل خوب صورتی ہے۔

پیاری بہن! آپ اپنا مطالعہ بڑھائیں۔ فارغ وقت میں اچھی کتابیں پڑھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اصل چیز ظاہری خوب صورتی نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن صلاحیتوں سے نوازا ہے' انہیں اجاگر کرنے کا نام خوب صورتی ہے۔ دوسرے ایک غلط فہمی جس میں بیشتر لوگ مبتلا ہیں' وہ یہ ہے کہ صرف گورا رنگ ہی خوب صورتی کی ضمانت ہے حالانکہ میں سمجھتا ہوں اصل چیز کشش ہے۔ آپ اپنی باطنی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں۔ اپنے لباس کی تراش خراش پر توجہ دیں۔ اچھے خیالات رکھیں' کیونکہ برے خیالات چہرے کو بگاڑ دیتے ہیں۔ منفی خیالات سے چھٹکارا پائیں۔ مندرجہ بالا تحریر کی روشنی میں خود کو تبدیل کرکے دیکھیں اور مجھے خط بھی لکھیں کہ اس سے آپ کو کیا فائدہ پہنچا۔ اب تو بہت سی ایسی کتابیں بازار میں ملتی ہیں جن میں رنگ نکھارنے' وزن کم کرنے اور شخصیت کو بہتر بنانے کے لیے مشورے ہوتے ہیں۔ آپ ان پر عمل کرکے بہت حد تک خود کو بہتر بنا سکتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

اس کے بعد صابن سے منہ دھولیں۔ شہد کے ذریعے کئی وٹامنز اور معدنیات حاصل ہوتی ہیں۔ آپ اسے روزانہ اپنے ناشتے میں شامل کریں۔ آپ چاہیں تو فروٹ جوس' دلیہ' دہی یا دودھ میں ملا کر استعمال کر سکتی ہیں۔ شہد حسن اور صحت کے لیے بہترین ہے۔

فوری نتائج کے لیے درج ذیل نسخوں پر عمل کریں۔

سیب کے بیج باریک پیس لیں۔ رات کو ان کا گاڑھا لیپ ہونٹوں پر لگائیں۔ تین دن میں ہونٹ صحیح ہو جائیں گے۔

اس سے آسان نسخہ یہ ہے کہ چند گلاب کی پتیوں کو پیس کر دودھ میں ملا لیں' اس پیسٹ کو لگا کر سوئیں' دوسرے تیسرے دن ہی فرق واضح ہونا شروع ہو جائے گا۔

فائزہ..... کراچی

س : میری عمر تیس سال ہے..... گزشتہ ایک سال سے میری آنکھوں کے نیچے کالے حلقے پڑ گئے ہیں۔ میں نے کئی کریمیں اور گھریلو نسخے بھی استعمال کر لیے مگر اس سے فرق نہیں پڑا۔ مجھے کوئی ایسا علاج بتائیں جس سے یہ حلقے دور ہو جائیں۔

ج : آنکھوں کے نیچے حلقے پڑنے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً "نیند کا پورا نہ ہونا' تازہ ہوا کی کمیابی' غیر متوازن غذا' پریشانی اور آنکھوں میں کھنچاؤ وغیرہ۔ اپنی غذا میں وٹامن اے اور آئرن کا اضافہ کریں۔ یہ اشیاء آپ کو سبزیوں' خصوصاً" گاجر' پھلوں اور انڈے میں مل جائیں گی۔ گاجر' خوبانی اور پھلی میں بھی وٹامنز اور معدنیات ہوتی ہیں۔ اگر آنکھوں میں کوئی تکلیف ہے تو ڈاکٹر سے چیک کروائیں۔ پتلا تکیہ استعمال کرنے سے خون کی گردش کم ہو جاتی ہے۔ اس طرف بھی توجہ دیں۔ پہلے اصل خرابی کا پتا لگائیں' پھر علاج اسی مناسبت سے کریں۔



امت الصبور

بیوٹی بکس

شازیہ..... کراچی

س : میری عمر چوبیس سال ہے اور میرے ہونٹ بہت پھٹتے ہیں۔ کیا اس کی وجہ وٹامنز کی کمی ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ رات سونے سے قبل ہونٹوں پر شہد لگاتی ہوں اور دن میں لپس جیل لگاتی ہوں' مگر ان سب سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ج : اصل میں آپ کے اندر نمی کی کمی ہو گئی ہے۔ پینے والی اشیاء میں اضافہ کریں۔ روزانہ دس سے بارہ گلاس پانی' پھلوں کا رس اور سبزیوں کا جوس پئیں۔ ان سے آپ کے جسم میں ضروری وٹامنز منتقل ہوں گے اور نمی کی کمی پوری ہو گی۔ اپنے ہونٹوں پر دن میں تین بار کولڈ کریم لگائیں۔ کچھ کھانے یا پینے سے قبل اس کریم کو ضرور صاف کریں۔ رات میں کریم لگا کر سوئیں۔ صبح کے وقت اسے کاٹن سے صاف کریں اور